اندلس کی تلاش

محمد رفیق ڈوگر

اندلس کی تلاش

محمد رفیق ڈوگر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

910.4 Doger, Muhammad Rafiq
Andlus Ki Talaash/ Muhammad Rafiq Doger.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2006.
260pp.
1. Urdu Literature - Travelogue.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے

2006
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز
سے شائع کی۔

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall) P.O. Box 947 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore Pakistan. Phone 7667970
حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

فہرست

اندلس کی تلاش	5
شبِ رفتہ کے آنسو	15
مرسیہ میں ایک شب	28
اور غرناطہ گم ہو گیا	42
غم کی وجہ کھنڈر مجھے پسند نہ آئے	50
سجدوں کی واپسی	70
حُسن کے دربار میں	78
شنیل کنارے	92
تنگ دل قرطبہ	110
جہاں آسمانوں سے نور برستہ تھا	118
جس گھر کو آگ لگ گئی...	147
اندلس کی خودکشی	164

ساونتِ عرب کا پرتو	184
آبِ روانِ کبیر	197
ابنِ عربی کے اشبیلیہ میں	210
داستاں در داستاں	226
لُٹ گئی فقیروں کی کمائی	242
اچھا میڈرڈ پھر ملیں گے	254

اُندلس کی تلاش

اندلس کی تلاش کے سفر میں دوسرا پڑاؤ پیرس میں کیا پہلا پڑاؤ لندن تھا جہاں سے جانے نے کے سب ویزے لگوائے تھے۔ پیرس گھوم پھر کر دیکھا اور جتنا دیکھ لیا تھا اسے ہی شافی جان کر آگے چل پڑے۔ ذوق وشوق کی گٹھڑی اٹھائی اور لاری اڈا پہنچ گئے۔ ٹکٹوں کی جانچ پڑتال کے مرحلہ میں ایک مسافر اخبار نویس سے ٹاکرا ہو گیا۔ اسے ہم سے مل کر بہت خوشی ہوئی جواباً ہم بھی خوش ہو گئے۔ پڑوس اچھا ہو تو زندگی کا سفر بھی خوشگوار رہتا ہے۔ تانگے رہڑے کے سفر میں بھی دھکے محسوس نہیں ہوتے۔ باہمی خوشی کو مستحکم کرنے کے لئے ہم نے آمنے سامنے کی سیٹوں پر قبضہ کر لیا کوچ کافی لمبا چوڑا تھا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیاحوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہمارے سوا سب مسافر ایک ہی رنگ ونسل کے تھے اور بڑے خوش وخرم دکھائی دیتے تھے۔ بوڑھے بوڑھیاں، جوان مٹیاریں کوچ کا اندرونی ماحول بڑا پُرسکون تھا۔ مینجر نے سواریاں گن کر کلیئر سے ہاتھ ملایا کوچ کا دروازہ بند کیا اور ڈرائیور کو روانگی کی جھنڈی دکھا دی۔

کوچ نے پاؤں کی مٹی چھوڑی ہی تھی کہ ایک میم صاحبہ کے پہلو سے کتے کی صدائے احتجاج بلند ہوئی۔

سب نگاہیں بیک وقت اس کی طرف اٹھ گئیں۔

مسافروں نے شور قیامت بلند کیا۔

ڈرائیور نے بریک دبا دی۔

کتا بہت غصے میں تھا بوڑھی میم صاحبہ اسے چوم چاٹ کر خاموش کرنے کی کوشش کرنے

لگیں مگر کتا مسلسل بھونک رہا تھا۔لندن میں ہم نے اکثر میموں کی گود میں کتے دیکھے تھے مگر وہاں کسی کتے کو بھونکتے نہیں سنا تھا۔ان کتوں کی تعلیم وتربیت اور تہذیبی برتری نے ہمیں بہت مرعوب کیا تھا۔پیرس میں کتے نے گاڑی کے اندر بھونک بھونک کر یورپ کی ساری تہذیبی برتری کا جنازہ نکال دیا۔احتجاجاً بہت سے سیّاح سامان سمیت گاڑی سے اُتر گئے۔وہ بہت غصّے میں تھے۔گاڑی والے بھی بہت غصّے میں تھے اور میم صاحبہ کا بوڑھا مالک ان سے بھی زیادہ طیش میں تھا۔مسافر کہتے تھے کہ ہم بھونکنے والے کتے کے ساتھ سفر نہیں کریں گے، کیا معلوم وہ کب کاٹنا شروع کر دے بوڑھی میم نے اعلان کر دیا کہ وہ کتے کے بغیر سفر نہیں کرے گی۔وہ اپنے بُوڑھے کو بڑے پُرشور الفاظ میں ڈانٹ رہی تھی۔''کیسے اُجڈ سیّاحوں میں لے آئے ہو؟'' گاڑی والوں نے اکثریت کا ساتھ دیا۔جمہوریت کا دَور ہے مگر بُوڑھے نے گاڑی سے اُترنے سے انکار کر دیا۔پندرہ بیس منٹ اسی جھگڑے میں گزر گئے۔یورپ میں اکثر گاڑیاں وقت پر روانہ ہوتی ہیں مگر یہاں وقت کے سامنے کتا دیوار بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔کمپنی کا مینجر، گاڑی کا ڈرائیور، اس کا معاون سب گول میز کانفرنس کرتے رہے۔کتے کا بوڑھا مالک اس سیکورٹی کونسل سے انصاف کا طالب تھا۔اس کے دائیں کا شور کتے کی آواز سے بھی بُلند تھا اور کتا ناراض مسافروں کو دیکھتے ہی بھونکنا شروع کر دیتا تھا۔بوڑھی میم نے اسے کھینچ کر گود میں لے لیا مگر اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔ہمارے پڑوسی ہسپانوی اخبار نویس نے غربت اور امارت کا فلسفہ سمجھانا شروع کر دیا۔''اگر گاڑی کسی فرانسیسی کمپنی کی ہوتی تو وہ فوراً کتے کو کان سے پکڑ کر اتار دیتے۔یہ کمپنی غریب ہسپانیہ کی ہے اور سگ پرست جوڑا فرانسیسی ہے اور شہر بھی ان کا اپنا ہے اور ملک بھی غریبوں کی کون مانے گا''۔اپنے ملک اور شہر والے جیت گئے۔کئی ناراض سیّاحوں نے گاڑی کے پیٹ سے اپنا اپنا سامان بھی نکلوا لیا۔بُوڑھی میم صاحب بڑے فخر سے کتے کو بھینچ رہی تھی اور کھڑکی میں سے جانے والوں کو بڑے فاتحانہ انداز میں گھور رہی تھی۔''کُتا زندہ باد!'' ہم نے گاڑی کی روانگی پر نعرہ لگایا۔

ہسپانوی اخبار نویس نے مشورہ دیا پچھلی سیٹ پر آ جاؤ رات لیٹنے کو دو سیٹیں مل جائیں گی وہ سب سے پچھلی دو جڑواں سیٹوں پر قابض ہو گیا۔''میں جب بھی لمبا سفر کرتا ہوں، یہی طریقہ اختیار کرتا ہوں''۔

ہمیں اس کا مشورہ مُفید معلوم ہوا۔ہم سے پیچھے فالتو ڈرائیور کا ریسٹ رُوم تھا۔طویل مسافت کے کوچ کے ساتھ بیک وقت دو ڈرائیور چلتے ہیں۔ایک گاڑی چلاتا ہے اور دوسرا ریسٹ روم میں آرام فرماتا ہے۔اس نے پردہ اُٹھا کر کچھ کہا۔ہسپانوی اخبار نویس مسکرایا''کہتا ہے کتے کو میرا سلام کہہ دو''۔

وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھا۔میں پیرس اور فرانس کا نظارہ کرنا چاہتا تھا اور کتا لڑائی میں آدھ گھنٹہ ضائع ہو گیا تھا۔رات کا سفر بھی کوئی سفر ہے۔اندھیرے کی چادر سے پرے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔

''آپ کے خیال میں دُنیا کس طرف جا رہی ہے؟''

''میں نے تو سُنا ہے یہ جاتی واتی کہیں بھی نہیں اپنے محور کے گرد گھومتی رہتی ہے۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔''میں ایکواڈور میں پیدا ہوا تھا۔اب ہسپانیہ میں رہتا ہوں۔اس لئے مجھے دنیا کے مستقبل کی بڑی فکر رہتی ہے۔آپ کو بھی اس بارے میں سوچنا چاہئے''۔

''میرے اور آپ کے سوچنے سے دنیا کا مستقبل محفوظ ہو سکتا ہے تو میں اس نیک کام کے لئے تیار ہُوں۔''

''دُنیا کا مستقبل ہم تیسری دنیا کے لوگوں کی سوچ سے ہی محفوظ رہ سکتا ہے۔ہمیں ان بڑی طاقتوں پر واضح کر دینا چاہئے کہ ہم ان کی سامراجی لڑائیوں میں شریک نہیں ہوں گے۔انہیں اپنی لڑائیاں آپ لڑنا ہوں گی۔اگر ہم سب یہ کہہ دیں تو یہ سپر پاورز کبھی بھی آپس میں نہیں لڑیں گی اور دنیا کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا۔ہم سب کو اس بارے میں سوچنا چاہئے۔''

''لیکن ہم ان کتوں کا کیا کریں جو بڑی طاقتوں کی گود میں چھپے بھونک رہے ہیں اور بلا اشتعال کاٹنے کو آتے ہیں۔''

اس نے تھوڑی دیر سوچا''کیا تیسری دنیا اتنی کمزور ہے کہ وہ کتوں کے بھونکنے سے ڈر جائے گی؟''

''آپ نے ابھی دیکھا نہیں، سیکورٹی کونسل بھی کتے کو گاڑی اور گود سے نہیں نکال سکی۔وہ اب بھی بھونک رہا ہے اور سپر طاقت اس کے سر پر محبت بھرا ہاتھ پھیر رہی ہے۔''

''لیکن اگر ہم سب اکٹھے ہو جاتے تو انہیں ہمارا مطالبہ ماننا پڑتا۔''

''لیکن ہم سب اکٹھے ہی تو نہیں ہو جاتے۔ جو لوگ احتجاجاً گاڑی سے اتر گئے ہیں، میں نے اور آپ نے ان کا ساتھ دیا ہے؟''

''اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ ہمیں سوچنا چاہیے۔ سپر پاوروں اور ان کے کتوں کے خلاف متحد ہو جانا چاہیے۔ ہمیں ان کی تجربہ گاہیں نہیں بننا چاہیے۔ یہ بڑے ممالک پالیسیاں تیار کرتے ہیں۔ چھوٹے ممالک میں ان پر تجربے کرتے ہیں اور اپنے ہاں ان تجربات کی روشنی میں ان پالیسیوں پر عمل کرتے ہیں۔ جو سوشلزم ایکواڈور میں ناکام ہو جاتا ہے وہی فرانس میں کامیابی سے چل جاتا ہے فرانس کا سوشلسٹ صدر سرمایہ داری سے بازو میں بازو ڈالے چل رہا ہے۔ اس پر نہ روس کو غصہ آتا ہے نہ امریکہ اس سے تعلقات ختم کرتا ہے۔ آخر ہم چھوٹے ممالک کے لوگ ان بڑے لوگوں سے سبق کیوں نہیں سیکھتے؟''

''اس لیے کہ ہم چھوٹے ممالک کے لوگ خود بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔''

''اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ ہمیں سوچنا چاہیے۔ ہمیں چھوٹے نہیں بننا چاہیے۔ چھوٹوں والی حرکتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ اس سے دنیا کا بھی فائدہ ہے اور ہمارا بھی۔''

بادل زمین سے قریب ہو گئے تھے۔ سہ پہر میں شام کی سیاہی پھیل رہی تھی۔ کشادہ سڑک پر آسمانوں سے چھڑکاؤ کیا جا رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف حدِ نظر تک پھیلے ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں میں کہیں کہیں بھیڑوں اور گائیوں کے ریوڑ سر جوڑے باہمی مشورے میں مصروف تھے یا شاید سوچ رہے تھے سپر طاقتوں کے خلاف۔

''دیکھیے یہ بھی سوچ رہے ہیں۔''

''بہت خوب۔'' وہ خوش ہو گیا۔

''جب سے کائنات وجود میں آئی ہے بُرے موسم میں یہ اسی طرح سر جوڑ کر سوچتے آئے ہیں لیکن آج تک چرواہے کی لاٹھی اور کُتے سے آزادی حاصل نہیں کر سکے۔''

''نگران میں اور ہم میں فرق ہے۔''

''صرف دو ٹانگوں کا۔''

کھیتوں میں کہیں کہیں کوئی کار کھڑی تھی۔ کاشت کار برساتیاں اوڑھے گھوم پھر رہے

تھے۔ لکڑی کے ہتھوڑوں سے باڑیں ٹھونک بجا رہے تھے۔ کسان پاکستان کا ہو یا فرانس کا، وہ بارش میں آرام سے گھر نہیں بیٹھ سکتا، ہاں یہ فرق ہے کہ ایک برساتی اوڑھے ہوتا ہے اور دوسرا تن خاکی سے پانی کا مقابلہ کرتا ہے ایک نے تھوڑی دُور گاڑی کھڑی کی ہوتی ہے دوسرے نے گدیں باندھی ہوتی ہے۔

کوچ ایک پٹرول پمپ کی حدود میں رک گیا۔ یورپ میں بڑی شاہراہوں کے کناروں پر پٹرول پمپوں کی حدود بڑی وسیع ہوتی ہیں۔ ایک خوبصورت کیفے، دستکاریوں اور نوادرات کی بہت بڑی دکان، اندرون اور بیرون ملک ٹیلیفون کی سہولت، وہاں پٹرول کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دوست نے تو بتایا تھا کہ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ان پٹرول پمپوں پر ہی رہ جائے اتنا خوب صورت اور صاف سُتھرا منظر۔ چائے پانی سے فارغ ہو کر ہم باہر آن کھڑے ہوئے۔ بارش رُک گئی تھی۔ پٹرول پمپ کے ساتھ ہی وسیع و عریض جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ نہایت گھنا جنگل۔ بارش میں نہائے درخت آہستہ آہستہ جھوم رہے تھے۔ ''دیکھیے سپر پاوروں کے جنگل بھی محفوظ ہوتے ہیں۔ آپ نے کبھی نہیں سُنا ہو گا کہ کسی جنگل سے نکل کر ڈاکوؤں نے کوئی پٹرول پمپ لوٹ لیا یا مسافروں سے نقدی نکلوا لی۔ کبھی کسی سپر پاور کے جنگل سے مسلح گوریلے برآمد نہیں ہوتے۔ آخر کیوں۔ یہ ہم تیسری دنیا والوں کو سوچنا چاہیے''۔ اس جگہ مجھے واقعی سوچنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ڈرائیور کیفے سے برآمد ہوئے اردگرد بکھرے سیّاح اپنی اپنی سیٹوں کی طرف بڑھے۔ بوڑھا جوڑا دُور بیٹھا کتے کی مٹھی چاپی کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے ہارن دیا۔ سوچ کا تانا بانا بکھر گیا۔

فرانس کا زمینی منظر برطانیہ سے مختلف ہے مگر دونوں جگہ زمین مکمل طور پر سبزہ پوش تھی۔ کوچ کشادہ سڑک پر آنکھیں بند کر کے دوڑا جا رہا تھا۔ میں میلوں تک کسی گاؤں کی تلاش میں رہا مگر جو بھی آیا، شہر یا قصبہ ہی آیا۔ صاف سُتھرے حسین و جمیل قصبے۔ سارے شہروں اور قصبوں کی انتظامیہ نے سڑکوں اور بازاروں میں چھڑکاؤ کیا ہُوا تھا۔ دن کے استقبال کے لئے چھڑکاؤ صبح کو کیا جاتا ہے یقیناً یہ چھڑکاؤ ہمارے استقبال کے لئے تھا لیکن کہیں استقبالیہ قطاریں دکھائی نہیں دیں۔ نہ کوئی بینر، نہ دیواروں پر نعرے۔ یہ لوگ خیریت سے تو ہیں؟ ''سردی میں لوگ گھروں سے کم ہی

باہر آتے ہیں۔ پھر بارش بھی معلوم ہوتا ہے ابھی ابھی تھمی ہے''۔ ہمارے ساتھی اخبار نویس کو ہماری خوشی اور خوش فہمی بھائی نہیں۔

روشندانوں سے چھن چھن کر روشنی باہر آ رہی تھی۔ گلیوں اور بازاروں میں بجلی کے قمقمے قطار اندر قطار چمک رہے تھے۔ بادل چھٹ چکے تھے۔ آسمانوں سے بارش کی جگہ سیاہی برسنے لگی۔ دل چاہتا تھا کوچ رُک جائے اور گھوم پھر کر اس شہر کو دیکھا جائے۔ ''یہ کھانے کے لیے نہیں رُکیں گے؟''

''ضرور رُکیں گے۔''

''مگر کہاں؟''

''جہاں کھانا مفت مل جائے۔''

ڈرائیور دنیا بھر میں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ مسافروں کا پہلے سے سودا طے کر رکھتے ہیں۔ ہوٹل والے انہیں الگ کمرے میں بٹھاتے ہیں۔ خصوصی سلوک کرتے ہیں اور قیمت مسافروں سے وصول کرتے ہیں۔ کوچ شہر سے کافی آگے جا کر ایک ریستوران کے سامنے رُک گیا۔ ڈرائیوروں کا نہایت گرمجوشی سے اِستقبال کیا گیا۔ ہم نہیں کہہ سکتے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ ہم صرف اس سلوک کے چشم دید گواہ ہیں جو ہمارے ساتھ روا رکھا گیا۔ جس ہال کا راستہ دکھایا گیا، اس میں کرسیوں کی جگہ پیڑھے رکھے تھے۔ چھوٹی چھوٹی انگھڑت چوکور میزیں اور ان کے اِرد گرد بچھائے پیڑھے۔ دیواروں کو بھی قدیم بنانے کی مقدور بھر کوشش کی گئی تھی۔ کچن اور باتھ رُوم سب سے فرانس کا زمانۂ جاہلیّت ٹپک رہا تھا، مگر ترقی یافتہ انداز میں۔ اہلِ مغرب زمانۂ جاہلیّت اور اس کے نوادر پر جان دیتے ہیں۔ کھانے پینے کی اشیاء کے ساتھ اس جذبۂ جاہلیت کی الگ قیمت ادا کر کے بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ سیّاح سب بڑے خوش تھے۔ قدیم طرز کے برتنوں میں جدید کھانے کھاتے ہوئے بڑا فخر محسوس کر رہے تھے۔ اس خوشی میں وہ ہماری مشکلات بھی بھول گئے۔ زبانِ یار سے نا آشنا خطرات سے معمور کھانا کیا کریں؟ کتنی ہی دیر کوشش کرتے رہے، مگر نہ فرانسیسی بیرا ہماری بات سمجھا، نہ اس کی کوئی بات ہمارے پلّے پڑی۔ یہاں بھی ہسپانوی اخبار نویس ہی مدد کو آیا اور کھانے کے انتخاب میں مدد کی۔ ''وہ کھانا جو مسلمان کھا سکیں''۔ ویٹر نے

بتایا کہ اکثر مسلمان تو ہمارے مینو کی تمام اشیا کھا سکتے ہیں۔ ہم نے مینو کی ایک ایک چیز کا پوسٹ مارٹم کر کے معلوم کیا کہ ان میں کیا کیا اجزا ہیں۔ مغرب میں گوشت پر سرے سے لکیر پھیر دینا چاہیے۔ چربی والی کسی بھی چیز پر اعتماد ممکن نہیں۔ گھی کی جگہ زیادہ تر چربی استعمال کی جاتی ہے۔ بسکٹوں میں بھی چربی ہوتی ہے۔ لکھا صرف یہ جاتا ہے حیوانی چربی۔ پہلوان جی بھی حیوان ہیں۔ پہلوانوں کی چربی ویسے بھی سستی ہوتی ہے۔ پھر جہاں کوئی ہم زبان بھی نہ ہو---کون بتائے کون کیا ہے؟ ہم نے انہیں بتایا کہ ہمارا تعلق مُسلمانوں کی ''اکثریت'' سے نہیں۔ وہ آئس کریم اور جُوس لے آیا۔ ''پھر تو آپ اسی پر گزارا کریں۔''

پیرس سے چلتے وقت ہم نے کچھ روٹیاں خرید کر بغل میں چھپا لی تھیں۔ اس ضرورت کے وقت وہ بہت کام آئیں۔ اخبار نویس نے سلاد کا پورا ڈونگا ختم کرنے کے بعد سگریٹ سلگا لیا۔ ہمیں دعوتِ شرکت دی ''آپ کے ساتھ صرف کافی اور سگریٹ میں اشتراک کیا جا سکتا ہے۔'' اس نے ہال کے کونے کونے کا نظروں ہی نظروں میں جائزہ لیا جہاں پیر و جواں سب مستی کے دَور سے گزر رہے تھے۔ ''اب دیکھیے فرانس کا صدر اپنے آپ کو سوشلسٹ کہلاتا ہے، سرمایہ دار امریکہ سے دفاعی اور جنگی رشتوں میں بندھا ہوا ہے جو کمیونسٹ روس کے خلاف ہیں۔ اس نے یہ تمام رشتے توڑ کیوں نہیں دیے، روس سے دوستی اور امن کا معاہدہ کیوں نہیں کر لیا۔'' اس نے پھر عالمی سیاست کا چکّر چلا دیا۔

''چلو ہم اِن فرانسیسیوں سے پُوچھتے ہیں۔''

اس نے ایک موٹی سی گالی دی ''یہ سب قوم پرست ہوتے ہیں۔ سرمایہ دار نہ سوشلسٹ نہ کمیونسٹ۔ سب نعرے ہم غریب ممالک کے لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے لگاتے ہیں۔ اسی لیے ہمیں اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ان کے بارے میں غور کرنا چاہیے۔ یہ سب سامراجی ہیں۔ روس ہو یا امریکہ۔ وقت آنے پر یہ سب اکٹھے ہو جائیں گے۔''

''چلیے باہر کھُلی ہوا میں بات کرتے ہیں۔'' ہم کیفے سے باہر آ گئے۔ آسمان سے ہلکی ہلکی پھوار شروع ہو گئی تھی۔ کولون کی پھوار کی سی۔ اس میں خوشبو بھی تھی۔ ''یہ اردگرد کے کھیتوں کی خوشبو ہے۔ پانی سے نہیں، ہوا کے ذریعے کھیتوں سے آ رہی ہے۔'' ''کھیتوں میں کون سی فصل ہے؟'' ''مجھے تو

فصلوں کی پہچان نہیں۔'' اندھیرا کافی دبیز تھا۔ کوشش کے باوجود میں بھی کسی فصل کو پہچان نہ سکا۔ سڑک کے دوسری طرف کے کھیتوں میں کوئی گندم نما چیز لہلہا رہی تھی۔ لیکن وہ بھی عمر کے اس حصّے میں تھی جب گندم اور جَو کی پہچان ممکن نہیں ہوتی۔ جئی بھی گندم کا بھیس بدل لیتی ہے۔ میں نے ایک تِنکا توڑ کر چبایا۔ گندم کا ذائقہ تھا۔ میرے اعلان پر وہ حیران ہوا ''یہ تم نے کیسے پہچان لیا؟''

''اسی کی وجہ سے تو جنت سے دھکّے پڑے تھے اس سے تو جنم جنم کی آشنائی ہے۔''

وہ ہنس پڑا۔ ''ان سامراجیوں سے پوچھ کر دیکھ لو کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ وہ اس پودے کی وجہ سے جنت سے نکالے گئے تھے۔''

''حُور و غلمان، دودھ اور شہد کی نہریں، امن، نغمے اور ہر کوئی جام بدست۔ ان کے لیے تو یہی جنت ہے۔''

اس نے قہقہہ لگایا ''یہ کیسی جنت ہے جس میں رہنے والوں کو انسان سے کم اور کُتّے سے زیادہ اُمیدِ وفا ہے؟ آپ یہ نہ سمجھیں یہ سگ پرستی کوئی فیشن ہے۔ یہ اس معاشرے میں ایک ضرورت ہے۔ جہاں آدمی ساتھ نہ دے۔ معلوم ہی نہ ہو کون سا ساتھی کس سٹیشن پر مُنہ موڑ کر اُتر جائے گا، وہاں کتّا سب سے بڑی نعمت ہے کیونکہ وہ ساتھ نہیں چھوڑتا۔ وفادار رہتا ہے۔ مغرب میں وفا صرف کُتّوں میں رہ گئی ہے۔ یہ دوسری قوموں کو ہی دھوکہ نہیں دیتے اپنے آپ سے بھی سچ نہیں بولتے۔ اندر سب اپنے آپ کو دھوکہ دینے میں مصروف ہیں۔''

اِس دفعہ اس نے ہمیں اس بارے میں سوچنا چاہیے کا مشورہ نہیں دیا۔ شاید یہ اس کی سوچ بچار کا نچوڑ تھا۔ ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جب آدمی سوچتا نہیں، فیصلے سناتا ہے۔

''ہم سپین کی حدود میں کب داخل ہوں گے؟''

''جب یہ رات ختم ہو جائے گی۔''

''اتنی لمبی رات!''

''اور اِتنی اندھیری بھی۔'' اس نے بادلوں کی طرف اشارہ کیا جو اور بھی زمین کے قریب ہو گئے تھے۔

گاڑی چلنے کے بعد بھی اس نے بریک نہیں لگائی ''یہاں انسان ایک مشین ہے جس میں لالچ کے

سیل ڈال دیئے گئے ہیں۔ ایسی ترغیبات عام ہیں جن سے یہ بیٹریاں خود بخود چارج ہوتی رہتی ہیں۔ آپ نے پیرس دیکھا ہوگا جس کی پیشانی پر برائے فروخت کا بورڈ لگا ہے۔ اس میں ہر چیز برائے فروخت ہے۔ دیواروں پر اشتہار تو آپ نے بھی دیکھے ہوں گے.....''

اتنا پسماندہ اخبار نویس کسی پسماندہ ملک میں ہی رہ سکتا ہے۔ ایکواڈور اور پھر سپین۔ ترقی کے لیے ذہنی خوش حالی ضروری ہے۔ تیسری دنیا میں یہ خوش حالی صرف ترقی پسند حلقوں میں ملتی ہے۔ سب میں ہو تو یہ ممالک بھی ترقی نہ کر جائیں۔ کوچ کے ڈرائیور نے اپنے سر پر اٹھائے ہوئے ٹیلی وژن سیٹ میں فلم چالو کر دی۔ زبان ناقابلِ فہم ہونے کے باوجود فلم خاصی قابلِ فہم تھی۔ سب مسافروں نے کھڑکیوں پر پردے کھینچ دیے۔ فلم کافی پُر جوش تھی۔ ایرکنڈیشنڈ کوچ میں مزید گرمی بڑھ گئی۔ بڑی بُوڑھیاں سیٹوں میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

''فِلم اور ان بوڑھیوں کو ذرا غور سے دیکھنا'' اس نے آہستہ آہستہ سے میرے کان میں کہا اور خود آنکھیں بند کر کے دراز ہو گیا۔

فلم ہماری مولا جٹ قسم کی تھی۔ فرق صرف زبان و مکان کا تھا۔ اگر مولا جٹ پیرس میں بنائی جاتی تو شاید یہ اس سے بھی تیز ہوتی۔ بے وفائی، دھوکہ دہی، چوری، قتل..... اور بعض اوقات تو میں خود بھی آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا۔ مگر حکم یہ تھا کہ فلم غور سے دیکھنا۔ کوچ میں لوگ میاں بیوی بچّوں سمیت اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ فِلم ختم ہو گئی۔ رات اور سڑک ابھی کافی باقی تھیں۔ کُتّے والی میم نے فلم ختم ہوتے ہی اپنے صاحب کو میرے سامنے والی سیٹ پر بھیج دیا اور خود کتا گود میں لے کر دونوں سیٹوں پر دراز ہو گئی۔ بوڑھا دُور ہی سے انہیں آرام میں دیکھ کر معلوم نہیں کیا محسوس کر رہا تھا۔ وہ کبھی پانی کی بوتل کھول کر لبوں سے لگا لیتا اور کبھی دوسری بوتل۔

میں نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ آسمان کسی بھی ملک کا ہو، تارے ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک ہی انداز میں چمکتے ہیں۔ آسمانوں کے تارے جو ہوئے۔ فلم ستاروں کی بات اور ہے۔ ان کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔

مُسافر کو دیکھ کر مسافر نیند پکڑتا رہا۔ میری بھی آنکھ لگ گئی مگر نیند نہیں آئی۔ جاگو میٹوسی حالت رہی۔ کوچ کسی شہر کی حدود میں داخل ہوتا، باہر کی روشنیاں اندر گھسنے کی کوشش کرتیں تو آنکھ

کھُل جاتی۔ ان روشنیوں میں شہر کا نظارہ کرنے کی ناکام کوشش میں پھر بھی کچھ تو نظر آ ہی جاتا تھا۔ ایک شہر کے اندر سے کوئی دریا نما چیز گزر رہی تھی۔ کوچ کافی دور تک اس کے کنارے کنارے دوڑتا رہا۔ خاموش لہروں پر چاندنی ناچ رہی تھی۔ ''یہ کون سا شہر ہے؟'' کس سے پوچھوں؟..... اخبار نویس گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ میں سوچنے کی کوشش کرنے لگا۔

شبِ رفتہ کے آنسو

اُندلس کے اُفق پر ہم ستارۂ صبح کے ساتھ طلوع ہوئے۔ اس اُفق پر ایک بار ہم ستارۂ صبح کی مانند بھی طلوع ہوئے تھے۔ روشنی کا پیغام لے کر آئے تھے اور روشنی کی رفتار سے اُندلس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئے تھے مگر جب وادیوں اور پہاڑوں پر روشنی پھیل گئی تو ہم اس روشنی میں راستہ بھُول گئے تھے۔ افراد راستہ بھُول جائیں تو گھر برباد ہوتے ہیں، قومیں راستہ بھُول جائیں تو سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اُندلس کی اسلامی سلطنت کے ساتھ اسلامیانِ اُندلس بھی برباد ہو گئے۔ آج کتابوں میں ان کی داستانیں ہی باقی ہیں۔ اندلس کی وادیوں میں ان کی عظمت کے کھنڈرات پھیلے ہیں۔ لوگ سینکڑے ہزار میل سے چل کر ان کھنڈرات کی زیارت کو آتے ہیں۔ مَیں بھی انہی زائرین میں سے ایک تھا۔ روشنی کی شکست کے اسباب تلاش کرتا کرتا اندلس کے اُفق تک پہنچ گیا تھا۔ قومیں دن کی روشنی میں کیسے راستہ بھُول جاتی ہیں؟ سرپٹ دوڑتا کوچ اچانک رُک گیا، اور سوچ کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔

وسیع و عریض شاہراہ قطار اندر قطار کھمبوں پر سینکڑوں قمقمے چمک رہے تھے۔ فرانس اور اندلس کے کسٹمز حکّام نے ہمارے استقبال کے لیے زبردست چراغاں کر رکھا تھا۔ کوچ کتنی ہی دیر کھڑا رہا۔ جملہ خمار آلود آنکھیں کھُل گئیں۔ ہماری پڑتال کے لئے ایمیگریشن کا صرف ایک ہی آدمی اندر آیا اسے دیکھتے ہی سب مُسکرا دیے۔ اس نے بھی جوابی مسکراہٹ سے نوازا اور سیدھا چلتا ہوا ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا۔ پہلے تو ہم اس اعزاز پر خوش ہوئے، مگر جب وہ ہاتھ بڑھائے کافی عرصہ کھڑا رہا تو بہت غصہ آیا۔ پوری بس میں ایک میں ہی مشکوک رہ گیا ہوں؟ قہرِ مسافر بر

جانِ مسافر پاسپورٹ نکال کر اس کے حوالے کیا اور اپنے ہم سفروں کی مسکراہٹوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ وہ سب تو یورپ کی مشترکہ منڈی کا مال تھے۔ کوئی ان کی جانچ پڑتال کیوں کرے۔ پاسپورٹ لے کر وہ کہیں دُور چلا گیا۔ مَیں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔ صبح کا تارا پردے میں سے جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید پوچھ رہا تھا، اب کیوں آئے ہو؟ بند ہو چکے بازار سے کیا چاہتے ہو؟ مَیں خاموش رہا۔ مشترکہ منڈی بولتی رہی۔ ستارے کا شوقِ جستجو بڑھ گیا۔ کوچ چلا تو وہ بھی ساتھ دوڑنے لگا۔ ستارے تو فلمی ہوں تو کوئی ان سے مقابلے کی دوڑ نہیں جیت سکتا۔ بڑے بڑے اہلِ عقل و دانش اس دوڑ میں دل سمیت بازی ہار جاتے ہیں۔ وہ تو آسمانوں کا تارا تھا۔ فلک کی بلندیوں سے کوچ نشینوں کو شرمسار کر رہا تھا۔ بس دوڑتی رہی، وہ بھی دوڑتا رہا۔ مقابلہ برابر جا رہا تھا۔ اردگرد کی پہاڑیوں اور وادیوں پر ذرّہ ذرّہ نازل ہوتی روشنی، دھرتی کے تن خاکی میں قطرہ قطرہ جذب ہوتا اندھیرا، صبح کی ٹھنڈی میٹھی ہوا، دلفریب زمینی منظر اور آسمانی تارے سے مقابلے کی دوڑ۔ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ ہمیں ایک بار پھر اہلِ ہوٹل سے راہداری کٹوانے کا معاملہ درپیش ہے۔

اندلس کے ہوٹل والوں نے بھی ہمیں لمبے ہاتھوں لیا۔ اجنبی ملک، اجنبی لوگ، انجانی زبان، پھر بھی احساس ہوتا کہ پُرانے جاننے والے ہیں۔ ان کی ہر ادا سے جان پہچان ٹپک رہی تھی ہوٹل بزنس میں یہ اپنائیت بڑی کاؤنٹ کرتی ہے۔ وسیع و عریض ڈائننگ ہالوں کی چھت کو چھوتی شیشے کی دیواروں کے آگے دُور تک لان پھیلے تھے۔ اُن سے آگے پہاڑوں کے دامن تک ہری بھری کھیتیاں لہلہا رہی تھیں۔ اس رنگ و بو کے ماحول میں ایک بار پھر میں اپنا فرض بھول گیا۔ لمبے سفر کے دوران جب ڈرائیور کسی ہوٹل کے سامنے کوچ کھڑا کر کے پچھلے دروازے سے ہوٹل میں کہیں گُم ہو جائے تو تمام سواریوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ کھانے پینے کی اشیاء کی میزوں کے سامنے لائنیں لگا لیں۔ بوجھل اور خمار آلود آنکھوں والے بوڑھے، بچّے اور جوان سب لائن میں لگ چکے تھے۔ اپنی خدمت آپ کرتے کرتے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ جو خوش نصیب اس آزمائش سے کامیابی سے گزر گئے تھے، وہ کونوں کھدروں میں سرگوشیاں کر رہے تھے، جیسے اس طویل سفر اور مشقت کا مقصد ہی کونوں میں سرگوشیاں کرنا ہو۔ میرے اور میرے ایمان کے لیے یہ ایک اور کٹھن مرحلہ تھا۔ میز پر آراستہ درجنوں اشیائے خورد و نوش میں سے کس کے خلوص اور نیت پر

بھروسہ کروں؟ پیچھے والے جلدی میں تھے۔ اندلسی فوٹو گرافر کو شاید میری مشکل کا احساس ہو گیا۔ اُس نے دو چار چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک بار پھر یقین دلایا کہ میں ان پر بھروسہ کر سکتا ہوں۔ ہم نے ایک کونے میں بیٹھ کر ایک بار پھر چائے کے کپ سے کافی کا کپ ٹکرایا سگریٹوں کا تبادلہ کیا اور شیشے کا پردہ ہٹا کر پہاڑوں کی چوٹیوں کو دیکھنے لگے۔ اگر کوئی اور بات کرتا تو خطرہ تھا کہ وہ پھر عالمی سیاست کی بات شروع کر دے گا۔ میں نے زمین کے حُسن کی بات شروع کر دی۔

دُور پہاڑوں کی اوٹ سے تانبے کا آتشی تھال آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ صبح کا ستارہ آسمان کی وسعتوں میں کہیں گم ہو گیا تھا۔ اس کے ذمّہ جو فرض تھا اس نے ادا کیا اور چپکے سے غائب ہو گیا۔

طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر،

سورج کو ستارے سے ہمیشہ شکایت رہی ہے کہ وہ روشنی کے لیے اس کا محتاج کیوں نہیں اپنی الگ چمک دمک کیوں رکھتا ہے۔ احساسِ ذات، شعورِ خودی یا جذبۂ خودنمائی؟ یہ تو سورج ہوا موسیٰ بن نصیر تو گوشت پوست کا انسان تھا۔ جذبوں اور ولولوں والا جرنیل۔

سُورج کی آنکھ کی سرخی مدھم ہوئی تو مسافر شیشے کی دیواروں کے پیچھے سے نکل کر لان میں آ گئے۔ گھاس پر شب رفتہ کے آنسو موتیوں کی مانند چمک رہے تھے۔ ہوا کا جھونکا ذرا سا شدید ہو جاتا تو صاف شفاف آب دار موتی گر کر مٹی میں اس خاموشی سے جذب ہو جاتے کہ کسی کو علم بھی نہ ہوتا کہ ابھی تھے اب نہیں ہیں ابھی بامِ عروج پر تھے اب کوئی نشان بھی نہیں چھوڑ گئے مگر مسلمان تو شب رفتہ کے آنسو نہیں تھے۔

سیاہ بادل اُڑتے ہوئے آئے اور پہاڑوں کی کہانوں پر سوار ہو گئے۔ سُورج کی کرنیں ان کے لباس میں اُلجھ کر رہ گئیں۔ کھیتوں اور میدانوں میں دھوپ اور سائے ایک دُوسرے کے پیچھے بھاگنے لگے ہوٹل کے اردگرد پھیلے جوڑے ایک بار پھر شیشے کی دیواروں کے پیچھے جا چھپے کوچ کے متبادل ڈرائیور کو شاید یہ حرکت ناگوار گزری۔ اس نے تیز تیز نقارہ سفر بجانا شروع کر دیا۔

سڑک کے سیدھے ہاتھ پہاڑی سلسلہ تھا جسے بادلوں نے آغوشِ محبت میں لے لیا تھا۔ اُلٹے ہاتھ بحیرہ روم ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ وسعت نیلا ب سے آسمان تک خلا ہی خلا تھا۔ سڑک

لہروں سے ہاتھ ملاتی ہُوئی جا رہی تھی۔ اگر کہیں کوئی آبادی سڑک اور لہروں کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کرتی تو سڑک بازار میں بدل جاتی ان آبادیوں اور بازاروں میں زندگی سُورج کی رفتار سے طلوع ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے۔ تازہ سبزی اور پھل کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں، خوب صورت ٹوکریاں اٹھائے خرید و فروخت میں مصروف بوڑھی مائیاں، سمندر کے ساحل پر واقع ہوٹلوں سے برآمد ہونے والے سیاحوں کی ٹولیاں، کچھ ساحل سمندر پر ننگے پاؤں چلے جا رہے ہیں۔ کوئی رنگین کشتیوں کے بادبان کھول رہا ہے۔ ہمارے ساتھی بھی ایک ایک دو دو کر کے ساتھ چھوڑنے لگے۔ وہ جہاں اشارہ کرتے ڈرائیور کوچ کی لگامیں کھینچ لیتا۔ تھکی ماندی مسکراہٹ سے انہیں الوداع کہتا اور پھر سے لگام کھینچنے کی تیاری کرنے لگتا۔

وہ لوگ ساحل اور سُورج کی تلاش میں اندلس آئے تھے۔ ساحل پر جس جگہ پسند کریں اتر سکتے ہیں۔ ڈرائیور انکار نہیں کر سکتا تھا۔ کاروباری اصول کی پابندی لازم تھی، گرمی سُورج کی ریت سمندر کی اور جسم اہل یورپ کے، وہ جتنی چاہیں اور جیسے چاہیں ریت ڈال ڈال کر کھیلیں اندلس والوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انہیں تو پیسے سے غرض تھی اور جس کے پاس پیسہ نہیں وہ اتنی دُور آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی لئے انہیں یورپ کی ایسے خواتین وحضرات کی خیریت بڑی نیک مطلوب رہتی تھی ان کے آرام کے لیے انہوں نے ساحلی علاقوں میں اپنا معیار سڑک بھی اپنی ہمت اور توفیق سے کافی بلند کر رکھا تھا ہوٹلوں میں ہر وہ آسائش فراہم کرنے کی کوشش کی تھی جو یورپ کے امیر و غریب کی ضرورت ہو سکتی تھی۔

دھوپ پھر سے نکل آئی تھی۔ پہاڑی کہانوں پر سوار بادل بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ بحیرہ رُوم بھی دم بخود تھا۔ سمندر کے سینے پر بچھی استری شدہ نیلی چادر پر سُورج کی کرنیں رقص فرما رہی تھیں۔ چادر پر کہیں شکن تک نہیں تھی کہ کرنوں کے پاؤں نہ پھسل جائیں، قدرت اپنے حسن کی نمائش کے لیے کیا کیا اہتمام کرتی ہے۔

ایک نوجوان نے خواتین وحضرات کو متوجہ کیا، جھک کر فرشی سلام بجالایا اور حُسنِ نیلاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بابر بہ عیش کوش کا نعرہ بلند کیا۔ سب نے مشترکہ قہقہہ لگایا ڈرائیور نے کوچ کی لگام ایک بار پھر کھینچ لی۔ نوجوان نے اپنا ننھا منا بیگ اٹھایا اور پھدکتا ہوا سپردِ ساحل ہو

گیا۔

وہ رات کے اندھیرے میں فرانس میں کسی جگہ شریک سفر ہوا تھا۔ پینٹ کی چستی سے جھانکتے ہوئے اجزاء، سرد موسم میں گرمیوں والی ہلکی پھلکی قمیص، جنگل کے قدیم باشندوں کی طرز پر کٹے بال، ہاتھ پاؤں میں لوہے کی وزنی زنجیریں، کمر بند کے ساتھ لٹکتا ہلکا سا ٹرانسسٹر، اس نے آتے ہی کوچ کی اندرونی صورت حال میں خوشگوار تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ کبھی اس کی سیٹ پر ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا اور کبھی دوسرے کی اور پھر فریقین شدید ترین قہقہوں کا تبادلہ کرنے لگتے نوخیز بیبیاں، بوڑھی مائیاں وہ سب سے یکساں طور پر بے تکلف تھا، سب کا لنگوٹیا یار معلوم ہوتا تھا، سگ پرست بڑھیا نے بھی ہاتھ ہلا کر اسے وش کیا تھا کل کے ناگوار حادثہ کے بعد سے مائی جی کی وہ پہلی مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر بڑے میاں کے چہرے پر بھی رونق سی آ گئی تھی۔

زمینی صورت حال اب مزید تبدیل ہونے لگی تھی پہاڑوں کے قد و قامت میں اضافہ ہو گیا تھا، دھرتی کے پیراہن کی سبزی مزید گہری ہوتی جا رہی تھی۔ میرے ہم پیشہ نے خوشخبری دی کہ بارسیلونا قریب ہوتا جا رہا ہے اس نے اپنا وزٹنگ کارڈ دیتے ہوئے نصیحت کی کہ واپسی پر میں اسی راستے سے گزروں اور اسے ضرور مل کر جاؤں۔ ایسی دعوتیں یہ جانتے ہوئے دی جاتی ہیں کہ پردیسی کے لیے انہیں قبول کرنا عملاً ممکن نہیں ہوتا، یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایسی سب دعوتیں قبول کر لی جاتی ہیں، فریقین اظہارِ خلوص کے لیے ''دروغ'' کی گردن پر نرم و نازک الفاظ کی چھریاں چلاتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں۔

بارسیلونا اندلس کا فیصل آباد ہے، یورپ والے اسے اندلس کا مانچسٹر کہتے ہیں۔ خوبصورت بلند عمارتیں، کشادہ سڑکیں، بڑے بڑے چوک، سڑکوں کے کنارے قطار اندر قطار درخت۔ قربت فرانس کی وجہ سے اس کے مزاج سے کافی حد تک فرانسیسیت ٹپکتی رہتی ہے۔ فرانس میں جو کوئی بھی گھر کے آرام سے تنگ آ جائے بارسیلونا کا ٹکٹ کٹوا لیتا ہے، بیگ اُٹھایا، کوچ کو ہاتھ دیا اور سُورج نکلنے کے ساتھ بارسیلونا، دن بھر سمندر کے کنارے ریت کا کھیل کھیلا اور شام کو کوچ سے واپس گھر۔ یورپ میں مشترکہ منڈی کے نظریہ کے فروغ سے ایک دوسرے کے ملک آنا مزید آسان ہو گیا ہے۔ سپین چونکہ اس منڈی کا نیا نیا رُکن بنا تھا اس لیے پُرانے ارکان کے باسیوں

سے اس کا سلوک اور بھی نوارکان کا سا تھا۔ پچاس فی صد عاشقانِ ساحل اسی ایک شہر میں جُدا ہو گئے حالانکہ ابھی آگے عشق کے اور بھی بہت سے ساحل آنے والے تھے۔ سگ پرست جوڑا بھی کتے کے پیچھے پیچھے کوچ سے خارج ہو گیا۔ ڈرائیور نے کھڑکی سے سر نکال کر گزشتہ روز و شب کا سارا غصّہ نکال لیا۔ باقی ماندہ بڈھے بڈھیاں اتنے خوش ہوئے کہ دیر تک قہقہے لگاتے رہے۔ ان سب کے چہروں پر بھی مسکراہٹ آ گئی جو صدمۂ سگ سے پیرس تا بارسیلونا گم سم چلے آ رہے تھے۔

میڈرڈ کو ہمیشہ سے بارسیلونا سے شکایت رہی ہے کہ وہ اس کی بڑائی تسلیم نہیں کرتا جس طرح لکھنؤ کے بانکے بزرگ کسی اور کی بڑائی کو تسلیم کرتے ہوئے شرم سی محسوس کرتے تھے۔ بارسیلونا بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتا ہے بارسیلونا اندلس کے ان شہروں میں سے ہے جو موسیٰ بن نصیر نے خود فتح کیے تھے۔ بارسیلونا کے پادریوں نے بڑے گرجا گھر میں جو دورِ اسلامی میں جامع مسجد تھی اپنے بچّوں کو ڈرانے کے لیے اب بھی ایک مشینی مُسلمان محفوظ کر رکھا ہے۔ جب عبادت گزار عیسائیوں کے خشوع و خضوع میں ان کے بچے خلل پیدا کرتے ہیں تو اہل گرجا اس مسلمان نما مشین کا بٹن دبا دیتے ہیں اور اس کے حلق سے خوفناک آوازیں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ سمتھ نے کہا

''وہ مشین تو دیکھتے جاؤ۔''

''میں تو شرارتی بچہ نہیں۔''

'مور تو ہو۔'' وہ ہنس پڑا۔

گرجے میں مقید مور کا چہرہ دیکھنے کو وقت نہیں تھا، مَیں نے شکریہ کے ساتھ اس کا مشورہ واپس لوٹا دیا۔

کولمبس جب امریکہ دریافت کر کے واپس آیا تو سپین کے شاہ اور ملکہ نے اس کا سفر نامہ سننے کے لیے اسی شہر میں دربار منعقد کیا تھا۔ کولمبس اپنے سفر نامہ میں امریکہ کو بھی مشرق ہی لکھتا اور پڑھتا رہا۔ آج کے دَور میں مشرق و مغرب کا امتیاز وہی پیشہ ور سیاح نظر انداز کرتے ہیں جنہیں کوئی ملک دیکھے بغیر اس کا سفر لکھنے کی مشکلات درپیش ہوں۔ کولمبس تو امریکہ فتح کر کے آیا تھا معلوم نہیں اس سے یہ غلطی کیسے سرزد ہو گئی تھی۔ بارسیلونا کی بندرگاہ میں آج بھی کولمبس کے جہاز کا ایک نمونہ لہروں کی گود میں کھیلتا رہتا ہے۔ قومی تعمیر میں قومی واقعات اور ان کی یادیں اہم رول ادا

کرتی ہیں۔

بارسیلونا سے نکل کر شاہراہ سمندر سے مُنہ موڑ لیتی ہے مگر طرکونہ سے یہ جُدائی پھر سے قربت میں بدل جاتی ہے اور ویلنسیہ تک سڑک اور ساحل کا میل جول جاری رہتا ہے ساحل سمندر کے ساتھ اس سینکڑوں میل کے سفر کا اثر تھا کہ دل چاہتا تھا میں بھی یہیں کہیں رہ جاؤں۔ سمندر کی آنکھ کا نیل دل پر اثر انداز ہونے لگا تھا مگر مجھے جلد از جلد قرطبہ پہنچنا تھا۔ جہاں جامع قرطبہ کی تعمیر کے بارہ سو سال مکمل ہونے پر اہلِ گرجا ایک خصوصی تقریب کا اہتمام کرنے والے تھے۔ جامع کی تعمیر و تخریب کے مختلف ادوار کی تصاویر کی نمائش ہونے والی تھی۔ مَیں وہ نمائش دیکھنا چاہتا تھا اور ان مقامات پر جن کے حسن اور شادابی سے تاریخ کے ہزاروں اوراق مزین ہیں۔ ذرا رُک کر گہری سانس نہیں لے سکتا تھا۔

مُسلمانوں کے دَورِ انتشار میں ایک زمین شناس دانا سے عیسائی بادشاہ نے پوچھا، کہ وہ مسلمانوں کے کس شہر پر پہلے قبضہ کرے ''ویلنسیہ پر'' دانا نے جواب دیا۔ ''کرۂ ارض پر اس سے زرخیز میدان نہیں اور اس کے قلعوں سے مضبوط قلعے نہیں''، سڑک کے دونوں طرف حدِّ نظر تک پھیلے باغات اور ہرے بھرے کھیت دیکھ کر ڈان بلاسکو کا یہ مبالغہ کافی تک درست معلوم ہوتا تھا مگر کوئی مضبوط قلعہ کہیں نظر نہیں آیا۔ مضبوط قومیں خود ہوتی ہیں قلعے مضبوط ہوں تو قومیں تباہ و برباد کیوں ہوں؟ مسلمانوں نے اس خطہ کی سیرابی کے لئے جو نہری نظام قائم کیا تھا وہ اب بھی کام کر رہا ہے، نہری پانی کی تقسیم کے جھگڑوں کو نپٹانے کے لئے ویلنسیہ میں دُنیا کی سب سے پہلی نہری عدالت قائم کی گئی تھی وہ عدالت اب بھی ہفتہ وار اجلاس منعقد کرتی ہے اور مُسلمانوں کے طے کردہ اُصولوں کے مطابق پانی کے جھگڑے نپٹاتی ہے۔ یورپ میں سب سے پہلی عوامی جمہوریہ بھی ویلنسیہ ہی میں قائم ہوئی تھی۔ اندلس میں مسلمانوں کے مرکز اور حکمرانوں کے ایمان کی کمزوری کے بعد باقی حصّوں کی مانند اس حصّہ میں بھی ایک آزاد حکومت قائم ہو گئی تھی۔ عیسائیوں نے اس ریاست اور اس کے حکمرانوں کو اس جُرم کی بڑی سخت سزا دی تھی۔

عِلم و دانش اور تہذیب کی بام عروج پر لٹکے مسلمانانِ اندلس کا وجود جب خطرے میں پڑ گیا تو انہوں نے ایک بار پھر ساحل سمندر سے دوسری طرف افریقہ میں بسنے والے مسلمانوں کو مدد کے

لئے آواز دی۔تہذیب نا آشنا ایک بار پھر بحرِ روم کا سینہ چیر کر اندلس کی سرزمین پر اترے اور اہلِ عقل و دانش کو ان کے شہر عیسائیوں سے واپس لے کر دے گئے۔ان کے جاتے ہی اہلِ اندلس پھر سے آپس میں لڑنے لگے اور اس وقت تک لڑتے رہے جب تک بالکل ہی مٹ نہیں گئے۔قرطبہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہوا تو مرکز سے ٹوٹی یہ شاخ بھی چار پانچ سال سے زیادہ ہری بھری نہ رہ سکی تھی۔ عرب و بربر کی نسلی برتری کی شمشیر سے عیسائیوں نے یہ شہر بھی فتح کر لیا نہ اعلیٰ تہذیب بچی نہ اعلیٰ نسل رہی۔تہذیب اور نسل کی برتری کے تمام دعوے ان کے اپنے ہی خون کے سمندر میں غرق ہو گئے تھے۔

مَیں نے سمندر کی طرف نظر اُٹھائی تو اس کی نیلی نیلی سطح کا رنگ سُرخ معلوم ہُوا۔سمندر میں اپنی آنکھوں کا عکس دیکھ کر مَیں پریشان ہو گیا۔کلیز نے اختتامِ سفر کا اعلان کیا تو پیرس سے شروع ہونے والی کوچ کی لانگ مارچ ویلنسیہ میں ختم ہو گئی۔ بچے کھچے مسافر ایک بار پھر اپنا اپنا سامان اُٹھا کر اجنبیوں کی مانند جدھر چاہا چلے گئے۔اندلس کی دھرتی پر چمکنے والا سورج ابھی تک نصف النہار سے ایک گھنٹہ پیچھے تھا۔بس سٹاپ پر قحط الرجالی کا سماں تھا۔اِدھر اُدھر بنچوں پر منتشر کسی کوچ کی منتظر مائیوں نے نظروں ہی نظروں میں میرے ورود پر حیرانی کا اظہار کیا اور پھر سے مذاکرات میں مصروف ہو گئیں۔

تین گھنٹے ان کے سامنے بیٹھ کر گزارنا کافی مشکل تھا۔رات بھر کافی بیٹھ بھی تو چکا تھا۔اگر مائیوں کے سامنے بیٹھنا تھا تو اتنا طویل سفر کیوں کیا تھا۔ممکن ہے ویلنسیہ کے بازاروں میں کوئی آشنا مل جائے۔شاید کوئی گلی ہی پہچان لے۔مُسلمان صدیوں اس شہر میں رہے۔حکمران اور نگہبان بن کر۔لوگوں کو نہیں تو ان پتھروں کو تو کچھ یاد ہی ہو گا۔ویلنسیہ اس کے بازار اور تاریخ کے صفحات دل و دماغ پر چھائے ہُوئے تھے،مَیں نے آنکھیں بند کر لیں۔جسم کے بعد دماغ بھی تھک گیا تو باقی سفر کیسے طے ہو گا؟ دماغ کی سکرین پر ویلنسیہ کے بازاروں کے دھندلے نقوش اُبھر آئے۔لمبے لمبے بازار حدِ نظر تک پھیلے ہُوئے تھے اور ان کے دور کے سرے اندھیرے میں گم ہو جاتے تھے اور کچھ لوگ سر جھکائے تھکے ماندے سے ان اندھیروں کی طرف چلے جا رہے تھے۔ بغلوں میں بھاری کتب۔چہروں پر دُھول ایسے معلوم ہوا ان میں سے ایک ابنِ جبیر ہے، دُوسرا

ابن بشکول ہے اور تیسرا یقیناً ابنِ ایاز ہے۔مگر یہ لوگ اندھیروں کی طرف کیوں جا رہے ہیں؟ مَیں ان کے پیچھے دَوڑنے لگا۔وہ مزید اندھیرے میں کہیں گم ہو گئے یہ لوگ اندھیروں میں کتابوں کا کیا کریں گے؟ جو علم روشنی میں راستہ نہ دکھا سکے اندھیرے میں اس کی لاش کو اٹھائے پھرنے کا کیا فائدہ؟ شاید وہ اسی سوال سے خوفزدہ تھے،اور وہ بھی مجھ سے جو آج بھی ان کے علم و مرتبہ سے مرعوب ہوں کیا یہ لوگ اس لئے تو نہیں بھاگ رہے تھے کہ مَیں ان سے ان کی تباہی کا سبب نہ پُوچھ لوں؟ جو قومیں تباہی کے راستے پر دوڑتی ہُوئی اپنی تباہی کا احساس نہ کر سکیں ان کے علماء اس تباہی کے آنے کے بعد بھی اس کے اسباب سے آگاہ نہیں ہوتے۔

''السّلام علیکم''

اس شہر میں اب بھی سلامتی کی دُعا کرنے والا کوئی موجود ہے؟ مَیں نے حیرانی سے آنکھیں کھول دیں۔ایک مسکین صُورت ادھیڑ عمر مراکشی ڈھیلے ڈھالے میلے میلے سُوٹ کے بالکل اندر چھپا کھڑا تھا۔

''آپ یہاں کیسے؟''

ہم نے نظروں ہی نظروں میں ایک دُوسرے سے سوال کیا۔

اس نے جواب دینے کی بجائے سر جھکا لیا۔

کتنے ہی خطے ہیں جہاں لوگ ایسے سوالات کے جواب میں سر جھکا لیتے ہیں، حالانکہ وہ بے قصور ہوتے ہیں۔ مجھے ایسے بے گناہ لوگوں پر ترس آتا ہے۔مَیں اسے سینے سے لگانے کے لئے اُٹھا تو اس کے دو ہم شکل ذرا نوجوان ساتھی بھی دوسری طرف کھڑے تھے۔وہ بھی حیران و پریشان سے دکھائی دیتے تھے۔مگر ان کی بغلوں میں کتب نہیں تھیں۔چھوٹی چھوٹی گٹھڑیاں تھیں جن میں ان کا ماضی اور حال بندھا ہُوا تھا۔وہ اسے کھول کر مجھے نہیں دکھا سکتے تھے، بھائی کے سامنے حالِ دل کہنا بڑے حوصلے کی بات ہوتی ہے مگر ان کے چہرے سب کچھ کہہ رہے تھے وہ وہی تو تھے جن کے نام سے اس ملک کے بحر و بن کانپتے تھے۔ پہاڑوں پر ان کے قدموں کی آواز سے لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔وہ جدھر کا رُخ کرتے ہوائیں ان کے ساتھ چلنا شروع کر دیتی تھیں یہ عظمتیں اور نصرتیں بانٹنے والے ہوتے تھے۔ان کے اجداد نے اس شہر اور ملک میں ایسے ایسے محل بنائے

کہ آج بھی دُنیا بھر سے لوگ انہیں دیکھنے آتے ہیں۔ ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے کہ آج بھی مؤرخ ان پر حیران ہوتے ہیں۔ پھر اس طرح مٹے کہ دنیا میں کہیں کوئی قوم ایسے نہیں مٹی تھی۔ یہ اسی باکمال قوم کے فرزند ہیں اور آج اپنے ملک اور شہر میں مزدُوری کرنے آئے ہیں اور لرزاں ہیں کہ اس ملک اور شہر والے نکال نہ دیں کہ جاؤ تمہیں تو مزدُوری کرنا بھی نہیں آتی۔ سچ ہے جس قوم کو حکومت کرنا نہ آئے اسے مزدُوری کرنا کیسے آئے گا۔ ایک کے لئے نااہل دوسرے کے لئے اہل کیسے ہوگا؟

''چلو میرے ساتھ ویلنسیہ کے بازاروں میں، چلو مجھے اپنے اجداد کے گھر دکھاؤ، مجھے ابن بشکول کے گھر کا راستہ دکھاؤ۔ ابن جبیر کی گلی بھی دکھادو۔ تم تو جانتے ہوگے۔ تم جو صدیوں یہاں رہے ہو۔'' مگر وہ اسی طرح گُم سُم کھڑے رہے۔ مَیں سامان اٹھا کر چل دیا۔ وہ خالی بنچ پر بیٹھ گئے۔ وہ انہی کی اولاد تھے جن کے ذاتی جاہ وجلال کے بوجھ سے اس سرزمین پر ملّت کے وجود و وقار کی کمر ٹوٹ گئی تھی اور ان کی جو جلا دیئے گئے تھے۔ مَیں سیڑھیاں چڑھنے لگا، وہ بیٹھے مجھے گھورتے رہے۔ سامان محافظ خانے میں رکھا اور ویلنسیہ کے بازاروں میں گم ہوگیا۔ انہی بازاروں میں جن کے آخری سرے پر اندھیرے میں اہلِ کتاب گم ہوگئے تھے۔

چوبیس گھنٹے سے کوئی معقول قسم کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ خالی پیٹ غم کھانا قوی صحت کے لئے بھی مُضر خیال کیا جاتا ہے لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ سمتھ بارسیلونا میں رفت ہوگیا تھا۔ سنیک بار کی میزوں پر قسم قسم کی اشیاء خوردنی دعوتِ خوردن دے رہی تھیں مگر اندر کا برائے نام مُسلمان بڑا خوفزدہ تھا۔ سیلز مین مجھے اس سے بھی زیادہ تشویش سے گھور رہا تھا جس تشویش سے مَیں اس کی اشیاء کو تاڑ رہا تھا۔ دونوں جوان آئے اور انگریزی کا تبادلہ کرنے لگے۔ غلامی کے کچھ فوائد بھی ہوتے ہیں، محکوم قومیں اپنے حاکموں کی فطرت کے علاوہ ان کی زبان بھی سمجھنے لگتی ہیں۔ یورپ میں انگریزوں کی غلامی اور زبان بہت کام آئے، مَیں نے نوجوانوں سے مدد کی درخواست کی جوانہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے قبول فرمائی جس طرح انگریزی بولنے والی قومیں ہماری اقتصادی امداد کی درخواست بلا جھجک قبول فرمالیتی ہیں۔ اس خدمت کے صلہ میں انہوں نے صرف یہ پُوچھا کہ آپ کے پاس کوئی پاکستانی سکّہ بچا ہوا ہے، اقتصادی امداد والی قومیں بھی آخر میں یہی سوال پُوچھا

کرتی ہیں کہ آپ کے پاس کوئی سکّہ بچ تو نہیں گیا۔ ہم نے سکّوں کا تبادلہ اور باہمی خوشی کا مل کا اظہار کیا۔

مَیں ایک تنگ گلی میں نکل گیا۔ بے کار بوڑھے ٹولیوں میں بیٹھے سر جوڑ کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی کوشش کر رہے تھے یورپ میں جن بزرگوں کو سرکاری طور پر ناقابل استعمال قرار دے دیا جائے انہیں دال روٹی کا خرچ سرکار کی طرف سے ملتا ہے۔ ان کے گھروں میں بھی ان کا کوئی مفید استعمال نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ دن بھر پارکوں اور مکانوں کے چبوتروں پر بیٹھے آپس میں چوگ لڑاتے رہتے ہیں۔ اندلس کے ہر گاؤں اور شہر میں ایسے بوڑھے بکثرت ملتے ہیں یورپ کے دیگر ممالک میں شاید یہ مخلوق اس لئے زیادہ نہیں دکھائی دیتی کہ وہاں ناکارہ الاؤنس اس غریب ملک کی نسبت زیادہ ملتا ہے اور وہاں کے ایسے بزرگ اپنا زیادہ وقت اپنی اپنی بزرگنیوں کی معیت میں سیر سپاٹے میں گزارتے ہیں۔ مَیں ایک ٹولی کے پاس جا بیٹھا۔ انہوں نے میری اس بے تکلفی پر ایک دُوسرے کی طرف دیکھا، ایک دُوسرے سے کچھ کہا۔ نہ مَیں ان کی زبان سمجھتا تھا نہ وہ میری تکلیف سے آگاہ تھے ''مور'' مَیں نے ذرا بلند آواز میں کہا، ایک بوڑھے نے گرجے کی طرف اشارہ کر دیا۔ مَیں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ایک بار پھر مور کہا۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں آنکھوں کی چمک سے دل کا حال تو آپ جان سکتے ہیں دماغ کی آواز نہیں سمجھ سکتے۔ جن شہروں میں دادی اماں ''مور'' کے نام سے بچّوں کو ڈراتی ہیں وہاں کے دادے ابّا اس خوشی سے ایک مور کا استقبال کریں گے مجھے اندازہ نہیں تھا۔ مَیں نے صرف ان کے ردِّعمل کا اندازہ کرنے کے لئے یہ جرأت کی تھی۔ اُٹھنے لگا تو وہ سب بھی اپنی اپنی چھڑی کے سہارے کھڑے ہوگئے ایک نے تو ہاتھ بھی آگے بڑھا دیا۔ ایک قدیم مکان کے دروازے کی طرف اشارہ کر کے مَیں نے پھر ''مور'' کہا۔ تو سب بوڑھوں نے نفی میں سر ہلائے اور پھر ایک ان میں جو سب سے نوعمر تھا میرے ساتھ چل دیا۔ تنگ گلی سے گزر کر وہ مجھے ایک ذرا کھلے میدان میں لے گیا۔ رہائشی مکانوں میں گھرے اس میدان میں چھوٹے چھوٹے درخت تھے اور درختوں کے سایہ سے بچ کر ذرا دُور ایک مکان کی طرف اشارہ کیا۔ ہمیں اس بے تکلفی سے مور مور پکارتے سُن کر چند مقامی بوڑھے ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی ہم سن دو بوڑھیاں ہاتھوں میں بیگ

اٹھائے بازار کی طرف جارہی تھیں وہ بھی سُن کر رُک گئیں۔ بوڑھوں نے معلوم نہیں کیا سمجھا یا وہ مسکراتی ہوئیں آگے چلی گئیں وہ مجھے شاید کچھ بتانا چاہتے تھے اور ایک دوسرے کو بہت کچھ بتا رہے تھے۔ سورج آہستہ آہستہ رو بہ زوال ہو رہا تھا۔ اس کا عروج و زوال کائنات کی زندگی ہے۔ مسجد کے مینار پر سے گرجے کی گھنٹی بجنے لگی تو دل نے کہا مجھے واپس چلنا چاہیئے۔ کوچ نکل گیا تو ایک دن مزید ان دیواروں سے باتیں کرنا پڑیں گی جن کے سینے داستانوں کے مدفن ہیں جن کی زبانیں مقفل ہیں۔ سائے دیواروں سے جُدا ہو کر ان کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہونے لگے تھے جیسے جیسے سُورج ڈھلتا جائے گا وہ طویل تر ہوتے جائیں گے اور پھر موروں کی مانند شبِ سیاہ میں بے وجود ہو جائیں گے اور پھر کسی کو احساس بھی نہیں ہوگا کہ وہ ہوتے بھی تھے۔

مَیں نے چلنے کا ارادہ کیا تو بوڑھا بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''استاسیون دے ایل اوتو بس'' اس نے سر ہلایا اور آگے آگے چلنے لگا۔ مَیں کھُلے بازار کی طرف جانا چاہتا تھا مگر وہ تنگ گلیوں میں سے جا رہا تھا۔ اسے کیسے سمجھاؤں؟ اس نے ایک گھر کے دروازے پر بٹن دبایا۔ اندر سے آواز آئی، دروازہ کھُل گیا۔ چھوٹے سے جدید مکان میں ایک قدیم ترین مائی نے ہمارا استقبال کیا۔ مَیں نے بوڑھے کو گھڑی کے ہندسوں پر انگلی رکھ کر بتایا کہ وقت بہت کم ہے۔ اس نے ایک بار پھر چھوٹا سا سر ہلایا۔ بڑھیا کمرے میں گم ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ برآمد ہوئی تو اس کے ہاتھ میں دھات کی ایک بڑی سی پلیٹ تھی جس پر خطِ کوفی میں آیاتِ قرآنی کندہ تھیں۔ وہ دونوں داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور مَیں رحم طلب نظروں سے پلیٹ کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ ان کا خاندانی ورثہ ہے؟ یا یہ پلیٹ بیچنا چاہتے ہیں؟ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا۔ ان دونوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ یہ بھی نہیں پُوچھا جا سکتا تھا۔ مَیں نے ''گراسیا'' کے ساتھ پلیٹ مائی کی طرف بڑھا دی۔ اس نے اسے سر اور آنکھوں سے لگایا اور کاغذ میں لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا کمرے کے در و دیوار پر درجنوں کے حساب سے دھات اور مٹی کی آرائشی پلیٹیں آویزاں تھیں۔ مصلوب مسیح اپنی نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ یہودیوں نے انہیں ایک بار پھانسی کے تختوں سے باندھا تھا۔ ان کے ماننے والوں نے صدیاں گزر جانے کے باوجُود انہیں وہیں لٹکا رکھا ہے۔ بڑھیا نے بغیر دُودھ کے چائے کی پیالیاں ہمارے سامنے رکھ دیں اور خود سامنے بیٹھ کر مسکرانے لگی۔ یورپ میں سفر کی

تکلیف دہ باتوں میں سے ایک یہ بغیر دُودھ کے چائے بھی ہے۔ سپین میں آپ ''ٹی اون لیچے'' کہیں تو وہ دُودھ والی چائے کی بجائے چائے والا دُودھ آپ کے سامنے رکھ دیں گے۔ اب کر لیں جو کرنا۔ گھڑی کی سوئیاں نپے تلے قدموں سے وقت کی شاہراہ پر دوڑی چلی جا رہی تھیں۔ مَیں نے ایک بار پھر بڑھیا کو ''گراسیا'' کہا اور باہر نکل آیا۔ بوڑھا اب بھی میرے ساتھ تھا۔ وہ گلی کی نکڑ تک میرے ساتھ آیا اور پھر بڑی سڑک کی طرف اشارہ کر دیا۔ مَیں گلی سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ مڑ کر دیکھا تو وہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا، مَیں نے ہاتھ ہلایا۔ جواب میں اس نے بھی ڈنڈا بائیں ہاتھ میں پکڑ کر دایاں ہاتھ ہلا دیا۔ سڑک پر ٹریفک زیادہ ہی واجبی تھی۔ پیدل چلنے والے بھی کم کم تھے۔ ممکن ہے یہ اہلِ شہر کے آرام کا وقت ہو یا بڑے پادری نے اہلِ ویلنسیہ کو خبردار کر دیا ہو کہ شہر میں ایک مور داخل ہو گیا ہے۔ اپنے اپنے بچے گھروں میں بند کر لو۔ ٹکٹ گھر اور مال گودام پہلی منزل پر ہیں سڑک کی طرف سے کافی سیڑھیاں چڑھ کر وہاں جانا پڑتا ہے۔ مَیں کشادہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگا تو ٹانگوں نے احتجاج کیا محسوس ہوتا تھا۔ مَیں صدیوں کا سفر کر کے آیا ہُوں، احساس کچھ زیادہ غلط بھی نہیں تھا۔ مگر یہ سفر میں نے ٹانگوں سے تو نہیں کیا تھا، مجھے ان پر بہت غصہ آیا، مجھے اب تک دل اور دماغ کے ساتھ ان کے اس نازک رشتہ کا علم نہیں تھا۔ سامان اور ٹکٹ لے کر انتظار گاہ میں گیا تو مراکشی مزدُور اب بھی وہیں بیٹھے تھے، وہ دور ہی سے میری طرف دیکھتے رہے کسی نے بھی قریب آ کر حال نہیں پُوچھا۔ ''السّلام علیکم'' نہیں کہا۔

مرسیہ میں ایک شب

مینار کی بلندیوں سے گھنٹیوں نے زوالِ شب کا اعلان کیا۔ ٹن! ٹن! ٹن! آوازِ سکوتِ شب میں تحلیل ہوگئی۔ کانوں میں پھر بھی دیر تک گھنٹیاں بجتی رہیں۔ اندلس کی راہوں میں مجھے رات کے اندھیروں کے خطرات سے خبردار کیا گیا تھا۔ مگر نہ خطرات یاد رہے نہ وقت کے قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ میں دیر سے اِس مینار کے قدموں میں کھڑا تھا۔ یہ جامع مرسیہ کا مینار تھا جس کی بلندیوں سے صدیوں خدائے واحد کی بڑائی اور کبریائی کا پیغام گونجتا رہا تھا۔ اب یہ صدیوں سے تثلیث کی گھنٹیوں کا بوجھ اُٹھائے کھڑا ہے اہلِ مرسیہ ہر سیاح کو فخر سے بتاتے ہیں "یہ موروں کی جامع مسجد تھی۔ ان کے اخراج کے بعد اسے گرجا میں تبدیل کر دیا گیا تھا"۔

یہ مینار موروں کا بنایا ہوا ہے؟ اس کے اینٹ پتھر وہی ہیں؟ اس کی شکل وہی ہے؟ بلندی وہی ہے؟ تبدیل کیا ہُوا ہے؟ میں اس کے سائے میں کھڑا سوچ رہا تھا۔ صرف گھنٹیوں کے بوجھ سے اس کی رُوح ہی بدل گئی۔ یہ گھنٹیوں کی آواز نہیں، مینار کی پکار تھی۔ قوموں کی حماقتوں پر تقدیر مسکراتی ہے۔ اینٹ پتھر روتے ہیں۔ پتھروں کی سسکیاں ناقابلِ برداشت ہوگئیں تو میں ہوٹل کا راستہ یاد کرنے لگا۔ ٹانگوں سے ساتھ دینے کی درخواست کی تو دھرتی نے پاؤں پکڑ لئے۔ چلا تو مینار نے اپنا سایہ ساتھ کر دیا۔ دہلی میں قطب مینار نے جھک کر مجھے شکنجے میں کس لیا تھا۔ مرسیہ کے مینار کا سایہ میرے پیچھے لگ گیا۔ دستِ فطرت نے مرسیہ پر سے آہستہ آہستہ سیاہ چادر کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ مگر اس کی تہوں میں خوابیدہ وسوسوں کے سپولیے میرے دماغ میں رینگنے لگے تھے۔ میں روشنی کی طرف جانا چاہتا تھا ان راستوں کی طرف جن کے سائے نہیں تھے۔ جن کی بجری اور

تارکول کی کرخت چمڑی کے نیچے کسی سجدے کا نشان نہ ہو اور مینار کا سایہ میرے قدم قدم چل رہا تھا۔

سڑکیں اور بازار روشنیوں کے سیلاب میں ڈوب رہے تھے۔ سٹوروں اور بنکوں کی مغرور عمارتوں کے سائے اس سیلاب کے خوف سے ان کے اندرونی حصوں میں پناہ گزیں تھے۔ خراب خانوں سے نکل نکل کر گھروں کو لوٹنے والے جوڑے اِس سیلاب سے خوفزدہ سے ہو رہے تھے۔ وہ دیواروں کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سرگوشیاں کرتے ہُوئے۔ آئندہ را احتیاط کے عہد و پیمان باندھتے ہُوئے۔ وہ روشنیوں سے خوفزدہ تھے اور مَیں سائے سے گھبرا رہا تھا۔ میرے قدم خود بخود تیز ہوگئے۔ سایہ مجھ سے بھی آگے نکل گیا۔

ایک سٹور کی شیشے کی دیوار کے آگے ڈبل بیڈ لگا تھا۔ نرم نرم تکیے۔ گرم گرم فضا سنہری لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں جام و سبو سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ایک بوڑھا ہسپانوی تیزی سے جام پہ لپکا اور دیوار سے ٹکرا کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس کا قصیدہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ نوجوان سپاہی نے اسے بازو سے پکڑا اور ساتھ کی اندھیری گلی میں چھوڑ آیا۔ جام و سبو دیکھتے رہ گئے۔ بوڑھا تو شہر کے راستوں سے واقف ہے۔ اگر سپاہی مجھے بھی بازو سے پکڑ کر کسی اندھیری گلی میں چھوڑ آیا تو اس اجنبی شہر میں کس سے فریاد کروں گا؟ اگر سایہ ان اندھیروں میں گم ہوگیا تو مینار کا کیا بنے گا؟ اندھیری راتوں کا اس کا ساتھی وفادار غمگسار سایہ۔ گھنٹیوں نے ابھی ابھی زوالِ شب کا اعلان کیا ہے۔ صبح ابھی پردۂ تقدیر میں ہے۔ کب تک سائے سے ڈرتا رہوں گا اور روشنیوں سے لڑتا رہوں گا؟

جب ہم ویلنسیہ سے چلے تھے تو سُورج پستیوں کی طرف رواں دواں تھا۔ صدیوں پہلے جب ویلنسیہ کے مسلم حکمران اپنے قبائلی نام و ناموس کے لاشے کندھوں پر اٹھائے در و دیوار پر حسرت کی نظر کرتے ہوئے اپنے شہر سے نکلے تھے تو اس وقت اندلس میں عظمتِ اسلام کا سُورج بھی اِسی منزل میں تھا۔ میں نے بھی ویلنسیہ کے در و دیوار پر حسرت کی نظر ڈال کر اس سے رخصت کی اجازت لی تو کوچ کے باہر کھڑے مراکشی مزدوروں نے ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے رخصت کیا تھا ان کے چہرے اندر کی طرف دھنسے ہوئے تھے۔ پینٹیں بار بار کمر کو الوداع کہنے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ ویلنسیہ کو عظمت عطا کرنے والوں کی ذلتوں میں تو ان کے لئے کوئی ہاتھ ہلانے والا بھی

نہیں تھا۔ ہر طرف نیزے اور تلواریں لہرا رہی تھیں۔ غلامی کی زنجیریں چھن چھنا رہی تھیں۔ اُندلس کے دُوسرے زوال پذیر شہروں کے حکمرانوں کو ان کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔ زوال قوموں کی آنکھوں اور کانوں پر پردے ڈال دیتا ہے۔

مراکشی مزدور مجھے خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ ڈھلکتی پتلونوں کو سہارتے اور گندی ٹائیوں کی گرہیں درست کرتے ہُوئے اور اُندلسی حیرانی سے کبھی مجھے اور کبھی انہیں دیکھ رہے تھے۔ سامنے کی سیٹ پر براجمان تیکھے نقوش والے نوجوان نے اپنے سے بھی تیکھی خاتون سے کچھ کہا۔ اس نے بھی پہلے مجھے گھُورا پھر مراکشیوں کو۔ مجھ میں اور ویلنسیہ کے ان سابقہ حکمرانوں میں فرق صاف ظاہر تھا۔ پھر وہ میرے لئے ہاتھ کیوں ہلا رہے تھے۔ اتنی چاہت کا اظہار کیوں کر رہے ہیں؟ سوال واقعی قابلِ غور تھا۔ جب یہ سب یہاں تھے حکمران تھے۔ خوشحال تھے تو آپس میں ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہے تھے۔ اب مزدوری کرنے آئے ہیں اور ایک دُور دیس کے باسی سے اس قدر محبت کا اظہار کر رہے ہیں۔ نہ ہم نسل نہ ہم زبان نہ ہم وطن پھر قصہ کیا ہے؟ وہ اپنے دیس میں اجنبی مَیں ان کے دیس میں اجنبی۔ کوچ اڈے کی حدود سے نکل کر بڑی سڑک پر آ گیا۔ ان کے قافلے بھی انہی راہوں سے گزرے تھے؟ وہ جن کے دل و جان زخمی تھے۔ بال بکھرے ہُوئے۔ چہرے اترے ہُوئے۔ آنکھوں سے دریائے کبیر رواں۔ بار بار آسمان کی طرف دیکھنے والوں کے قافلے۔ جو لوگ اپنے آپ پر خود رحم نہ کریں آسمان کو بھی ان پر رحم نہیں آتا۔ یہ دن بھی دیکھنا پڑے گا۔ اُنہوں نے کبھی سوچا تھا؟ مگر کس کو سوچنے کی فرصت تھی۔ وہ تو قتلِ برادر میں مصروف ہوتے تھے۔ نام اور نسب کے بتوں کے پُجاری ہوتے تھے اور پھر نہ کوئی بت بچا اور نہ پجاری۔ سب مٹ گئے تھے۔ حسب بھی اور نسب بھی۔ نام بھی اور نشان بھی۔ پرانی عمارتیں جدید عمارتوں کے عقب سے جھانک رہی تھیں۔ باپردہ بوڑھی مائیوں کی مانند جو لکڑی کے پھاٹکوں کی درازوں میں سے گلی سے گزرتے ہُوئے کسی خون کے رشتہ والے کو دیکھ رہی ہوں۔ میں بھی ان عمارتوں کے لئے ہاتھ ہلانا چاہتا تھا مگر ان کے سامنے جدید عمارتیں صفیں باندھے کھڑی تھیں۔ جب بھی کوشش کرتا، کوئی بلند عمارت سامنے آ گئی۔

ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر براجمان دادی جان نے سگریٹ سلگھا لیا۔ برابر کی سیٹ پر

بیٹھا لمبی ناک والا بوڑھا اس کے پہلو میں آ گیا۔ اس نے بھی سگریٹ سلگھایا اور دونوں بغیر کسی تمہید کے کسی بحث میں جُٹ گئے۔ ڈرائیور نے ان کی مصروفیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سگار منہ میں ٹھونس لیا اور مُنہ کے خول میں ہوا کو چکر دے دے کر بات کرنے کے فن کا مظاہرہ کرنے لگا۔ ڈرائیوروں کی بے دھیانی مُسافروں کی جان کے لئے خطرناک ہوتی ہے۔ کوچ میں کسی نے اس خطرے کا احساس نہیں کیا تھا۔ پیرس سے ہم جس کوچ میں سوار ہوئے تھے اس میں تقریباً سب ہی غیر اندلسی تھے۔ اب میرے ہم سفر سارے ہی اندلسی تھے۔ بوڑھے بھی اور بوڑھیاں بھی۔ کوچ ہمارے معیار سے کافی بہتر تھا مگر یورپ کے معیار سے پسماندہ تر۔ اس کو گرم اور سرد کرنے کا نظام بھی موجود تھا۔ شیشے کی کھڑکیوں کے سامنے ریشمی پردے بھی لٹک رہے تھے پھر بھی معلوم نہیں کیوں وہ آشنا سا معلوم ہوتا تھا۔ سواریوں کا اندازِ سفر بھی اپنے بہت قریب تھا۔ گفتگو گپ شپ اور تقریری مقابلہ۔ بس ڈرائیور بھی اس مقابلے میں شامل تھا۔ وہ سب ایک ملک۔ کی نسبت ایک ہی خاندان کے افراد معلوم ہوتے تھے جو گھر کی باتیں سب کے سامنے کرنے کوچ میں آ بیٹھے ہوں۔ دادی جان بہت تیز بول رہی تھیں ان کا ہمنشیں اس تیزی کا جواب بلندی سے دے رہا تھا۔ ان کے پیچھے کی نشست پر بیٹھی خاتون اپنے ہم سفر کی بجائے آگے والوں کی گفتگو میں کود پڑتی تھی اور اس کے جوابات پر اردگرد کی سیٹوں سے اُٹھنے والے قہقہوں کی تعداد اور انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ تیزی اور تندی کا جواب علم اور عقل سے دے رہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں راکھ ہوتا ہُوا سگریٹ بھی مردانہ تھا اور اس کی بات ڈرائیور بھی توجہ سے سُنتا تھا۔

ویلنسیہ کے در و دیوار سے آگے سمندر ایک بار پھر ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔ ایک طرف حدِ نظر تک نیلگوں سمندر اور دوسری طرف حدِ نظر تک پھیلے ہرے بھرے کھیت اور ان میں اُگی فصل کا ایک ایک پودا سفید موی چھتری تانے ہوئے۔ اکثر کھیت پورے کے پورے پلاسٹک کی شیٹوں سے ڈھانپ دیئے گئے تھے زمین میں گڑھے لکڑی کے کِلّوں کے سروں پر پلاسٹک پھیلا کر پورے کھیت باپردہ کر دیئے گئے تھے۔ دل چاہتا تھا کوچ رُک جائے اور میں ان کھیتوں میں چل پھر کر اس مٹی سے واقفیت پیدا کروں۔ کسانوں سے مل کر ان کی محنت کی داد دوں۔ سفید پوش پودوں سے بات کروں تھوڑا سا جذبہ محنت چُرا کر اپنے وطن لے جاؤں۔ کسی کھیت سے تھوڑی

سی مٹی اُٹھا کر بیگ میں رکھ لُوں۔ اپنا حال دل کہوں اس کی داستان سُنوں۔ مگر کوچ والوں کو میری چاہت سے کوئی غرض نہیں تھی۔ انہیں کھیتوں کی مٹی کی چوری کا بھی کوئی غم نہیں تھا۔ وہ مسلسل بول رہے تھے مسلسل اُونچا بول رہے تھے۔ سمندر کی نیلگوں مہر بلب سطح ان کے لئے نئی نہیں تھی۔ اس سطح پر سینکڑوں میل تک پھیلا گرتا پڑتا حُسن بھی۔ ان کا جانا پہچانا تھا میں کھیتوں کو دیکھتا اور فوراً گردن سمندر کی طرف موڑ لیتا۔ سڑک دونوں کے درمیان سے مچلتی ہوئی جا رہی تھی۔ ڈرائیور مسلسل سگار پی رہا تھا، بدستور باتیں کر رہا تھا۔ تیز نقوش اور تنگ لباس والی خاتون بھی اس سے زبانی مقابلہ ہار گئی تھی اور کوچ کے اندرونی سسٹم پر گونجتے نغمے کے ساتھ تالیاں پیٹنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ ڈرائیور اپنی آواز کی حفاظت کے لئے ذرا آواز مدھم کرتا یا کیسٹ بدلنے میں دیر کر دیتا تو وہ بلند آواز میں چیخنے لگتی۔ اس کے باوجود سامنے کی سیٹ پر براجمان آراستہ پیراستہ بڑھیا اور اس کا ہم زباں ساٹھ سالہ نوجوان ایک منٹ کے لئے بھی سانس لینے کو نہیں رُکے تھے۔ گانے کی بلندی، ڈرائیور کی تقریر اور تالیوں کا شور کچھ بھی انہیں مرعوب نہیں کر سکا تھا۔

بحیرہ روم کے ہمسایہ القنت شہر کو ایک منفرد اعزاز حاصل ہے۔ اس کے گرجا گھر میں وہ رومال محفوظ ہے جس سے گرجا والوں کے بقول ان کے مقدس ''باپ'' کے آنسو پونچھے گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ یسوع مسیح پھانسی دیکھ کر رونے لگے تھے اور اس رُومال سے اُن کے آنسو صاف کئے گئے تھے انہیں پھانسی چڑھا دیا گیا اور رومال اہلِ گرجا کے ہاتھ لگ گیا۔ اپنا اپنا عقیدہ ہے۔ پیغمبر حق بھی ہو اور پھانسی دیکھ کر روئے؟ یہ پیغمبر حق کی شان کے خلاف ہے۔ پھر اس صورت میں کہ جب وہ اپنے ''باپ'' کے پاس جا رہا ہو۔ کوچ والے ہمارا کچھ خیال کرتے تو ہم اِس رومال کی زیارت کر سکتے تھے۔ مگر وہ رُکے بھی تو کسی کو اتارنے اور کسی اور کو سوار کرنے کے لئے۔

القنت سے نکل کر سڑک سمندر سے علیحدہ ہو گئی۔ طویل ساتھ ایک چھوٹے سے موڑ پر چھوٹ گیا۔ شاہراہوں کے موڑ بھی زندگی کے موڑوں کی مانند ہوتے ہیں۔ کوچ نے نیلے سمندر کو پیٹھ دکھائی تو ہمسفر بھی کھڑکیوں سے باہر جھانکنے لگے۔ سیاہ بادل بہت نیچے جھک آئے تھے۔ ہری بھری کھیتیوں پر ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے گاؤں مخالف سمت میں دوڑے جا رہے تھے۔ اپنے باسیوں سمیت۔

ڈرائیور نے قہقہہ لگایا اور کوئی اعلان فرمایا۔ اس کے فرمودات کی طرح اس کا اعلان بھی پلے نہ پڑا مگر مسافروں کی تیاریوں سے اندازہ ہُوا کہ کوئی کیفے قریب ہے۔ اندلس میں ہر کیفے ایک بار ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کی طرح وہاں مسافر چائے نہیں پیتے۔ کچھ اور پیتے ہیں۔ گاؤں سے باہر کھلے کھیتوں میں خوبصورت کیفے بار کے سامنے ہم ایک بار پھر اس سوچ میں پڑ گئے کہ ''بار'' والوں کو اپنے باشعور ہونے کا ثبوت کیسے دیں۔ دوسرے ممالک میں اپنے اور اپنے ملک کے وقار کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ جو کوئی رُوم میں وہ کچھ نہ کر سکے جو اہلِ رُوم کر رہے ہوں۔ وہ یقیناً اپنے ملک کے وقار کے خلاف کچھ کر رہا ہوتا ہے۔ سُورج اور بھی نیچے جا چکا تھا۔ وہ بادلوں کی پھٹی پرانی چادر کے سوراخوں میں سے اہلِ زمین کو دیکھنے کی کوشش کرتا تو گھاس پر بارش کے قطرے موتیوں کی طرح چمک اُٹھتے۔ خواتین وحضرات بار پر ٹوٹ پڑے۔ تو اندازہ ہُوا با تونی مائی کے مُنہ سے اُٹھنے والی خوشبو سے سارا راستہ میرا دم کیوں گھٹتا آیا تھا۔ جوس کا ایک ٹن خرید کر میں باہر نکل گیا۔ اندر کا خوبصورت ماحول ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ گاؤں کے عقب میں ایک پُرانا بُرج مجھے پُکار رہا تھا جیسے سالوں کا بچھڑا کوئی اچانک مل جائے۔ میں چند قدم اس کی طرف چل کر واپس آ گیا۔ میرے اور بُرج کے درمیان ایک پورا گاؤں حائل تھا۔ گاؤں کی گلیاں آشنا آشنا سی تھیں۔ کوچ والوں کو میری نیت پر شبہ گزرا یا انہوں نے برج کی پکار سن لی تھی۔ بار سے نکلتے ہی سب نے ہم دونوں پر ہنسنا شروع کر دیا۔ ڈرائیور کے قہقہوں سے گھاس پر بارش کے قطرے بھی کانپنے لگے۔ میں رین کوٹ پر پھسلتے بارش کے قطروں اور دماغ میں رینگتے خیالات اور احساسات کے سپولیوں کو جھٹک کر پھر سے کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ کوچ کا پورا ماحول مہک رہا تھا۔ ہر مسافر چہک رہا تھا۔ صرف میں خاموش تھا۔ مرسیہ والوں کی یاد میں۔ چست خاتون اور اس کے ساتھی نے ایک بار پھر ترچھی نظروں سے میرا جائزہ لیا اور ماحول سے بے نیاز ہو گئے۔

مگر مرسیہ میں میرے داخلہ سے پہلے ہی آفتاب عالمِ تاب نے آنکھیں میٹ لیں تھیں۔ کوچ سے باہر آئے تو چار سو اندھیرا تھا۔ مرسیہ جو روشنیوں کے سیلاب میں بہہ گیا تھا۔ جس کی گلیاں علم کے نور سے منور تھیں۔ لوگ ہزاروں میل سے چل چل کر اس کے بحرِ علم سے اپنی اپنی چونچ تر کرنے آیا کرتے تھے۔ اس کے گلی گلی اور محلے محلے میں علمی محفلیں ہوتیں تھیں۔ رموزِ

کائنات پر بحث ہوتی تھی۔ اِسی بحث میں اس کے عالم رموزِ مملکت سے غافل ہو گئے تھے۔ ہم سفر اپنا اپنا سامان اُٹھا کر مختلف دروازوں سے کوچ سٹیشن سے باہر نکل گئے۔ میرے لئے سب دروازے ایک ہی طرف کو کھلتے تھے۔ ماضی کی طرف۔ ریسٹ روم سے ڈرائیوروں کی ری یونین کے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ کیا اس ریسٹ رُوم کا کوئی بھی دریچہ ماضی میں نہیں کھلتا؟ مَیں نے بیگ کندھے سے لٹکایا اور ایک دروازے کی طرف چل دیا۔ کسی رکشا یا ٹیکسی والے نے آگے بڑھ کر مجھ سے سب کچھ چھیننے کی کوشش نہیں کی۔ وہاں کوئی تھا ہی نہیں ہاتھا پائی کون کرتا۔ کمرہ معلومات کی کھڑکی بند تھی۔ عملہ اپنے گھروں کو جا چکا تھا جو نہیں گیا تھا وہ بھی تیار بیٹھا تھا۔ قرطبہ کے بورڈ سے آگے تو خستہ حال بوڑھے اُندلسی نے میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اعلان فرما دیا تھا ''منیانا'' معلوم ہوتا تھا وہ مجھے یہی بتانے کے لئے بیزار بیٹھا تھا۔ پھر اس نے کھڑکی بند کی اور دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔ منیانا کا مطلب کیا ہے؟ 'خوش آمدید؟ اب کیوں آئے ہو؟'' پہلا سلوک بھول گئے ہو؟'' ''ٹکٹ بیچنے کا وقت ختم ہو چکا ہے''۔ تم تو مور معلوم ہوتے ہو''۔ یا اور کچھ۔ کس سے پوچھوں؟ سوچتا ہُوا ایک تنگ گلی میں جا نکلا۔ ایک قدیم طرز کی بڑی سی حویلی کے خوبصورت پھاٹک پر سیاحتی رہائش گاہ کا بورڈ دیکھ کر بٹن دبایا۔ خیال تھا ابھی کوئی بوڑھی مائی باہر آئے گی۔ خندہ پیشانی سے میرا استقبال کرے گی اور چابیاں تھما کر مطلع فرمائے گی کہ اندلس کے شہروں میں رات گری خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ مگر ایک تندخو بوڑھے کی کرخت آواز نے تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ہوٹل کا بورڈ بلاشبہ ان کے دروازے پر آویزاں تھا لیکن ہوٹل کا دروازہ ساتھ والا تھا۔ سوچا تھا اس مائی سے ابن عربی کے آبائی گھر کا پتہ پوچھوں گا۔ اس کے مکتب اور مسجد کا محلِ وقوع دریافت کروں گا۔ فتوحات مکیہ میں کس کس گلی کا منظر کھینچا گیا ہے کوئی پرانی مائی ہی بتا سکے گی جس نے سینہ بسینہ یہ کہانیاں اپنی دادی یا نانی اماں سے سُنی ہوں گی۔ بوڑھے کی آواز سُن کر ان سے کچھ بھی پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ریذیڈنس کتنا بھی میجسٹی کیوں نہ ہو، ہوتا تو ہوٹل ہی ہے۔ استقبالیہ پر نوجوان نے اپنی مقدور بھر انگریزی سے میری حوصلہ افزائی کی۔ ملازم کو سامان سب سے اوپر کی منزل پر پہنچانے کا حکم دیا اور مسکرا کر چابی آگے بڑھا دی۔ میں اس عظیم کامیابی اور پرجوش استقبال پر اندر ہی اندر

خوش ہو رہا تھا۔ اس اندھیرے میں بوریا سمیت دو چار گلیوں کے چکر لگانا پڑ جاتا تو ٹبری ٹیٹ ہو جاتی۔ نیچے کی منزل میں گھریلو قسم کے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ وہ قہقہے جن میں میاں بیوی بچوں سمیت شامل ہوتے ہیں۔ لفٹ سے ایک پورا خاندان برآمد ہُوا۔ بحیرہ روم سے دوسری طرف واقعہ کسی ملک سے آیا ہُوا خاندان جو لوگ جانیں بچا کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے ان کے بچوں کے بچے اپنی سال بھر کی بچتوں سے اپنے آبا کے گھروں کو دیکھنے آ جاتے ہیں۔ ''مگر یہ تو ہنس رہے تھے''۔ نرم بستر پر دراز ہوتے ہی معلوم نہیں کیوں مجھے معصوم بچوں کی مسکراہٹ پر غصہ آنے لگا۔

اٹھائیس گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد میری ٹانگوں کو میرا ساتھ چھوڑ دینا چاہئے تھا جسم کو نرم و نازک بستر سے الگ ہونے سے انکار کر دینا چاہئے تھا۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی احتجاج نہ کیا۔ یہ اس شہر کی آب و ہوا کا اثر ہے؟ یا گھپ اندھیروں کے پیچھے چھپی روشنیوں کی کشش؟ زیادہ سوچ بچار کے لئے وقت نہیں تھا۔ میں جلد از جلد اس شہر میں گم ہو جانا چاہتا تھا۔ استقبالیہ پر کھڑے نوجوان نے چابی لیتے ہوئے مجھے قدرے حیرانی سے دیکھا۔ ابھی آئے اور چل بھی دیئے؟ وہ بھی اس اندھیری رات میں؟ اس نے ہوٹل کا کارڈ تھماتے ہوئے سٹینڈ پر رکھے تصویری کارڈوں کی طرف اشارہ کیا؟ پہلے ہی کارڈ پر جامع مرسیہ بُلند و بالا مینار کی تصویر تھی۔

سقوطِ قرطبہ کے بعد اس شہر کے خودمختار حکمران بھی اپنی قومی خودمختاری کی حفاظت نہ کر سکے تو مسجد والوں نے مسجد کی حفاظت کا عزم باندھ لیا۔ شکست خوردہ حکمران اپنے اہل و عیال سمیت شہر سے نکل گئے تو غم زدہ مسلمان اپنے اپنے اہل و عیال سمیت ڈٹے رہے۔ فاتح عیسائی بادشاہ کو اپنی ساری فوج حرکت میں لانا پڑی۔ جب جامع مرسیہ پر بھی قبضہ ہو گیا تو وہ گھوڑے سے اترا۔ مشرق کی طرف رُخ کیا اور سجدہ ریز ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو رواں تھے۔ اسے اپنی خوش بختی اور معمارانِ اُندلس کی بدبختی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اِسی وقت جامع مرسیہ کو گرجا گھر میں تبدیل کرنے کا اعلان کر دیا گیا اور مسلح دستوں نے مینارۂ توحید پر صلیب چڑھا دی۔ مسجدوں والے فاتح بادشاہوں کے سامنے تو ڈٹ جاتے تھے۔ اپنے حکمرانوں کا مقابلہ کیوں نہ کر سکے تھے؟ اہلِ مسجد ہمیشہ اپنے حکمرانوں سے شکست کیوں کھاتے رہے ہیں؟ میں نے تصویر وہیں رکھ دی اور

ہوٹل کا کارڈ جیب میں ڈال کر باہر نکل آیا۔ تنگ گلی میں جس کی رونق اور گہما گہمی کا نقشہ ابنِ عربی نے کتنی صدیاں پہلے کھینچا تھا۔ گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بجلی کے قمقمے اندھیروں سے دست و گریباں تھے۔ اِکا دُکا نوجوان ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے گزر گئے ایک بیکری کے دروازے پر کھڑے بوڑھے اُندلسی نے حیرانی سے دیکھا اور جب تک میں گلی کا موڑ نہیں مُڑ گیا وہ وہیں کھڑا دیکھتا رہا۔ مزید گلی گردی سے پہلے پیٹ کی ٹانکی فل کرنا ضروری تھا۔ ریزرو کی سوئی خطرے کے نشان کو چھو رہی تھی اور انجن قوتِ ارادی کے زور پر ہی چلا جا رہا تھا۔ میں قوتِ ایمانی کے زور پر بھی کہہ سکتا ہوں مگر اپنے بارے میں غلط پراپیگنڈہ کرنے سے فائدہ؟ پہلے ہی موڑ پر چینی طرز کے ریستوران کا بورڈ نظر آ گیا۔ بورڈ پر چینی ریستورانوں کا بین الاقوامی نشان خوفناک شکلوں والے کیڑے مکوڑے دیکھ کر یقین ہو گیا کہ انتظامیہ یقیناً چینی النسل ہو گی۔ کسی اور نسل کا آدمی ان کیڑوں کے حُسن کو نہ پہنچان سکتا ہے نہ اس کی قدر جان سکتا ہے بورڈ پر اُندلسی زبان کے ساتھ انگریزی تحریر نے مزید حوصلہ دیا اور میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

ہفتہ اور اتوار کی درمیانی شب پورے اُندلس میں شبِ مدہوشی ہوتی ہے۔ بقیہ چھ روز اہلِ اندلس اس ایک شب کے لئے جیتے ہیں۔ ایک شب کی زندگی کے لئے چھ روز مَر مَر کر گزارتے ہیں۔ اس شب وہی لوگ گھروں میں رہ جاتے ہیں جو مزید زندہ رہنے کی خواہش سے لبریز ہوں۔ ہوٹل میں ہفتہ اور اتوار کی درمیانی شب عروج پر تھی۔ میں بڑے سے ہال کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ رنگ روشنی، حسن جوانی، جام اور سبو۔ ہر کوئی گھر جانے سے پہلے جیب کا سارا بوجھ ہلکا کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا بیرے بھاگے پھر رہے تھے۔ ہال مہک رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ کہ یہاں کیوں آ گیا۔ یہاں کون پوچھے گا؟ مینجر نے دُور سے ہی میری حالت کا اندازہ کر لیا۔ ''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اس نے اپنی مقدور بھر انگریزی پلیٹ میں رکھ کر پیش کر دی۔ اگر اس سے مدد طلب نہ کی تو یہ میری غربت پر ہنسے گا یا حماقت پر؟ اگر یہی بات تھی تو اتنی دُور چل کر آئے کیوں تھے؟ یہ پوچھ بیٹھا تو اپنے ساتھ اپنے ملک کی بھی توہین ہو جائے گی جیب کی توفیق سے بڑھ کر آرڈر دیا اور شکریہ ادا کر کے پھر سے تماشہ اہلِ اندلس دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ہر طرف قہقہے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی ابنِ عربی کا غم نہیں؟ کسی جوڑے

نے بھی علم اور روشنی والوں کے نام پر جام نہیں ٹکرایا تھا۔ پورے ہال میں کوئی ایک بھی بزرگ نہیں تھا جس کے سفید بالوں کی کوئی شرم و حیا کرتا یا قہقہہ لگانے سے پہلے سوچتا۔ بیرے قہقہوں کی لہروں پر تیرتے پھر رہے تھے۔ مینجر ایک کونے میں کھڑا سارا پروگرام مانیٹر کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مَیں نے بل ادا کیا اور باہر نکل آیا۔ اندھیرے میں، تنگ گلی میں جس کی کھردری اینٹوں کے نیچے مٹی میں آشنائی کی نمی محسوس ہوتی تھی۔ تنگ گلی ایک وسیع و عریض شاہراہ میں جا نکلی جس کے دونوں طرف بڑے بڑے سٹور تھے۔ آراستہ و پیراستہ۔ شیشے کی دیواروں سے پرے ہر برائے فروخت چیز دعوتِ خریداری دے رہی تھی۔ شاہراہ روشنیوں میں نہائی ہوئی تھی۔ مگر ایسی شاہراہ کا تو فتوحاتِ مکیہ میں کوئی ذکر نہیں۔ میں کسی غلط جگہ تو نہیں آ گیا؟ ٹانگوں کی تھکاوٹ آہستہ آہستہ ڈھلنے لگی۔ شاہراہ کے آخری سرے پر فوارے سٹوروں کی چھتوں کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ چوک میں کھڑے ہو کر سمتوں کا تعین کیا اور ایک قدیم عمارت کی دیوار کے سایہ سایہ چلنے لگا۔ اس دیوار سے اپنائیت کی مہک آئی اور پھر کسی سمت کا اندازہ نہ رہا اور میں ابن عربی کے شہر کی گلیوں میں بالکل ہی گم ہو گیا۔ سوچتا ہوا کہ کسی مکان کا تو اس سے کوئی تعلق ہو گا وہ ان میں سے کسی گلی سے تو کبھی گزرا ہو گا۔

میں رات کے اندھیرے میں ایک خوابیدہ دریا کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ ایک مقام پر ایک قدیم دیوار راستہ میں آن کھڑی ہوئی۔ واپس مڑا تو ایک خوبصورت پارک میں جا نکلا۔ درختوں کے اندھیروں میں کہیں کہیں سائے حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے۔ وہاں سے بھی آگے چل دیا۔ ایک سپاہی سے گرجا گھر کا راستہ پوچھا۔ اس نے میری بات پر ہمدردانہ غور کیا۔ مگر ہم دونوں ایک دوسرے کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ پاس سے ایک نوجوان گزر رہا تھا، وہ اسے پکڑ لایا۔ اس کی انگریزی کافی توانا تھی۔ بغل میں دو چار کتابیں تھیں شاید اسی لئے ہفتے اور اتوار کی درمیانی شب بھی وہ تنہا تھا۔ مَیں نے گرجا گھر کے بارے میں پوچھا تو وہ مجھے مسجد کے سامنے چھوڑ گیا۔

کیا یہی وہ مسجد ہے جس میں محی الدین ابن عربی کو رموزِ زندگی پانے کا شوق پیدا ہُوا تھا اور جس کے سامنے فاتح فوجوں نے مفتوح مسلمانوں سے چابیاں وصول کی تھیں۔ کیا اس فضا میں بھی خاموش اذانیں پوشیدہ ہیں؟ معلوم نہیں مینارۂ مسجد کے سایہ میں کتنا عرصہ کھڑا رہا تھا کہ گھنٹیوں نے

زوالِ شب کا اعلان کر کے زوالِ امت کی داستان تازہ کر دی۔ جب مسجد کا امورِ سلطنت میں دخل نہ رہا۔ شیخ در دولت پر باوضو حاضر ہونے لگا۔ خوفِ خدا کمزور پڑ گیا اور خوف دُنیا اور اہلِ دُنیا توانا ہو گیا۔ دین سادہ فلسفہ کی گتھیوں کے بوجھ کے نیچے دب گیا۔ نسب عقل پر، تعصب عدل پر اور تخت منبر پر غالب آ گیا تو اذانوں سے اثر اور نعروں کا خوف جاتا رہا۔ تلوار کی دھار میں کاٹ نہ رہی۔ زبانیں جسموں اور رُوحوں کے کشتوں کے پشتے لگا لگا کر گنگ ہو گئی تھیں۔

مَیں اندھیری رات میں خطرے کے دائرے سے نکل کر ہوٹل کی پناہ گاہ میں واپس جانا چاہتا تھا تو مینار کا سایہ میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اگر میں چلتا رہوں تو یہ کہاں تک ساتھ دے گا؟ کب تک ساتھ چلے گا؟ میں بڑی شاہراہ عبور کر کے تنگ گلی میں جا گھُسا۔ بُلند مینار اب بھی سامنے تھا۔ گلی بہت پسند آئی۔ مَیں اپنے لاہور کے موچی دروازے کے اندر گھوم رہا تھا۔ سب لوگوں نے اپنے دروازے بند کر رکھے تھے۔ گلی بالکل ویران تھی۔ پھر بھی پیاری لگتی تھی۔ گلیوں کی چاہت میں گلی گلی پھرا۔ رات کی عمر عزیز اور بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ نقشہ نکال کر ہوٹل میجسٹی کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔ سیاحت کا اُصول یہ ہے کہ اگر آپ کسی جگہ راستہ بھُول جائیں تو ٹیکسی والے کی مدد طلب کریں۔ وہ بھُول کر بھی آپ کو صحیح جگہ پہنچا دے گا۔ بس ذرا کرایہ ہی کچھ زیادہ دینا پڑے گا مگر رات کو یہ اصول بھی کام نہیں آتا۔ صرف پولیس والے ہی کام آ سکتے ہیں اور ان تنگ گلیوں میں پولیس بھی نہیں تھی۔ ایک بار پھر بڑی سڑک پر آنا پڑا اور سٹوروں کے شوکیسوں میں رکھی اشیاء کے نشانات پر چلتا ہُوا ہوٹل والی گلی کی تلاش میں کامیاب ہو گیا۔ چینی طرز کے ریستوران کے دروازے پر کچھ نوجوان جاپانی طرز کی جنگی مشقوں میں مصروف تھے۔ ایسی مشقوں کی حدود میں سے گزرنا خطرناک ہوتا ہے مگر اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ استقبالیہ پر بیٹھا نوجوان مجھے سلامت دیکھ کر مسکرایا۔ اتنی دیر کہاں رہا؟ کیوں رہا؟ وہ فکرمند تھا، اِسے کیسے سمجھتا اور کیا سمجھاتا۔ کہہ دیا کہ راستہ بھُول گیا تھا۔ ''ہوٹل کے کارڈ پر ٹیلیفون نمبر درج تھے آپ رنگ کر دیتے''۔ کیسے بتاتا کہ جامع مرسیہ میں ٹیلیفون کی سہولت نہ تھی۔ خدشہ تھا کہ وہ یک قلم ہوٹل سے نہ نکال دے۔ ''اتنے کور ذوق ہو یہ شب بھی مندروں اور مسجدوں کے خیال میں گزارنا تھی تو اندلس آئے کیوں تھے۔ چلو بستر خالی کرو''۔ تیسری منزل کے کمرے کی کھڑکی کھولی تو دُور دُور تک روشنیاں ہی

روشنیاں تھیں۔ سارا شہر لڑکھڑاتا ہُوا محسوس ہوتا تھا۔

میں نے کھڑکی بند کر کے پردہ کھینچ دیا۔ سایہ سامنے کونے میں کھڑا تھا۔

''تم مجھ سے خفا ہو؟''

''ہاں''

''خوفزدہ بھی''

میں اپنا خوف چھپانے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

''میں تو وہی ہوں''

''کون؟''

''جامع مرسیہ کے مینار کا سایہ''

''نہیں وہ تو جامع مرسیہ کا مینارہ نہیں''۔

''جگہ وہی اینٹ وہی پتھر وہی شکل وہی حاکم شہر بدلنے سے سایہ تو نہیں بدلتا''۔

''توحید کا سایہ؟ صلیب کا سایہ؟ یہ کیا؟''

مَیں نے لائٹ آف کر دی وہ اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔

اذان کی آواز اتنی قریب سے آئی کہ تھکی ماندی رُوح بھی بیدار ہو گئی۔ مرسیہ میں اذان؟ ہم نے تو خود ہی اس شہر اور دیس میں اذان کو ہمیشہ کے لئے بند کروا دیا تھا۔ یہ آواز کہاں سے آئی؟ کمبل سے مُنہ نکالا تو کونے میں کھڑا سایہ اذان کہہ رہا تھا۔ ''اللہ اکبر اللہ اکبر''۔ مجھے اس کی بات پر یقین آ گیا اور اپنی بدگمانی پر غصہ آنے لگا۔ وضو کے لئے روشنی جلائی تو وہ کھڑکی کے راستے باہر نکل گیا۔ یہ مجھ سے ناراض ہے یا طلوع آفتاب سے پہلے اپنے گھر جانا چاہتا ہے؟ دل چاہتا تھا جسم چُور چُور رہو اور پھر سے بستر میں لیٹ جاؤں۔ اٹھائیس گھنٹے مسلسل سفر چھ گھنٹے مسلسل مرسیہ گردی۔ دل کی خواہش کوئی بے جا بھی نہیں تھی مگر دُنیا میں ہر خواہش کب پوری ہوتی ہے۔ کھڑکی کھولی تو مغربی منڈھیروں پر نئی سُرخی پھیل رہی تھی۔ مرسیہ کے شب بیدار ابھی تک سو رہے تھے اور گرجوں کی گھنٹیاں انہیں جگانے کے لئے مسلسل چلا رہی تھیں۔

مَیں ایک بار پھر تنگ گلیوں میں نکل گیا۔ کیا معلوم زندگی میں پھر کبھی ان میں قدم دینا

نصیب ہوگا یا نہیں ایک گلی کے آخری کونے پر ایک چھوٹی سی دکان کھلی تھی اور بڑی بوڑھیاں شب بیداروں کے لئے ناشتہ کا سامان خرید رہی تھیں۔ تم کیا لینے آئے ہو؟ دکاندار کی نظروں نے سوال کیا۔ ایک بڑھیا نے بھی مجھے پہچاننے کی کوشش کی۔ ''مال لیچے''۔ اُس نے دُودھ کی بوتل اور لمبی لمبی روٹی تھما دی۔ مزید وہاں کھڑے ہونے کا کوئی بہانہ نہیں تھا۔ مَیں انہی گلیوں سے ہوتا ہُوا واپس ریذیڈنس میجسٹی آ گیا۔ جن گلیوں سے ہوتے ہُوئے عرب واپس افریقہ کے صحراؤں میں چلے گئے تھے۔ وہ عرب جنہیں عروج پسند نہ آیا اُندلس راس نہ آیا۔ علم ان کی فطرت نہ بدل سکا۔ تعصب علم سے توانا ہے۔

استقبالیہ والے نے چابی وصول کرتے ہوئے مجھے ایک بار پھر حیرانی سے دیکھا۔ ''چل بھی دیئے؟'' عہد جوانی کی مانند مگر میں جلد از جلد قرطبہ پہنچنا چاہتا تھا۔ ورنہ مرسیہ کی مٹی میں خوشبو تھی۔ اس کی ہوا اور فضا بڑی مانوس محسوس ہوتی تھی۔ مجھے چند روز ٹھہرنا چاہئے تھا۔ اس کی رُوح کی اُداسی کی گہرائی کو جانچنے کے لئے رک جانا چاہئے تھا۔ گلیاں اب بھی تھوڑی تھوڑی ہی آباد ہوئی تھیں۔ مگر میرا ہلکا پھلکا سامان بہت وزنی ہو گیا تھا۔ گلی کے پتھر جوتے کے اندر سے اپنے وجود کا احساس دلا رہے تھے۔ ایک نئی گلی کے موڑ پر مَیں سامان رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک طرف سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ ایک ویران گھر کے درختوں کے جھنڈ کی چھاؤں میں چند لڑکے گانے کی مشق کر رہے تھے۔ اس دیس میں گانے کا دھندا بہت چلتا ہے۔ شہر کے درمیان سے گزرنے والے خشک دریا میں ایک قدیم پن چکی کا پہیہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ مُسلمانوں کے دور میں اس دیس میں پن چکیوں کا بہت رواج تھا۔ مسلمان چلے گئے اور پن چکیاں پیچھے رہ گئیں۔ معلوم نہیں یہ پہیہ کب سے اسی طرح کھڑا ہے، یہیں پڑا ہے۔ اہلِ اندلس سیاحتی اہمیت کی اشیاء کی بہت دیکھ بھال کرتے ہیں۔ لکڑی کا یہ بڑا سا چکر سیاحوں کو عربوں کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ سُورج اور بھی بلند ہو گیا تھا۔ مرسیہ پارک میں بہت سے لوگ سنڈے منا رہے تھے۔ گرجوں کی گھنٹیاں مسلسل پکار رہی تھیں مگر وہ ان کی آواز پر کان دھرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ بچّے بوڑھے سب اِدھر اُدھر کودتے پھر رہے تھے۔ فوارے اچھل رہے تھے۔ خوبصورت پھول اور خوبصورت فضا۔ میرا بوجھ ناقابلِ برداشت ہونے لگا۔ مَیں نے ایک تصویر بنائی اور لاری اڈے کی طرف چل دیا۔ اس خیال سے کہ ابھی قرطبہ روانہ

ہو جاؤں گا۔ اڈے پر ٹانواں ٹانواں مسافر تھا۔ قرطبہ کے لئے مخصوص کھڑکی پر گیا تو وہاں سے ایک بار پھر ''منیانا'' میں جواب ملا۔ جس کا مطلب تھا کل آنا مگر اب انتظار کی گنجائش ہی کب تھی۔ کہیں جانا ہی ہے تو غرناطہ کیوں نہیں۔ کوچ لائن حاضر تھا۔ ٹکٹ خرید کر ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ مَیں مرسیہ میں تھا۔ کوچ کے ایک کونے میں بے حس و حرکت بیٹھا تھا اور میری روح بہت دور دمشق کے ویرانوں میں صاحب فتوحات کو تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ اندلس کے علماء نے علم کو اِسلام کے منافی قرار دے دیا تو ابن عربی کو اپنا ملک اور اپنا دیس چھوڑنا پڑ گیا تھا۔

اور غرناطہ گم ہو گیا

''اللہ نے غرناطہ کو اسلامی مملکت کی سرحد بنا دیا
اور اسے روساءِ عرب کی جلوہ گاہ بنایا
آب و ہوا کے اعتدال نہروں کی روانی
عمارتوں کی وسعت
اور درختوں کی کثرت سے ممتاز فرمایا
اس کی دیواروں نے ان سرداروں کو جگہ دی جن کے ناگہانی داخلہ سے صبح ڈرتی ہے۔
اور جن کے حملہ سے رات خوف کھاتی ہے۔
علماء جن کے سامنے جملہ علوم سر تسلیم خم کرتے ہیں۔
اولیاء اور زاہد کہ جب کسی چیز پر اڑ جاتے ہیں تو خدا بھی ان کی خوشنودی کے لئے پورا کر دیتا ہے۔
فصحاء اور بلغاء جو دریائے فصاحت و بلاغت سے موتی نکال کر حاشیوں پر جڑ دیتے ہیں
غرناطہ میں بستے ہیں۔
غرناطہ زمانے کی زینت ہے۔
خواہش نفس اس کے معانی پر شیدا ہے۔
اب غرناطہ اندلس کے شہروں میں قطب کی حیثیت رکھتا ہے۔
اوجِ کمال کا مفہوم اس پر ختم ہے۔''

قربت غرناطہ سے ابن الخطیب کے غرناطہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ کسی نے کہا تھا کہ غرناطہ کی فضیلت اس

سے زیادہ اور کیا ہو گی کہ یہ محمد لسان الدین ابن الخطیب کا مولد و مسکن ہے اور ابن الخطیب نے اپنے غرناطہ کو مسلم اندلس کے شہروں کا قطب قرار دیا تھا جس پر اوجِ کمال کا مفہوم ختم تھا۔ غرناطہ سامنے وادی میں چمک رہا تھا۔ بس لمحہ لمحہ اس سے قریب ہو رہی تھی۔ ڈرائیور نے دُور تک پھیلی روشنیوں کو دیکھا اور گانے کی آواز بلند کر دی۔ سپینی مسافر خوشی سے تالیاں پیٹنے لگے۔ وادی کے اوپر ردائے شب اور اس کے دامن میں ادائے شب نغمہ تالیاں اور روشنیوں کا سیلاب اور پھر ابن الخطیب کا غرناطہ کہیں گم ہو گیا۔ صدیوں پُرانا حادثہ ایک بار پھر بیت گیا۔ حادثہ جو ابو عبداللہ کے اخراج پر بیتا تھا میرے داخلہ پر پیش آ گیا تھا۔ غرناطہ چھن جانے کا ایک شاہ کا حادثہ ایک سیّاح پر بیت گیا تھا۔ کاتب تقدیر اوراق ارض پر تاریخ نقش کرتا ہے۔ انسان اسے کاغذ پر محفوظ کر دیتے ہیں میں کاتب تقدیر کے زیر تحریر اوراق میں کاغذی تاریخ کا غرناطہ تلاش کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

پروگرام قرطبہ سے براستہ اشبیلیہ غرناطہ آنے کا تھا کیونکہ جس تاریخی المیہ نے غرناطہ کو اسلامی مملکت کی سرحد بنا دیا تھا اس کی منازل یہی تھیں۔ مگر اہلِ اُندلس کو میرا تاریخ زوال کے قدموں پر چلنا پسند نہ تھا۔ مرسیہ کے ''استاسیون دے ایل اوتو بس'' کے ٹکٹ خانہ کی کھڑکی میں مزین بزرگ نے مجھے دُور ہی سے دیکھ کر نعرہ بلند کیا تھا منیانا''۔ قبرِ مسافر بر جانِ مسافر۔ تقدیر تاریخ کے تعاقب کے حق میں نہیں تھی۔ ہم کھجور کے باغوں سے انگور کے باغوں تک کے سفر میں ایک پورا دن گزار کر غرناطہ پہنچے تھے اور وہ شب روشن میں کہیں گم ہو گیا تھا۔

کھجور جو ایک وقت اس زمین میں تنہا اور رنجور تھا اب اُداس اور غمناک ہے۔ تب صحرا سے جُدائی میں غمگین تھا اب اہلِ صحرا کی یاد میں غمگین ہے جو اسے صحرا سے لائے اور پھر اُندلس میں تنہا چھوڑ کر صحراؤں کی طرف لوٹ گئے تھے۔ اب اندلس میں کھجور آرائش اور نمائش کے لئے کاشت کرتے ہیں۔ مرسیہ اور اس کی راہ میں پڑے شہروں کے پارکوں اور چوکوں میں کھجور یہی فرضِ انجام دیتا ملا۔ آج کے اندلس کو کھجور سے وہ قلبی اور جذباتی لگاؤ نہیں جو عبدالرحمٰن الداخل اور اس کے ہم اصل اہلِ اُندلس کو ہوتا تھا۔ انگور ہر جگہ ہشاش بشاش ہے ہر گھر میں مرد و زن کے قلب و نظر سے قریب تر ہے مگر کھجور اداس ہے۔

مرسیہ سے چلے تو ہم ایک درجن تھے گیارہ مالکانِ اُندلس اور ایک زائر اُندلس۔ غرناطہ تک

بس شکم سیر ہو چکی تھی۔ خشک گنجے پہاڑوں سے بچ بچ کر نکلتی پسماندہ سڑک پر چلے تھے اور غرناطہ تک پہنچتے پہنچتے پہاڑوں کے سروں پر شجر و سبزہ اُگ آئے تھے اور شام کی سیاہی پھیلنے سے پہلے دُور کہیں ایک سفید سر چوٹی بھی دکھائی دی تھی۔ جب چلے تھے تو فلک نے نیلی چادر تان رکھی تھی۔ ہم چلتے رہے فلک لباس بدلتا گیا پھر جہاں بھی گئے سڑکیں فلک کے آنسوؤں سے تر بتر ملیں۔ گرد و غبار دِل زائر کی مانند بیٹھ گیا تھا۔ فضا اہلِ اُندلس کے چہروں کی مانند صاف تھی۔ سواریاں کہیں ایک کہیں دو کسی سٹاپ پر رونق نظر نہیں آئی۔ مسافروں کے پاس سامان بھی واجبی سا ہوتا تھا۔ چھ گھنٹے کے سفر میں راستہ میں ایک دو بسوں ہی سے شرفِ ملاقات حاصل ہو سکا تھا البتہ اردگرد کی ہر پہاڑی پر مسلمان دور کا کوئی متروکہ برج یا قلعہ استقبال کے لئے موجود تھا۔ دیہات و قصبات میں صلیب بردار مساجد دیکھتی رہ گئیں۔ پستہ قامت پہاڑوں کے دامن غار نما گھروندوں سے داغ داغ، ویرانوں میں بھیڑوں کے ریوڑ اور خستہ حال چرواہے معلوم ہوتا تھا ہم یورپ میں نہیں اپنے بلوچستان کے کسی دُور مقام کے سفر پر ہیں اور غرناطہ کے نواح میں سبی سے نیکسلا پہنچ گئے۔ سڑک کے کنارے وہی پتھر کے کونڈوں اور کونڈیوں کی دکانیں۔ پتھر اور مٹی کی کنالیاں اور پلیٹیں جن کے چہروں پر چمکیلے رنگوں سے بھدّے نقوش بنے تھے تانبے کی اپنی سی کڑاہیاں اور چھاننے دکان کے اندر سے باہر سڑک تک سجے سجائے ملے۔ وہ تہذیب مسلم کے باقیات تھے یا اُندلسی دستکاری کے شاہکار میں کچھ فیصلہ نہ کر سکا بس کہیں رُکی نہ کسی ہمسفر سے ہم زبانی کا شرف حاصل تھا۔ سڑک بھی معیارِ سیاحت سے کافی گری گزرنی تھی۔

ابوالخطیب کا غرناطہ گنوا کر مَیں نے بس کی کھڑکی کھول دی، ٹھنڈی ہوا کا جھونکا پیشانی چومتا ہوا سامنے کی کھڑکی سے جا ٹکرایا۔ نغمے کی لَے کھلی کھڑکی سے نکلی اور فضا کی وسعتوں میں پھیل گئی۔ بس بلندی سے نیچے آ رہی تھی اور میں دُور دُور تک پھیلی روشنیوں میں گم ہو جانے کے لئے کھڑکی سے لگا سر بلند خوبرو عمارتوں میں الحمرا تلاش رہا تھا۔ میرے ہمسفر تالیاں بجاتے رہے مجھے نہ کہیں قدیم غرناطہ دکھائی دیا نہ الحمرا کی جھلک نصیب ہوئی۔ چار سُو پھیلی جدت نے احساس قدامت کو کچل کر رکھ دیا تھا۔

مسلمانوں نے رُومیوں کے سنام الاندلس کو البیرہ کا نام دیا تھا۔ فتح اُندلس کے بعد قرطبہ

میں شامی و یمانی کے جھگڑے ختم کرنے کے لئے مختلف علاقوں سے آنے والے عرب قبائل کے لئے مختلف مقامات وقف کر دیئے گئے تو وادی البیرہ شامی قبائل کے حصہ میں آ گئی تھی۔ البیرہ اندلس کے نامی شہروں میں شمار ہونے لگا اور پھر وہ وقت بھی آیا جب ''جامع البیرہ کے دروازے پر ایسے گھوڑے مجتمع رہتے جن کی لگاموں کے دہانے تمام تر چاندی کے بنے ہوتے''۔ عرب و بربر کی جنگ عظیم میں جو آبادیاں بے نشاں ہوئیں ان میں البیرہ بھی شامل تھا نہ جامع البیرہ بچی نہ چاندی کے دہانوں والی لگاموں سے مزین گھوڑے رہے۔ اس شہر کی واحد نشانی ابن سہل بن مالکؒ کا مزار ہوتی تھی اب وہ بھی نہیں۔

برباد شہروں اور بے نشاں آبادیوں کے باسی غرناطہ کی محفوظ وادی میں پناہ گزیں ہوئے تو البیرہ کے کھنڈرات کے پڑوس میں ایک نیا شہر بس گیا۔ دلی لٹتی ہے تو لکھنؤ اور دکن بستے ہیں۔ قرطبہ لٹا تو غرناطہ بس گیا۔ عربوں کی قبائلی لڑائیوں کے نتیجے میں اس شہر میں بھی ایک الگ ریاست وجود میں آ گئی تھی جو قرطبہ اور اشبیلیہ کے سقوط کے بعد اڑھائی سو سال تک مسلمانانِ اندلس کی پناہ گاہ بنی رہی تھی۔ اندلس کی وسیع و عریض مسلم سلطنت کے مالکوں میں کوئی عرب تھا کوئی شامی کوئی یمانی اور کوئی بربر۔ زوالِ خلافت سے مسلم سلطنت درجن بھر عرب اور بربر ریاستوں میں بٹ گئی تھی پھر یہ ریاستیں بھی ایک ایک کر کے عیسائیوں کے قبضہ میں جاتی رہیں تو عرب بربر یمانی و شامی پھر سے مسلمان ہو گئے۔ غرناطہ مٹتی مسلم ریاستوں کے مسلمانوں کا آخری قلعہ بن گیا۔ سارے اُندلس کے فقیہہ، علماء، حکماء، شاعر، ادیب، فنکار، سردار، ہنرمند جو بھی بچا اس شہر کی طرف ہانک دیا گیا۔ ''خدا غرناطہ کو محفوظ رکھے یہ ایسی جگہ ہے جہاں غمگین کو مسرت اور جلاوطن کو پناہ ملتی ہے''۔ قاضی ابوبکر نے اس کے لئے دعا کی تھی اور غرناطہ کی سلطنت کے وزیراعظم ابوالخطیب نے اسے اُندلس کا قطب قرار دیا تھا جو اسلامی آبادی کی سرحد بن گیا تھا مایوسی میں خدا اور مجبوری میں اسلام سب کا سہارا تھا۔ سب نے مسلمان بن کر اڑھائی صدیاں اس سرحد کی حفاظت کی۔ یورپ اور سپین کی متحدہ قوت کا جذبہ جہاد و قربانی سے مقابلہ کیا کیونکہ ان کے پیچھے سمندر وہ تھا جس کو عبور کرنے کی کشتیاں صدیوں پہلے طارق بن زیاد نے جلوا دی تھیں۔

بلدار سڑک پر پھسلتی بس تیز رفتاری قائم نہ رکھ سکی تو ڈرائیور نے مغنیہ کا گلا دبایا اور تالیاں

بجانے والے بھی کھڑکیوں سے باہر دیکھنے لگے۔ وادی غرناطہ پر حسن اور نور کی برسات سے لطف اندوز ہو رہے تھے، مزید پستی پر اترے تو بلند عمارتیں اور بھی بلند ہو گئیں۔ بلندی اور پستی سے اشیاء کو دیکھنے کا زاویہ بھی بلند بخت اور پست ہمت کے زاویہ نگاہ کی مانند الگ الگ ہوتا ہے۔ میں تاریخ کے غرناطہ کی بلندی سے زمینی غرناطہ میں پہنچ چکا تھا۔ ہم سفروں کے چہروں سے منزل یابی کی خوشی اور بے چینی ٹپکنے لگی۔ میرے آج کے سفر کی منزل مسلمانانِ اُندلس کے آخری سفر کی آخری منزل تھی مَیں روشن سڑکوں پر سیاہ بخت آخری مسافر کو بوجھل قدموں سے چلتا دیکھ رہا تھا۔

اجنبی لوگ انجانا شہر پرایا دیس۔ بس سٹینڈ کی جملہ روشنیاں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ میں اپنے اندرونی اور بیرونی تاثرات چھپانے کی کوشش میں بیگ اُٹھا کر جلدی سے کھلی سڑک پر نکل آیا۔ مسافر اپنی اپنی جلدی اور اپنی اپنی خوشی میں تھے۔ کسی نے کوئی توجہ نہ دی۔ قاضی ابوبکر کے شہر میں اس کا شعر کئی بار گنگنایا لیکن اس نے غمگین کو مسرت نہ دی۔ سڑک چلتے لوگوں کا راستہ روک کسی ہوٹل کی راہ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ایسا نہ ہو صحرائے مراکش کا راستہ دکھا دیں۔ بغلی سڑک کے کونے سے ہوٹل کا بورڈ دیکھ کر مُڑ تو گیا لیکن وہاں کوئی ہوٹل نہ تھا۔ واپس مُڑنے کو تھا کہ کسی کھڑکی سے کوئی آواز آئی۔ آواز کی سمت میں کھلی کھڑکی سے ایک گنجا سر باہر کو ڈھلک رہا تھا۔ ان پہاڑیوں کی مانند ویران جنہیں ہم بہت پیچھے چھوڑ کر اس شاداب وادی میں اترے تھے۔ گنجے نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے وہیں سے اس مسافر نوازی کا شکریہ ادا کیا تو اس نے اپنے پورے بتیس دانت دکھا دیئے۔ اس نے اپنی مادری زبان میں کوئی استقبالیہ کلمات بھی کہے جو اپنی سمجھ میں نہیں آئے۔ انگریزی میں ''RECEPTION'' کے تیر کے نشان پر چلتا ہوا اوپر کی منزل تک پہنچا تو وہاں پر واقعی ''RECEPTION'' موجود تھی۔ گنجے کے پہلو میں ایک مائی بھی براجمان تھی۔ اس کے اندازِ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے دیکھ کر دلی مسرت محسوس کر رہی ہے اس خوشی کے باوجود مائی اپنے جذبات پیش کر سکتی تھی نہ مسافر کی بپتا سمجھ سکتی تھی۔ مائی اور بابا جی کی جملہ انگریزی RECEPTION تک پہنچ کر ختم ہو گئی تو مائی کرسی پر بیٹھی بولتی رہی بابا میز پر جھکا سنتا رہا اور مَیں اپنی مبلغ سینی میں اپنا حالِ زار بیان کرتا رہا۔ جب کافی دیر تک مقابلہ برابر رہا تو مائی نے بابا جی سے کچھ کہا۔ وہ میز پر بڑا بیگ اٹھا کر ایک طرف کو چل دیا۔ مَیں اس کے تعاقب

میں ہولیا۔ دو ٹانگوں کے لئے ساختہ جسم اور بیگ کا مشترکہ وزن اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا بیگ لینا چاہا تو اس نے جھٹ سے درخواست قبول کر لی۔ لمبی راہداری کے دونوں طرف بند کمروں کا لمبا چکر دے کر وہ ایک سنگل کمرے کے سامنے رُک گیا۔ میری طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا جیب سے چابی نکال کر کمرہ کھولا اور بلب کی زندگی کا بٹن دبا دیا۔ کمرہ کافی معقول نظر آتا تھا، سب سے خوشی کی بات یہ تھی کہ اس کی بیرونی کھڑکیاں بڑی سڑک اور اس سے آگے کی بڑی بڑی عمارتوں کی سمت میں کھلتی تھیں۔ میں کھڑکی سے باہر کا جائزہ لینے لگا تو بابا جی نے آہستہ سے فرمایا OCCUPIED۔ مجھے اس مذاق پر بہت غصہ آیا اگر صورتحال ہی اتنی زیادہ ''OCCUPIED'' ہی تھی تو اس نے اپنی محبوب انگریزی کا اکلوتا لفظ ری سپشن پر ہی کیوں پیش نہ کر دیا؟ اتنا لمبا چکر لگانے اور دینے کی کیا ضرورت تھی؟ انگریزی کا سپینش سے مقابلہ شدت اختیار کر گیا تو سامنے کے کمرے سے ایک نوجوان انگریز برآمد ہوا۔ شاید اپنی مادری زبان کے تحفظ کے لئے۔ اس نے بابا جی کی بات سمجھ کر انگریزی میں بتایا کہ حضور فرماتے ہیں کمرہ ہے تو چڑھا ہوا مگر کرایہ دار آج کی رات واپس نہیں آئے گا۔ آپ بے فکر ہو کر رات سوئیں مگر صبح کمرہ خالی کرنا ہو گا۔ ''ہم تو سارا اُندلس خالی کر گئے تھے یہ تو ایک کمرہ ہے وعدہ رہا''۔ میں نے بیگ میز پر رکھا دیا۔ بابا اپنی لمبی ناک کو کافی تکلیف دہ انداز میں سکیڑ کر بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نوجوان نے اس کی مشکل آسان کر دی اور میرا سارا مطلب اس کی خدمت میں گزار دیا۔

''مور؟'' اس کے چہرے کے ویران کھنڈرات میں خوشی کا نور پھیل گیا۔

''مور نہیں مسلم''۔

وہ پھر کسی الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ نئی الجھن کوئی نیا مسئلہ کھڑا کرتی مَیں نے شرط پیش کر دی ''آپ کو اس کا سامان بھی اس کی آمد تک باہر نکالنا ہو گا''۔ بابے نے بڑی سعادت مندی سے چاروں کونوں تک بکھرا سامان سمیٹا اسے راہداری کی الماری میں محفوظ کیا اور کمرے کو نئے سرے سے آراستہ کر دیا۔ پھر داد طلب نگاہوں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو ''اور کوئی خدمت''۔

سامان سپردِ کمرہ کر کے استقبالیہ پر آیا تو بابا جی میز پر بڑا سا نقشہ پھیلائے کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی نقشے کے نشانات پر انگلیاں رکھ رکھ رواں ہو گئے۔ میں اس شہر میں کھو جانے کو آیا

ہوں۔ یہ راستے سمجھا رہا ہے۔ مجھے اس کی جلد بازی اور مورنوازی اچھی نہ لگی مگر اس کے گھر میں اس کے شکریہ سے بخل مستقبل میں ناخوشگوار حالات کا سبب ہوسکتا تھا۔ اس کا گراسیا ادا کیا نقشہ اٹھایا اور رات کے اندھیروں، شب کی روشنیوں سے منور گلیوں اور بازاروں میں گم ہوگیا طویل سفر کی تھکن دن بھر کی بھوک کچھ بھی محسوس نہ ہوا۔ شوق اور تجسس کے پروں پر اُڑتا ہوا ایک وسیع چوک میں جا نکلا چوک کے وسط میں گول دائرے میں جڑے فوارے رقصِ نیم شبی میں مصروف تھے۔ جھومتے فواروں کے سروں پر روشنوں کی بارش ہو رہی تھی، پاس ہی خلعت شاہی سجائے ایک محترمہ بلند چبوترے پر تشریف رکھتی تھیں اس کے قدموں میں سر جھکائے ایک صاحب مؤدب کھڑے تھے۔ محترمہ کے زانوں پر ایک طویل دستاویز پھیلی تھی وہ دونوں اس دستاویز کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ رات کے اس وقت یہ عین چوک میں کیوں آن بیٹھے ہیں ان کے گھر میں روشنی نہ تھی یا سمجھنے سمجھانے کی فرصت نہیں مل سکتی تھی، قریب ہو کر گفتگو سننا چاہی تو خاتون کی آنکھوں میں جلال شاہی اتر آیا، مرد کی آنکھوں سے خوف ٹپکنے لگا مزید قریب ہوا تو مرد کا پاؤں پھسلتے پھسلتے بچا۔ اگر یہ لڑھک گیا تو امریکہ کا کیا بنے گا؟ یہ سوچ کر پیچھے ہٹ گیا میں راستہ بھول کر اس چوک میں نکل آیا تھا اور موصوف راستہ بھول کر امریکہ جا نکلے تھے۔ غرناطہ سے مسلمانوں کو نکالنے کے بعد محترمہ کو انسانوں کی نجات کی فکر دامن گیر رہنے لگی تو ان صاحب نے انہیں ہندوستان کے مسلمانوں کی ''نجات'' کا منصوبہ پیش کیا تھا۔ رات کی تنہائی میں وہ اسی منصوبہ پر غور وفکر کر رہے تھے۔ موصوف ہندوستان کی راہ تلاش کرنے چلے اور امریکہ پہنچ گئے۔ ہماری قسمت اچھی تھی یا امریکہ کے ریڈ انڈئینز کے مقدر بُرے تھے؟ اہلِ سپین نے اپنی تاریخ اس چوراہے میں کیوں لا کھڑی کی ہے؟ مجھے خوفزدہ کرنے کے لئے یا امریکیوں پر احسان جتانے کے لئے الحمرا کے ہر زائر کو اسی راہ سے گزرنا ہوتا ہے۔

سڑک بلندی کی طرف مائل ہوئی تو روشنیوں پر اندھیرا غالب آ گیا مزید آگے گیا تو نظروں کے سامنے درخت اُگ آئے۔ مزید بھول مجھے جبل سبیقہ کے قدموں میں لے آئی تھی۔ جبل سبیقہ جو صدیوں سے سر پر الحمرا کا تاج اٹھائے سینے پر مدینۃ الحمرا کے داغ سجائے تماشۂ اہلِ کرم کر رہی ہے۔ ذہنی طور پر مَیں ابھی جبلِ سبیقہ سے ملاقات کے لئے تیار نہیں تھا اس اچانک

تعارف پر ہم دونوں گھبرا گئے۔ میں نے اس کی خلوت میں مداخلت کی گستاخی کی تھی، اس نے میرے تصوّر کے خاکے چکنا چور کر دیئے تھے۔ جبلِ سبیقہ کے پہریدار اونچے درختوں کے پتے سرگوشیاں کرنے لگے اور بھی آگے بڑھنا چاہا تو اندھیرے کی سدِ سکندری سینہ تان سامنے آن کھڑی ہوئی۔ الحمرا کی طرف سے آنے والی ہوائیں سیٹیاں بجانے لگیں میں خطرے کا احساس کر کے واپس لوٹ گیا۔ بڑی سڑک سے ملحق گلیوں میں گھومنے چلا تو قدموں نے خواہش کا ساتھ دینے سے معذوری ظاہر کر دی جس طرح اس جبل کے آخری حکمران نے اپنی حکمرانی کی آخری شب مسلم اندلس کے آخری جرنیل مُوسیٰ سے غیرت اور شہادت میں تعاون سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ رات کے ایسے ہی اندھیرے میں موسیٰ جبل سبیقہ سے اکیلا ہی نکلا تھا۔ وہ شہادت گاہ کی طرف جا رہا تھا اور میں قیام گاہ کی طرف آ رہا تھا۔ اپنا اپنا مقدر اپنی اپنی منزل۔ میں تنگ تنگ بازاروں والی مارکیٹ سے ہو کر ایک پارک میں پہنچ گیا۔ پستہ قامت درختوں کے زیرِ سایہ خالی بنچ اونگھ رہے تھے رات کے اس پہر مرسیہ آباد تھا اور رات کے اس وقت غرناطہ اونگھ رہا تھا۔ یہ تہذیب مسلم سے زمانی قربت کا اثر ہے یا تہذیب یورپ سے مکانی قربت کا؟ میں نے تنگ گلیوں میں خاموش اذانیں سننے کی کوشش میں گرجوں کی گھنٹیوں کی پکار بھی سُنی جب ہوٹل پہنچا تو مائی چھٹی جا چکی تھی، اور بابا میرے انتظار میں اونگھ رہا تھا۔ سب سیاح کمرہ بند ہو چکے تھے۔ اسے صرف میری وجہ سے مائی صاحبہ کی گدی پر بیٹھنا پڑ رہا تھا۔ چابی تھماتے ہوئے اس نے ناگواری سے گھورا جیسے کہہ رہا ہو، اس شہر کی تو یہ روایت نہیں، پانچ صدیاں گزرنے پر بھی اس کی روح نہیں بدلی اس کے لباس کی تبدیلی سے کسی غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو جانا۔

غم کی وجہ کھنڈر مجھے پسند نہ آئے

غرناطہ میں پہلی صبح کا آغاز صلیبی جنگ سے ہوا۔ استقبالیہ پر جمی بُڈھیا نے اپنے گلے میں لٹکتی روپہلی صلیب سے کھیلتے ہوئے موٹے شیشوں کی عینک چھوٹی سی ناک پر ایڈجسٹ کی اور رواں ہوگئی۔ وہ کبھی میرا پاسپورٹ دیکھتی کبھی ہوٹل کا فارم۔ گنجے صاحب رات والے انداز میں سامنے کی میز کے سہارے مؤدب کھڑے تھے اور کبھی کبھی کسی سوال کا جواب دے دیتے تھے۔ پھر دونوں نے سوالیہ توپوں کا رخ میری طرف موڑ دیا، میں حسب توفیق دفاعی گولہ باری کرتا رہا لیکن ان کے مشترکہ حملہ کو پسپا نہ کرسکا۔ نہ مجھے سمجھ آ رہا تھا کہ وہ کیا پوچھ رہے ہیں نہ انہیں سمجھائی دیتا تھا میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اتنا اندازہ کرسکا کہ پوپلے منہ والی مائی انگریزی میں کی گئی خانہ پُری سے مطمئن نہیں اگر وہ انگریزی پر اعتراض انگریزی میں کرتی تو کچھ جواب دیتا انگریزی پر ہسپانوی میں اعتراضات سراسر زیادتی تھی۔ ہسپانوی قوم صدیوں سے مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کرتی آئی ہے۔ مَیں مزید کوئی زیادتی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا، خواہ آج کا سارا دن کسی اور ہوٹل کی تلاش میں ضائع ہو جائے، پیسے بھی دوں اور زیادتی بھی برداشت کروں۔ ابوالحسن والیٔ غرناطہ نے فرڈی ننڈ اور ازابیلہ کے سفیروں کو جواب دیا تھا کہ اب غرناطہ کی ٹیکسالوں میں خراج کے لئے درہم نہیں جنگ کے لئے تیغ وتفنگ بنتے ہیں۔ مائی کے حملہ سے شبہ ہوتا تھا کہ فرڈی ننڈ اسے مجھ سے بقیہ خراج وصول کرنے کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ مَیں اسے ابوالحسن والا جواب دینے ہی والا تھا کہ اپنی انگریزی پر مسلسل ہسپانوی گولہ باری کا شور سُن کر قریبی کمرے سے ایک انگریز جوڑا برآمد ہوگیا۔ نوجوان اسی طریق سے ہسپانوی کی مٹی پلید کرنے لگا جس طریق سے مائی انگریزی

پلید کر رہی تھی۔

''یہ فرماتی ہیں آپ کے پاسپورٹ پر تو لکھا ہے کہ ''آپ ضلع گورداسپور مشرقی پنجاب انڈیا میں پیدا ہوئے تھے۔'' ''انہیں اس پر کیا اعتراض ہے؟'' ''وہ فرماتی ہیں کہ ایک آدمی انڈیا میں پیدا ہو کر پاکستانی شہری کیسے ہوسکتا ہے۔ شہریت کے خانہ میں آپ نے پاکستان جو لکھا ہے۔'' ''ایک کروڑ سے زائد مسلمان انڈیا میں پیدا ہوئے تھے اور اب پاکستانی شہری ہیں''۔ ''لیکن محترمہ کو یہ بات سمجھ نہیں آ رہی''۔ ''لاکھوں مور اندلس اور غرناطہ میں پیدا ہوئے تھے لیکن انہوں نے انہیں مراکشی شہریت میں دھکیل دیا تھا''۔

نوجوان مسکرایا اور میرے جواب کا ہسپانوی میں ترجمہ کرنے لگا۔ مائی جی اور گنجے صاحب نے مشترکہ سر ہلائے۔ ''ہم مسلمانوں کا یہ صدیوں سے المیہ چلا آ رہا ہے کہ ہم پیدا ایک ملک میں ہوتے ہیں شہری کسی دوسرے ملک کا بننا پڑتا ہے''۔ ''آئی ایم سوری''۔ بڑھیا نے صلیب سے کھیلتے ہوئے میرا پاسپورٹ واپس کر دیا اور مؤدبانہ درخواست کی کہ میں سنگل کمرہ چھوڑ کر ڈبل کمرے میں منتقل ہو جاؤں سنگل کمرے کا مالک واپس آ رہا ہے۔ مَیں نے ان کی درخواست مسترد کر دی تو اس نے بخوشی اعلان کیا کہ وہ مجھ سے ڈبل کمرے کا سنگل کرایہ وصول کرے گی۔ شاید اسے ان مجبوروں کے مصائب کا احساس ہونے لگا تھا جنہیں اپنی پیدائش کے ملک کی شہریت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ محترمہ نے گنجے صاحب کو حکم دیا اس نے فوراً میرا سامان سنگل کرایہ میں ڈبل کمرے میں منتقل کر دیا۔ میں نے انگریزی جوڑے کا شکریہ ادا کیا۔ ''انگریز کی ایک صدی کی غلامی کے صدقہ میرا آج کا قیمتی دن بچ گیا اگر انگریزی بھی نہ آتی ہوتی تو معلوم نہیں کتنے ہوٹلوں کے استقبالیہ چھاننا پڑتے''۔ نوجوان کی ہمسفر نوجوان اب تک ہمارے مذاکرات میں یو این او بنی کھڑی تھیں۔ میرے شکریہ پر اس نے بھی مسکراتے ہوئے ''آئی ایم سوری'' کہا۔ اسے کس چیز کا افسوس ہے؟ میری مدد کرنے کا یا میری قوم پر حکومت کرنے کا؟ میرے پوچھنے سے پہلے ہی وہ اپنے کمرے میں جا چھپی۔ ہمارے بعض بھائیوں کو بھی مسلمانوں کے ہندوستان پر حکومت کرنے کا بہت افسوس ہے، وہ برصغیر کی پوری مسلمان قوم کو سمجھاتے رہے کہ اس ''گناہ'' کا کفارہ ادا کرو۔

انگریزوں کے بعد ہندو کی غلامی قبول کر کے باری دو تا کہ ہم سر اٹھا کر چل سکیں لیکن مسلمان ان کی بات نہ مانے۔ انہوں نے اپنا الگ پاکستان بنالیا جس کی وجہ سے انہیں انڈیا میں پیدا ہو کر پاکستان کی شہریت قبول کرنا پڑی۔ نوجوان کچھ مزید کہنا سننا چاہتا تھا لیکن اس کی بیوی دروازہ بند کرنے والی تھی اس نے بھی ''آئی ایم سوری'' کہا اور مسکراتا ہوا چل دیا۔ غرناطہ پر حملہ کے وقت انگریزوں نے فرڈی ننڈ کی فوجی مدد کی تھی۔ فرڈی ننڈ کی جانشین سے میری لڑائی میں انگریز نوجوان نے میری بھرپور زبانی مدد فرمائی۔ تب ان کے دین کا مسئلہ تھا اور اب زبان کا۔

کھڑکی کے حسین چہرے سے بھاری نقاب سرکائی تو جدید غرناطہ قدموں میں آن بچھا۔ مَیں الحمرا اور قدیم غرناطہ تلاش کرنے لگا مگر اس کی کوئی نشانی نا ملی۔ جو عمارتیں رات مصنوعی روشنی میں مغموم سی دکھائی دی تھیں صبح کے نور میں نہائی دھوئی مسکرا رہی تھیں۔ بنک، سٹور، اور جوا خانے بڑی سڑک کے دوسری طرف زندگی بھرپور انداز میں بیدار ہو چکی تھی۔ یہی کچھ دیکھنا ہوتا تو اتنا طویل سفر کیوں کیا؟ لندن اور پیرس کا یہ رُخِ انور غرناطہ سے زیادہ دلفریب تھا۔ نقشہ ہاتھ لیا اور پرانے غرناطہ کی تلاش میں نکل پڑا۔ غرناطہ جو زمانے کی زینت تھا، خواہش نفس جس کے معانی پر شیدا تھی۔

ابن الخطیب کے غرناطہ میں محمد الاحمر کے الحمرا کا راستہ پوچھنا صدیوں پر محیط رشتہ کی توہین تھی میں کامینوڈی رونڈا کی چھاتی روندتا ہوا غرناطہ میں گم ہو گیا مگر قدیم غرناطہ کو میری جدید غرناطہ میں گمشدگی پسند نہ آئی۔ جس سڑک پر چلنا شروع کرتا وہ الحمرا کی سڑک سے جا ملتی یا پھر مجھے ہی ہر سڑک الحمرا کو جاتی محسوس ہوئی۔ میں گلی گلی اور موڑ موڑ کے چہرے کی جھریوں میں نقوشِ رفتہ تلاش کرتا چلا جا رہا تھا کہ ایک خاتون نے دوڑ کر راستہ روک لیا جیسے کبڈی کا مخالف کھلاڑی بھاگ کر سامنے آ جائے۔ وہ زیرلب کبڈی کبڈی کہتی آگے بڑھی۔ مَیں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ فٹ پاتھ چھوڑ کر سڑک کی راہ لی وہ چکر کاٹ کر پھر سامنے آ موجود ہوئی اور دونوں ہاتھوں سے گرفت کرنا چاہی۔ مجھے اپنا قصور سمجھ آیا نہ محترمہ کی جارحیت سبب سمجھ ایک بار پھر پیچھے ہٹ کر میں نے صورتحال اور خاتون کا اچھی طرح جائزہ لیا تو اس کے ہاتھ میں پھول تھے اور وہ اپنے سیاہ ہاتھوں سے میرے سینے پر سُرخ پھول چسپاں کرنا چاہتی تھی۔ جس قوم نے پتھر مار کر نکالا تھا پھول لگا کر

استقبال کر رہی تھی۔ ''خوش آمدید آپ اس صبح الحمرا کی راہ کے پہلے مسافر ہیں''۔ محترمہ نے اپنی آموختہ انگریزی میں مجھے آگاہ فرمایا۔ ''پھولوں کی نگری میں پھول لگا کر جائیں۔ شیروں والے صحن کے فواروں تک خوش بختی آپ کا ساتھ دے گی''

''لیکن مجھے تو اس صحن سے بھی آگے تک جانا ہے''

''صبح سویرے کا آپ کا ایک پسیتہ میری دن بھر کی خوش بختی کا سبب ہوگا'' وہ بدستور میری راہ روکے کھڑی تھی۔

''مجھے تو شیروں والے فوارے سے آگے اپنی خوش بختی کی فکر ہے''۔

اس کا انگریزی کا ذخیرہ ختم ہونے لگا تو پھولوں والی سے مانگنے والی کا رُوپ دھار لیا۔ سڑک پر اور بھی کئی پھول والیوں نے میری راہ روکنے کی کوشش کی لیکن میں کبڈی کے اس کھلاڑی کی مانند ارد گرد دیکھ کر چلنے لگا جو اچانک جٹ جپھے میں نمبر نہ گنوانا چاہتا ہو۔ غرناطہ میں ہم نے اتنا کچھ گنوایا تھا کہ اب ایک پسیتہ گنوانے کی بھی سکت نہ تھی۔ ان کے لئے الحمرا کیا کم ہے جس کی بدولت یہ روزانہ ہزاروں لاکھوں پسیتے کماتے ہیں۔ ہوٹل مالکان سیاحتی اداروں اور دکانداروں اور زرمبادلہ کا کاروبار کرنے والوں کی لوٹ کھسوٹ کے بازار سے میں ابوعبداللہ کے مرقد حمیت کے لئے چار پھول نہ بھی خریدوں تو کیا فرق پڑے گا؟ میں تو یادوں کی خاردار وادی میں داخل ہونے جاتا ہوں۔ کانٹوں بھری راہوں پر گل بدست چلنے سے روح کے زخم ہی جل نہ اٹھیں۔ سوچ کی ایک لہر نے مجھے دوسری کے سپرد کر دیا۔

نیلے آسمان سے صبح روشن کی کرنوں کی بارش میں بھی الحمرا کی سڑک کا جسم نیم مُردہ تھا، دستکاریوں کی دکانوں کے سامنے گاہکوں کی منتظر خواتین بار بار اپنے بال درست کر رہی تھیں۔ ہوا کے آوارہ جھونکے ایک ایک پیشانی پر مہر ثبت کرتے اور اڑ جاتے۔

بھاری قدموں کی آواز سے ماحول میں ارتعاش پیدا ہونے لگا۔ آنکھ کے پردۂ تصور پر ایک شہسوار کی تصویر نمودار ہوئی۔ مردانہ وجاہت شاہانہ شباہت عربی ناز اندلسی نیاز محمد الاحمر کا جلوس خشک جبل سبیقہ کی طرف رواں تھا۔ عالم، فاضل، فقیہہ، شاعر، مدبر، سردار، سب ہی ساتھ چلے جا رہے تھے۔ مَیں ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ نہ معلوم یہ لوگ کہاں کہاں سے چل کر آئے ہیں

کتنی صدیوں سے اس منزل کی تلاش میں تھے۔ مدینۃ النبیؐ میں آفتابِ نبوت غروب ہوا تو حضرت سعد بن عبادہؓ پر کپکپی طاری ہوگئی۔ انصار و مہاجر میں خلافت کی بات چلی۔ غزواتِ رسولؐ میں پیغمبر کے جانثار سپاہی نے فرمانِ رسولؐ پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ صدیوں پیشتر جب جانثار رسولؐ سعد بن عبادہؓ مدینہ سے سفرِ شام پر نکلے تھے تو کسے معلوم تھا کہ ایک دن ان کی آل سمندر پار کے اس دور دیس میں مقام امارت حاصل کرے گی اور غرناطہ میں ویران جبل سبیقہ کو باغ عدن میں بدل دے گی۔

زوالِ سلطنت اندلس سے بنونصر کے عروج کا سورج طلوع ہوا تو ارجونہ کا گمنام کاشتکار محمد الاحمر غرناطہ کا والی بن گیا۔ محمد الاحمر غرناطہ میں فاتحانہ داخل ہوا تو مسجدوں میں مغرب کی اذان بلند ہو رہی تھی، اس نے قصر کی بجائے گھوڑے کی لگام مسجد کی طرف موڑ دی۔ مسجد سے جو تعلق مدینۃ النبیؐ میں قائم ہوا تھا فتح غرناطہ کی خوشی بھی اسے کمزور نہ کر سکی۔ مدینے کے آسمان کا ٹوٹا ہوا تارا فلک غرناطہ پر اتنا چمکا کہ آفتاب اس منزل میں قدم رکھتا تو زرد رنگ ہو جاتا۔ میں جلوس کی گردِ راہ کا دامن تھامے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو جبل سبیقہ سرسبز و سرشجر ملی پھر الاحمر کا جلوس، عالم، فاضل، فقیہہ، مفسر، اہلِ فلسفہ و شعر سب ہی اس جنگل میں کہیں گم ہو گئے۔ وہ سب راستہ بھول گئے یا میں کسی اور راہ پر نکل گیا؟ سب راہوں میں تلاش کیا مگر ہر کہیں ان کے گھوڑوں کے قدموں کے نشان ہی نظر آئے۔ وہ کہاں گئے؟ میں یہی سوچتا جنگل میں لیٹی ایک سرد خو سڑک پر چلنے لگا۔ جیسے جیسے سڑک اوپر اُٹھ رہی تھی، اشجار کا سایہ گھنا ہوتا جا رہا تھا سورج کی نوکیلی کرنوں کے سامنے پتوں نے اس کثرت سے اپنے سینے تان دیئے کہ ایک بھی تیر زمین تک نہ پہنچ پاتا تھا۔ پتوں میں پوشیدہ پرندوں نے نغمہ بہار شروع کیا تو قلبِ سبیقہ سے آہوں کا دھواں اُٹھنے لگا۔ ایک سبز پتہ شاخ سے ٹوٹ کر میرے سر پر آ رہا اور اسی تیزی سے سڑک کے ساتھ بہتی نالی کے شفاف پانی میں غوطہ زن ہو گیا۔ میں پکڑنے کو آگے بڑھا تو اس نے بہت نیچے جا کر سر نکالا اور بہتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ نالی میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں گول دائروں میں ناچ رہی تھیں اس دیوانگی میں وہ پتھروں سے سر ٹکراتیں تو محسوس ہوتا شدتِ غم سے نڈھال ہیں۔ نہ معلوم تیز لہریں انہیں کس بلندی سے بہا لائی ہیں۔ سفرِ تنزل میں ان کنکریوں نے کتنے پتھروں کے قدموں میں سر رکھ کر تحفظ کی درخواست

کی ہے۔ کس کس سنگِ گراں کے آستانے پر ناچ ناچ کر امداد طلب کی ہے۔ اندرونی کمزوری اور بیرونی دباؤ سے جب کوئی کوہِ گراں کنکر کنکر ہوتا ہے تو چھوٹی چھوٹی نالیوں میں اُٹھنے والی لہروں کے سامنے بھی اپنا وجود نہیں جما سکتا۔ کوہ اور کنکر کا المیہ دیکھتا میں ویران سڑک پر قدم قدم آگے بڑھتا رہا۔ ایک دو سائیکل سوار آئے اور تیزی سے پیچھے نکل گئے۔ گھوڑوں کے قدموں کے نشان ہر راہ پر ملے۔ اونچے درختوں کے زیرِ سایہ گھنے جھاڑ بوٹ کی وجہ سے میں سڑک کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ کنکریوں کا شور زنجیروں کی جھنکار میں بدلنے لگا پرندوں نے نغمہ جدائی شروع کیا تو شفاف پانی میں خون کی دھاریاں نمودار ہو گئیں۔ ہوٹل ایرونگ سے آگے ایک عمارت کی پیشانی پر بورڈ روشن تھا ''اس کمرے میں واشنگٹن ایرونگ نے اتنے سال قیام کیا''۔ واشنگٹن ایرونگ الحمرا کی کہانیاں لکھ کر زندہ جاوید ہو گیا۔ مسلمان الحمرا کی تعمیر کا معجزہ الحمرا کی کہانیوں میں دم توڑ گئے۔ جس نے الحمرا والوں پر ایک کتاب لکھی۔ اہلِ غرناطہ اور اہلِ سپین اس کے شکر گزار ہیں۔ غرناطہ کے عجائب گھر میں اس کا ایک خاص شعبہ ہے، اس کے نام پر چوک ہیں، جنہوں نے الحمرا تعمیر کیا۔ صدیوں یورپ کے اندھیروں میں علم کا نور پھیلایا، فکر و دانائی بانٹی، اس شہر اور ملک میں ہزاروں لاکھوں کتب لکھیں ان کے احسانات کا نہ اندلس کو اعتراف ہے نہ یورپ کو۔ اس لئے تو نہیں کہ واشنگٹن ایرونگ اہلِ سپین کا ہم مذہب تھا؟ اس لئے تو نہیں کہ اس کی قوم زندہ ہے؟

جبلِ سبیقہ پر آباد بلدِ الحمرا کی باقیات قصرِ الحمرا اور القصبہ تک پہنچنے کا ایک مختصر راستہ بھی ہے لیکن میں کھنڈروں اور ویرانوں میں گھوم پھر کر اپنے آپ کو آل الاحمر کے زوال کے صدمہ کے مقابلہ کے لئے تیار کر رہا تھا۔ الحمرا سینہ جبل پر ایستادہ مکمل شہر خلافت تھا جس طرح قرطبہ میں مدینۃ الزہرا شہر خلافت ہوا کرتا تھا اس شہر کے کھنڈرات کے ایک کونے میں صرف قصرِ شاہی کا کچھ حصہ نشانِ عبرت کے طور پر باقی رہ گیا ہے۔ القصبہ جو شہرِ خلافت سے ملحق مستحکم فوجی قلعہ تھا اس کے دیوار و مینار باقی ہیں اور اس عظیم الجثہ برج کو خاص طور پر محفوظ کیا گیا ہے جس پر سقوطِ غرناطہ کے بعد رو پہلی صلیب نصب کر کے جشنِ فتح کا آغاز کیا گیا تھا۔ جبلِ سبیقہ پر چلتے ہوئے آنکھ اتنے حسین اور غمگین مناظر سے آشنا ہوتی ہے کہ غمِ زوال اور حزن و ملال میں ڈوبا انسان اس کی وسعت کا اندازہ نہیں کر پاتا۔ پچاس ہزار آبادی کے شہر امارت الحمرا کے ویرانوں پر سکوتِ مرگ کا سماں تھا۔

سینۂ سنگ میں شریانوں کی مانند پھیلے جستی پائپوں سے تیز لہریں سر ٹکرا ٹکرا کر جانے والوں کا ماتم کرنے لگیں۔ شاعر نے کہا ''خاور سے باختر تک جن کے نشان تھے بر پا اب مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں'' لیکن اندلس کے طول و عرض میں ان کی ایسی کوئی نشانی بھی باقی نہیں۔ مدینۃ الزہرا سے الحمرا تک میں صرف بہتے پانی ہی ان کی یاد میں روتے ملے۔ اس ملک میں ان کی یاد کچھ عمارتیں ہیں کچھ کہانیاں ہیں اور کچھ گیت۔ مسلمان زمینِ اُندلس پر اترے تو اجنبی تھے یہاں ٹکے تو دمساز و ہمراز بن گئے۔ انہوں نے اس دھرتی کو نیا حسن اور آہنگ دیا۔ دنیا کی بہترین تہذیب سے آشنا کیا۔ فکر و فن خون، پانی کیا کیا نہ دیا۔ اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کے لازوال نقوش اس خلوص اور یقین سے ثبت کئے کہ سرزمین اُندلس سربلند ہوگئی لیکن وہ خود کہاں ہیں؟ وہ اندلسی مسلمان جو آٹھ صدیاں اس زمین پر حکومت کرتے رہے، وہ جو جہانگیر و جہاندار و جہاں بان و جہاں آراء تھے، اس زمین سے نکلے تو کہاں گئے؟ ایک پوری قوم جو ترقی و تہذیب کی سب سے بلند چوٹی پر تھی اسے کیا ہوا؟ دنیا کی سب سے توانا قوم کا دنیا میں سب سے عبرتناک انجام؟ فلک نے نزولِ آدم سے آج تک کسی دھرتی کے سینے سے کسی قوم کو اس طرح بے نشان نہیں کیا جس طرح قرطبہ، اشبیلیہ اور غرناطہ کی مالک جامع قرطبہ مدینۃ الزہرا اور الحمراء کی خالق قوم بے نشان ہوئی۔

مدینۃ الحمراء کے باب الشریعۃ کے سامنے سیاحوں کا ہجوم ہو چکا تھا۔ خوش پوش نوجوانوں کی ٹولیاں بگل بجا بجا کر اپنے ورود کا احساس دلانے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ پاپ کارن اور آئس کریم کی ریڑھیوں پر بچے اپنی اپنی باری کے منتظر کھڑے تھے اور میں چاہتوں کی منزل پر پہنچ کر چاہتوں سے محروم ہو گیا تھا۔ میرے سامنے قلعۃ القصبہ کا عظیم الشان برج صلیب پر لٹک رہا تھا، اس دانا تر توانا تر قوم کی حماقتوں کی سزا بھگت رہا تھا جو صدیوں اس کی محافظ رہی تھی۔ میرے پاس کھڑا ایک سیاح اپنے ساتھی کو مسلمانوں کے قلعہ کے اس نگران برج کی چوٹی پر لٹکتے گھڑیال کے خواص سے آگاہ فرما رہا تھا۔ ''یہ گھڑیال مسلمانوں کے دور میں اہلِ شہر اور اہلِ مدینہ کو خطرات سے آگاہ کرنے کے وقت بجایا جاتا تھا۔ مگر یہ اب ویگا کے نظامِ آبپاشی کو کنٹرول کرتا ہے اور یہ گھڑیال بجا کر پانی کی باری بدلی جاتی ہے۔ ہر سال دو جنوری کو یومِ فتح پر غرناطہ کی کنواریاں پورے خلوص

سے یہ گھڑیال بجا کر مسلمانوں کے اخراج اور صلیب کی فتح پر اظہارِ مسرت کرتی ہیں۔ اس کے صلہ میں آئندہ دو جنوری سے پہلے پہلے ان کی شادیاں ہو جاتی ہیں''۔ سورج کی شعائیں واچ ٹاور کی چوٹی کو چوم رہی تھیں۔ وزنی گھڑیال کنوارے ہاتھوں کے انتظار میں ساکت و جامد تھا لیکن پورا برج اس سنہری صلیب سے لٹک رہا تھا جو قبضہ غرناطہ کے بعد شہر اور مدینۃ الحمرا کو بپتسمہ دینے کے لئے اس برج پر چڑھائی گئی تھی جب بھی کوئی نصرانی فوج غرناطہ پر چڑھائی کرتی تھی تو اس کے آگے آگے پادریوں اور اہلِ کلیسا کی فوج ایک وزنی صلیب اُٹھائے ہوئے چلتی تھی آج بھی غرناطہ پر قبضہ کی کہانی سناتے وقت گائیڈ یہ محاورہ ضرور بیان کرتے ہیں کہ ''شہر کے ایک دروازے سے صلیب اندر آ رہی تھی اور دوسرے دروازے سے قرآن باہر جا رہا تھا''۔

قرآن کا خروج؟ باب الشریعہ کے چہرے کے زخم رسنے لگے۔ اس جگہ صدیوں تک فقیہہ قرآن و حدیث پر غور و فکر کرتے رہے۔ دینی اور دنیاوی مسائل رُوحِ قرآن کے مطابق حل کرنے کے لئے موشگافیاں ہوتی رہیں۔ زوالِ قرطبہ کے بعد فکرِ قرآن کا سب سے بڑا مرکز غرناطہ کا باب الشریعہ بنا اور پھر اس باب سے بھی مسلمان اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے قرآن نکلے۔ الحمرا کے ہر سیاح کو اس خستہ حال دروازے سے ہو کر گزرنا ہوتا ہے یوسف نجاج کے تعمیر کردہ اس دروازے کی سُرخ اینٹ اور چُونا کا ربط باہمی زوال پذیر ہے۔ اس کے حسین چہرے پر چیچک کے گہرے گھاؤ اُبھر آئے ہیں۔ باب الشریعہ کی محراب پر ایک پنجہ بنا ہے۔ کھُلے پنجہ کی انگلیاں آسمان کی طرف اُٹھی ہیں۔ طاق محراب پر پنجہ کی کلائی کی سیدھ میں کنجی کی تصویر بنی ہے۔ پنجہ اور کنجی اب بھی قائم ہیں۔ اُندلسی مؤرخوں اور گائیڈوں نے پنجہ و کلید سے عجیب و غریب کہانیاں وابستہ کر رکھی ہیں۔ ان سے طلسماتی قوت وابستہ کر دی ہے۔ ان کے مطابق یہ دروازہ، محراب، اس پر بنا پنجہ، طاق و محراب پر بنی کنجی اور اس سے آگے قلعہ و محل ایک سربستہ راز ہیں۔ جب محراب پر بنا پنجہ طاق کی کنجی تک پہنچ جائے گا تب ہی یہ سب راز کھُل سکے گا اور دروازے کے نیچے پہاڑی کے پیٹ میں بنے عظیم الشان محل میں صدیوں سے روپوش علومِ سلیمانی کا ماہر ابن ابوایوب عیسائی مغنیہ اور رقاصاؤں کے ساتھ باہر آ جائے گا۔ رات کے اندھیرے میں اس طرف سے گزرنے والے ضعیف العقیدہ عیسائی اکثر ابن ابوایوب کی قید میں اپنی ہم مذہب دوشیزاؤں کے نغمے اور ان کے

پاؤں کے گھنگروؤں کی آوازیں سُن لیتے ہیں۔نوجوان خواتین کے جذبۂ تجسس کو مہمیز لگانے کے لئے گائیڈ انہیں اس دروازے کی دراڑوں سے کان لگا کر اٹینشن کر دیتے ہیں اور اکثر خواتین بھی زیرِ پہاڑ سے رقص ونغمہ کی آواز سُن لیتی ہیں۔کیا واقعی یہ کنجی کلید سلطنت ہے؟ مَیں دوسری رائے پر غور کرنے لگا اور یہ ''کلید اس کے پاس رہے گی جو پانچ ارکان اسلام پر پورا پورا عامل ہوگا''۔ جانے والے سلطنت اور کلید سلطنت سے محروم ہو گئے اس لئے کہ انہوں نے ارکانِ اسلام پر عمل ترک کر دیا تھا؟ سیّاح گزرتے رہے میں باب الشریعۃ کے زیرِ سایہ کھڑا ان نظریات وروایات پر غور کرتا رہا۔باب الشریعۃ کا امور سلطنت سے زیادہ رموز قرآن وشریعت سے تعلق تھا اس کے زیرِ سایہ بیٹھنے والے امورِ سلطنت کم چلاتے تھے اور قرآن وسُنت پر زیادہ غور وفکر کرتے تھے۔قرآن کی روشنی میں عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش کرتے تھے۔کیا اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ قرآن وشریعت فہمی کی چابی کو ہاتھ لگانے والوں کے لئے سب سے پہلے پانچ ارکانِ اسلام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا لازم ہے جو دِل اور دماغ سے ارکان اسلام قبول نہیں کرتا وہ نہ رُوح قرآن تک رسائی حاصل کر سکتا ہے نہ فہمِ شریعت کے مقام تک پہنچ سکتا ہے۔شک اور ایمان ایک جگہ اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

فرڈی ننڈ اور اس کے درباریوں نے سلطنت اسلامی کے خاتمہ پر الحمرا کی جامع مسجد کو بپتسمہ دے کر اسی جگہ اجتماعی سجدہ شکر ادا کیا تھا۔اسی جگہ اہلِ کلیسا نے سجدہ فتح کے بعد پوپ کے لئے مبارکباد کا پیغام تیار کیا تھا کہ انہوں نے غرناطہ فتح کر کے مسلمانوں کے قسطنطنیہ پر قبضہ کا بدلہ چکا دیا ہے۔فرڈیننڈ نے یورپ کے دیگر ممالک کے امدادی دستوں کے کمانڈروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا ''آج میں نے مسلمانوں کے ہاتھوں راڈرک کی شکست کا انتقام لے لیا ہے''۔گائیڈ اپنی بھیڑوں کو بتا رہا تھا کہ القصبہ کے برج پر صلیب کی سواری کی خبر سُن کر رُوم ولندن کے گرجوں میں خصوصی دعائیں مانگی گئی تھیں۔

دسمبر ۱۹۷۱ء میں بھارت کی وزیرِاعظم اندرا گاندھی نے سقوطِ ڈھاکہ پر اپنی قوم سے کہا تھا کہ انہوں نے مسلمانوں سے ہزار سالہ شکستوں کا بدلہ لے لیا ہے۔ہم کب تک اپنے اجداد کی فتوحات کا بدلہ چکاتے رہیں گے؟ سقوطِ غرناطہ اور سقوطِ ڈھاکہ میں اور کون کون سی قدر مشترک

ہے؟ سقوطِ غرناطہ ہوسِ اقتدار کی خانہ جنگی سے ہوا۔ابوعبداللہ نے ہوسِ اقتدار میں اپنے ملک وقوم کے دشمن سے دوستی کر لی تو عیسائیوں کا سینکڑے سال پرانا خواب پورا ہو گیا۔سقوطِ ڈھاکہ بھی ہوسِ اقتدار کے مریضوں کی دشمن دین وملّت سے دوستی کی بدولت دیکھنا پڑا اور ہندوؤں کا ہزاروں سال پرانا خواب پورا ہو گیا۔

دو جنوری ۱۴۹۲ء، سقوطِ غرناطہ اور سولہ دسمبر ۱۹۷۱ء سقوطِ ڈھاکہ چار سو اسی سال کے بعد بھی ہمارے ہاں ابوعبداللہ ہی کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ کسی اور قوم نے مسلمانوں جتنے ابوعبداللہ کیوں پیدا نہیں کئے؟

غرناطہ کے آخری امیرِ آہن ابوالحسن جب عیسائیوں کے ساتھ زندگی اور موت کی جنگ میں مصروف تھے تو ان پر اسی الحمرا کے اندر سے حملہ کیا گیا۔ابوعبداللہ کی ماں ملکہ غرناطہ اپنے بیٹے کے اقتدار کی سازش تیار کرنے لگی تو دلگیر باپ نے اپنے ہونہار بروا کو اس نگران برج کے زیرِ سایہ برجِ اسلحہ میں نظر بند کر دیا۔نگران برج کی بلندی سے برجِ اسلحہ کی طرف نظر گئی تو ابوعبداللہ رسے کی مدد سے قلعہ کی دیوار اتر رہا تھا۔سنگلاخ دیوار کے نیچے ایک تیز رفتار گھوڑ سوار دستہ منتظر تھا وہ نوجوان ابوعبداللہ کو لے کر البسین کی تنگ وتاریک گلیوں میں گم ہو گئے۔برج کی دیوار سے چمٹی ملکہ غرناطہ اپنے ہونہار بیٹے کو جاتا دیکھ کر خوش ہو رہی تھی اسی خوشی میں اس کے سر سے دوپٹہ اُڑ گیا۔وہ ننگے سر کھڑی دُور جاتے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنتی رہی۔عیسائی گائیڈ سیاحوں کو بتا رہا تھا کہ ملکہ غرناطہ نے اپنے سر کے دوپٹہ کا رسا بنا کر اپنے بیٹے کو بلندی سے وادی کی پستی میں اتار دیا تھا۔ مائیں اپنے سر کے دوپٹہ کی مدد سے اپنے بیٹوں کو بلندی سے ذلت کی پستی میں اتار سکتی ہیں؟ ملکہ غرناطہ سر پر اتنا بھاری دوپٹہ رکھتی تھی کہ اس کا سینکڑے فٹ لمبا اتنا مضبوط رسہ بن جائے کہ ایک نوجوان اس کے سہارے پتھریلی چٹان پر کھڑی قلعہ کی سنگین دیوار اتر جائے؟ جن ماؤں کے سروں پر اتنا وزنی دوپٹہ ہو وہ اپنے بیٹوں کو ایسے ذلت اور رُسوائی کے سفر پر روانہ کر سکتی ہیں؟ ان کے دودھ میں بے حمیتی اور بے غیرتی کے جراثیم ہو سکتے ہیں؟ قلعہ کی دیواروں سے ہر طرف غرناطہ ہی غرناطہ دکھائی دے رہا تھا۔دُور مغربی سلسلہ کوہ پر اس کے محافظ مضبوط قلعے اور برج مستعد کھڑے تھے۔ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں چلتے چلتے لوگ رُک جاتے ابوعبداللہ کا فرار اس روز کی داستانِ غم تھی۔

اسی داستان کا آخری باب مسلمانانِ اندلس کی داستان زوال پر ختم ہوا۔ جس سے آگے گائیڈوں کی داستانیں شروع ہو جاتی ہیں، فرڈی ننڈ اور ازابیلہ کا دور شروع ہو جاتا ہے جنہیں ابھی ابھی میں جامع الحمرا میں سجدۂ فتح غرناطہ کرتے چھوڑ آیا تھا۔ سیاحوں کی ٹولی میں شامل دو نوجوان لڑکیاں تیزی سے وزنی گھڑیال کی طرف بڑھیں۔ ''آج تیرہ مئی ہے دو جنوری نہیں''۔ گائیڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دو جنوری کو آناپوتر مریم سال ختم ہونے سے پہلے تمہیں خاوند عطا کر دیں گی''۔ لڑکیوں نے مشترکہ قہقہہ لگایا۔ ایک ایک خاوند تو ہمارے پاس پہلے موجود ہے''۔ انہوں نے پاس کھڑے دو نوجوان سیاحوں کی طرف اشارہ کیا۔ نوجوانوں کی آنکھوں کی چمک اور لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر گائیڈ نے نئی کہانی چھیڑ دی۔

اندلس کی دو خواتین ملکہ قشتالہ اور ملکہ غرناطہ ایک یسوع مسیح کی بندی دوسری ہوس کی بندی۔ ایک مرحلہ پر فرڈی ننڈ نے اہلِ غرناطہ کی جانفروشی دیکھ کر محاصرہ اٹھانے کا فیصلہ کرنا چاہا تھا کہ مزید تیاری کر کے نئے سرے سے حملہ کیا جائے تو ملکہ قشتالہ ازابیلہ نے یہ فیصلہ مسترد کر دیا تھا وہ مکمل فتح تک فوجی کیمپ میں عبادت میں مصروف رہی تھی۔ عیسائی مؤرخ فرڈی ننڈ کی دانائی، صلاحیت اور سازش اور اس کی ملکہ ازابیلہ کی دینداری کو صلیب کی ہلال پر فتح کے اسباب بتاتے ہیں۔ ملکہ غرناطہ کی ہوس اقتدار اور بے حمیتی کو سقوطِ غرناطہ کا سبب قرار دیتے ہیں۔ اس طرح زوال غرناطہ کی کہانی دو خواتین کی کہانی ہے۔ ایک نے دوسری کے خواب پورے کئے دوسری نے پہلی سے خواب چھین لئے۔ ایک نے اپنی قوم اور مذہب کا سرنگوں کیا دوسری نے اپنی قوم اور مذہب کا سر بلند کیا۔ ایک نے اپنے خاوند کی کامیابی کی راہ مسمار کی دوسری نے اپنے خاوند کی کامیابی کی راہ ہموار کی۔ برج اسلحہ میں کھڑی ملکہ غرناطہ دور کہیں فضا میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ وہاں جہاں مغربی پہاڑوں پر نگران برج مستعد کھڑے تھے۔ برج اسلحہ میں خوبصورت نقش و نگار ہوتے تھے۔ گائیڈ ان نقوش کی نفاست پر لیکچر دے رہا تھا۔ مَیں نے آگے بڑھ کر دیکھا ملکہ غرناطہ کے علاوہ مجھے وہاں کچھ دکھائی نہ دیا۔ برج اسلحہ زیر زمین راستوں کے ذریعے الحمرا کے شاہی محل سے وابستہ بتایا جاتا ہے۔ مَیں نے بہت تلاش کیا کوئی راستہ نہ ملا۔ ''ملکہ محل میں کس راستہ سے گئی تھی؟'' ''مجھے اس راہ کا علم ہے جس سے وہ محل سے ہمیشہ کے لئے خارج ہوئی تھی اگر آپ میری فیس ادا کر کے میرے

گروپ میں شامل ہو جائیں تو مَیں وہ راہ آپ کو دکھا سکتا ہوں''۔ ایک دو سیاحوں نے میرے اعتراضات اور سوالات سے متاثر ہو کر ساتھ ساتھ چلنے کا مشورہ دیا مگر میں الحمرا اور اس کے آثار کانوں کی بجائے آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ قلعہ سے مسکن امیر کا راستہ چارلس پنجم کے محل کی دیواروں کے پاس سے گزرتا ہے۔ سپین جدید کے ماہرین اس محل کو اس دور کے یورپ کا سب سے حسین محل قرار دیتے ہیں۔ اس کے در و دیوار سے چارلس پنجم اور اس کی قوت و جبروت ٹپکتی بتائی جاتی ہے۔ مسکن امیر میں داخلہ کی عمارات گروا کر بنائے گئے اس محل کی جبریت کے باوجود سیاح الحمرا کی باقیات کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ میری آہستہ روی سے بعض کو میری صحت و سلامتی پر شبہ ہوا اور وہ رحم اور ہمدردی سے دیکھتے ہوئے آگے نکل گئے کسی کے پاس کسی سے اس کا دکھ درد پوچھنے کا وقت نہ تھا۔ الحمرا کی مقناطیسی کشش سیاحوں کو کچے لوہے کی مانند کھینچ رہی تھی جو کشش مجھے ہزاروں میل سے کھینچ لائی تھی درِ الحمرا پر دم توڑ گئی۔ محلات کے دروازے پر کھنڈرات کی کشش میں اضافہ ہو گیا۔ پھر بھی چلنے والوں کے ہم قدم چلتا ہوا الحمرا کے دارالمشورہ کی راہ قصر امارت میں داخل ہوا۔ دارالمشورہ کے در و دیوار پر فراستِ مشورہ کی بجائے زوال فراست کے نشانات زیادہ گہرے تھے۔ امیر مملکت دانایان غرناطہ عالمان اندلس سے امور سلطنت میں اسی جگہ مشورہ کرتا تھا۔ اس سے ملحق جامع الحمرا بنی کہ دین و دنیا میں دوری محسوس نہ ہو، اہلِ دین و دنیا کے مشورے دین اور دُنیا کو تباہ کر چکے تو سجدہ فتح کرنے والوں کی اتنی کثرت تھی کہ صحن مسجد سے ایوان دارالمشورہ تک سر ہی سر تھے۔ ضروریات سیاحت کے تحت اب جامع الحمرا پر سے بھی صلیب کا بوجھ کم کیا جا رہا ہے۔ مَیں ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ دربار غرناطہ کے اہل مشاورت کی دانش و فکر کے انداز رفتہ کے آثار ڈھونڈنے لگا۔

دانش جو صدیوں حکمران رہی فکر جس نے صدیوں کی حکمرانی گنوائی ایک دانشمند قوم مٹا دی، صحنِ حنا، دیوان خاص، قصرِ سلطانہ، ایوان بنوسراج، شاہی حمام، شیروں کا صحن ایسے معلوم ہوتا تھا سب دیکھے بھالے ہیں۔ چند ہی منٹ میں قصرِ امارت ختم ہو گیا۔ شہر امارت کے کھنڈرات پھر سامنے آ گئے۔ ٹوٹی پھوٹی دیواریں، خستہ حال بنیادیں، کھنڈرات میں ہر طرف پھولوں کی کیاریاں اور پھولدار جھاڑیاں۔ ماضی کی مہک پر لحد ماضی پر کھلے ان پھولوں کی خوشبو غالب آنے لگی تو میں

باب الحدید سے ہو کر الحمرا کے مقدر کی ٹوٹی پھوٹی لکیر فصیل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا جس نے صدیوں محلوں کی نگرانی کی تھی اور اب صدیوں سے کھنڈرات کی محافظ ہے۔ محل رہیں یا کھنڈر بنیں وہ فصیل ہر حال میں اپنا فرض پورا کرتی آئی ہے۔ برج الابلیس سے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو میرے اور ابلیس کے علاوہ کہیں کوئی فرد بشر نہیں تھا۔ بہت پیچھے جھاڑیوں کے درمیان محکمہ سیاحت کے کھوکھے میں بیٹھی سنوریا ابھی تک گاہکوں کے انتظار کی گھڑیاں ناول پڑھ پڑھ گن رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا میں پھول اور جھاڑیاں آپس میں بغلگیر ہو رہے تھے۔ برج الابلیس کی کھڑکی سے نیچے دامن فصیل تک پہاڑی کی ڈھلوان پر گھنے سرسبز درخت مستی میں جھوم رہے تھے۔ جن پرندوں نے جبلِ سبیقہ پر نغمہ بہار گا کر مجھے خوش آمدید کہا تھا شاخوں میں کہیں چھپ گئے تھے۔ دانش حکماء کے ایوان سے برج ابلیس تک کے سفر میں ایک ہی سوال پیدا ہوتا رہا۔ سقوطِ الحمرا کا سبب زوالِ دانش تھا یا دانشِ زوال؟ زوال کی دانش میں ایمان کمزور ہوتا ہے، دانشِ زوال میں عمل کا پلڑا اُٹھ جاتا ہے۔

یقین محکم عملِ پیہم کی منزل میں عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے تھے۔ عروج دانشِ اندلس کے مرحلہ میں زوالِ آدم خاکی پہ انجم سہمے جاتے تھے۔ اسے برج ابلیس کیوں کہتے ہیں؟ اس کی گولائی پر تو آیات وکلمات مقدسہ نقش ہیں۔ الحمرا کے قصّے کہانیاں تخلیق کرنے والوں نے محل و مینار کے نام اپنے قصوں کے کرداروں اور ان کے رول پر رکھ دیئے ہیں تاکہ ان کی واقعاتی حیثیت پختہ ہو جائے اور وہ قصے کہانیاں ایسے پختہ تر ہو گئے ہیں کہ افسانوی نام ہی تاریخ بن گئے ورنہ ان ایوانوں اور مقاموں کے وہ نام کبھی نہ تھے جو آج کتابوں اور گائیڈوں کی کہانیوں میں ملتے ہیں۔ مسجد الحمرا کے عام دیوانوں کی نسبت سے ذرا اونچے فرش کے پاس ایک گائیڈ آموختہ اگل رہا تھا ''مسلمان اپنے پیغمبر کے بت کے سامنے سجدہ کرتے ہیں یہ فرش باقی سطحوں سے اسی لئے اونچا رکھا گیا تھا وہ اس پر بت رکھتے تھے تاکہ نیچے فرش پر کھڑے سجدہ کرنے والوں کو زیادہ جھکنا نہ پڑے''۔ کہانیاں سُن سُن کر تنگ آ گیا تو آدابِ سیاحت کا لبادہ اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ ''مسلمان نہ بت پوجتے ہیں نہ اپنے پیغمبر کو سجدہ کرتے ہیں۔ لیکچر دینے سے پہلے آپ کو کچھ پڑھ لینا چاہئے تھا''۔ گائیڈ نے اس دخل در نامعقولات پر سُرخ رنگ نظروں سے گھورا پاس کھڑے سیّاح نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''اگر کسی جگہ ایک ہزار گائیڈ ہوں تو وہ ایک ہی واقعہ اور

مقام کے بارے میں ایک ہزار مختلف کہانیاں تخلیق کرتے ہیں آپ کس کس کی تردید کریں گے۔ جھوٹ کی تردید دنیا میں سب سے مشکل کام ہے'' وہ میرا بازو تھام کر آگے چل دیا۔ ''آپ کہاں سے آئے ہیں؟'' شاید مجھے ٹھنڈا کرنے کے لئے پوچھا۔

''پاکستان سے''

''پاکستان سے؟ اتنی دُور سے آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟''

''مَیں یہاں موسیٰ سے ملنے آیا ہوں۔''

''وہ کون ہے؟''

''میرے قبیلہ کا ایک آدمی ہے۔''

''آپ کا قبیلہ اتنی دُور تک پھیلا ہے۔'' سیاح کی ہمسفر نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں'' میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

''کہاں رہتا ہے موسیٰ۔''

''اس جنگل میں'' میں نے جنت العریف کے پہلو میں سرکوہ ایستادہ درختوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

''جنگل میں؟'' خاتون نے اور بھی قریب سے سرگوشی میں سوال کیا جیسے باقی سیاحوں سے یہ راز چھپا کر رکھنا چاہتی ہو۔

''ہاں اسی جنگل میں جب شام کا اندھیرا پھیلنا شروع ہوتا ہے تو وہ جنگل سے نیچے وادی میں اُتر آتا ہے اور پھر باب الجدور سے مدینۃ الحمرا میں داخل ہو جاتا ہے۔ شہرِ خاموشاں کے باسیوں سے ملتا ہوا ادھر آ جاتا ہے۔ عشاء کی نماز اسی چبوترے پر پڑھتا ہے جہاں وہ گائیڈ لیکچر دے رہا تھا۔ رات بھر اس محل میں گزارتا ہے اور صبح کی نماز کے بعد واپس جنگل میں چلا جاتا ہے۔''

''ایرونگ نے تو اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا''۔ خاتون پریشان دکھائی دیتی تھی۔

''ایرونگ نے تو مردوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ موسیٰ تو زندہ ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے وہ مور نہیں۔''

''مور ہے۔''

خاتون کو حیران دیکھ کر سیّاحوں کی ایک اور ٹولی کان لگا کر کھڑی ہوگئی۔ موسیٰ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خاموش کر دیا۔

سیّاحوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی، تختِ گاہِ امیر میں میم سے صاحب ٹکرا رہا تھا۔ کندھے پر ہاتھ کا بوجھ بڑھنے لگا۔ مُڑ کر دیکھا تو ایک آشنا صورت نوجوان خاموش کھڑا تھا۔ یہ میرے کندھے کا سہارا لے رہا ہے یا میرے دل کو سہارا دینا چاہتا ہے؟

''آپ کہاں؟''

''اور آپ کیسے؟''

اس نے اپنے نوجوان ساتھی کا تعارف کروایا جو ایک عرب ملک کے ٹیلیوژن کے لئے الحمرا کے در و دیوار کی فلم بندی کرنے آیا تھا۔

''تیل کے لئے ہی نہیں آپ کبھی تعمیر کے لئے بھی مشہور تھے۔ یہ عرب دستاویزی ثبوت سے اپنے ہم وطنوں پر ثابت کرنا چاہتا ہے۔''

''سلطنتِ عثمانیہ سے پہلے بھی تم نے نسلی تعصب سے ایک عظیم الشان سلطنت تباہ کی تھی یہ انہیں یہ نہیں بتانا چاہتا؟''

اُس نے ٹھنڈی آہ کھینچی ''کاش یہ آپ کی بات سمجھتا ہوتا۔''

''آپ سمجھا دیں اسے۔''

''جنہیں زمانہ کچھ نہ سمجھ سکا وہ میری بات کب سمجھتے ہیں۔''

عرب نوجوان نے اہلاً وسہلاً سے اپنے اجداد کے محل میں خوش آمدید کہا۔ مَیں نے ''مرحبا'' کہہ کر اجازت چاہی۔

سُورج کی شعاعیں ایک سواسی درجہ کے زاویہ سے ایوانوں اور دالانوں کو منور کرنے لگی تھیں۔ محرابوں اور دروازوں میں بنے صدیوں پرانے شہد کے آرائشی چھتوں میں سے روشنی چھن چھن کر در و دیوار پر فدا ہو رہی تھی۔ شدتِ جذبات سے سفید پلستر کا رنگ بدلنے لگا، فواروں اور نہروں کا پانی پارہ ہوگیا، چونے کے پلستر پر سنگ ولاجورد کا گمان ہونے لگا۔ یہ وہ منظر تھا جسے کسی کیمرے کی آنکھ محفوظ نہیں کر سکتی، بے شمار کیمرے ایک ایک نقش ایک ایک زاویہ سے ہم کلام تھے،

بے شمار سیّاح دانتوں میں انگلیاں دبائے ان مناظر کو اپنے دل و دماغ کی سکرینوں پر منتقل کرنے کی ناکام کوششوں میں لگ گئے۔ مَیں ایک دیوار کے ساتھ رکھی کجاوہ نما کرسی میں دبک گیا۔

شدتِ حُسن باعثِ حُزن بننے لگی تو میں نے ایک بار پھر کھنڈرات کا رُخ کیا۔ ایک بار پھر فصیل سے زوالِ غرناطہ کی داستان سننے چل دیا۔ سلاطین بنونصر نے باغِ عدن جبل سبیقہ پر بسایا تو اس کی حریف جبل شمس کی پیشانی پر جنت العریف کا جھومر سجا دیا۔ دامنِ جبل سے بلندیٔ شمس تک تہ در تہ باغ لگا دیئے۔ باغ جن میں شفاف پانی کی نہریں بہتی ہیں۔ نہروں کے کناروں پر پھولوں بھری ڈالیاں پانی کو چھوتی ہیں تو لہریں پھولوں کے لئے بیتاب ہو ہو جاتی ہیں۔ نہروں میں پانی برساتے فوارے پھولوں پر چھڑکاؤ کرتے رہتے ہیں۔ ماہرین نے قرآن کریم میں بیان ہوئے باغِ جنت کا نقشہ ذہنِ رسا میں سمو کر جبلِ شمس پر اس کی نقل تیار کر ڈالی۔ عیسائی مؤرخ اسے سلاطین بنونصر کی موسم گرما کی سیرگاہ کا نام دیتے ہیں۔ مَیں نے الحمرا کی فصیل پر کھڑے ہو کر العریف کا جائزہ لیا۔ اگر سلطان اسے سبزہ پوش نہ کرتے تو یہ حور کے پہلو میں لنگور کی مثل ایک خشک ٹیلہ ہوتا۔ باغِ عدن کے باسیوں کی نظروں کے سامنے ہمہ وقت اپنی بدصورتی کی نمائش کرتا رہتا۔ اس کا علاج یہی ہو سکتا تھا کہ اسے کسی اور خواب کی تعبیر کی تجسیم دے دی جائے عہدِ قدیم میں اہل الحمرا فصیل کا چکر کاٹ کر دامن جبل شمس کو چھوتے ہوئے جنت العریف کی بلندی تک پہنچتے تھے اب محکمہ تحفظ آثار نے سیّاحوں کی تن آسانی کی خاطر الحمراء کی فصیل کاٹ کر جبلِ سبیقہ سے جبلِ شمس کے دامن تک ایک پل بنا دیا ہے۔ دونوں پہاڑوں کو جدا کرنے والی رودکوہ پر معلّق اس پل کے درمیان سے باغِ عدن اور جنت العریف کا موازنہ کریں تو ایک طرف حُسن آوارہ ہے۔ الحمرا کی فصیل کے دامن سے اُٹھتے بے ترتیب اونچے نیچے درخت اور ان کے سروں پر فصیلِ مدینہ کی پھٹی پرانی قبا اس سے پرے الحمرا کے مقید حُسن کے مقابر اور دوسری طرف گل و گلشن فطرت کے دست شفقت کی بجائے انسان کے دستِ قدرت کا معجزہ دکھائی پڑتا ہے جبل شمس کے سینہ پر دورِ اسلام میں ہر طرف محل اور گلستان تھے۔ سقوطِ غرناطہ کے بعد ہر وہ چیز زوال پذیر ہوئی جو زوال نصیب قوم سے وابستہ تھی۔ باغوں اور محلوں میں پانی کی تقسیم کا نہری نظام منتشر ہوا تو باغات و محلات ویرانوں میں بدل گئے۔ صرف جنت العریف باقی ہے جس کے راستہ کے دونوں طرف

اُداس سروؤں کے بیمار سایہ میں لیٹی طویل سڑک ناپنا پڑتی ہے جس کے آخری سرے پر گل وگلزار میں گھرا ایک اوپن ایئر تھیٹر ہے۔

مسلم دور میں رقص وموسیقی نہ اتنے اوپن ایئر تھے نہ ان کے تھیٹر ہوا کرتے تھے۔ جنت العریف کے زیر سایہ اوپن ایئر تھیٹر ۱۹۵۱ء میں رقص وموسیقی کی بین الاقوامی مقابلہ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ اب ہر سال وہاں رقص اور موسیقی کے مقابلے ہوتے ہیں۔ تھیٹر کے اردگرد جنت العریف کے انداز میں حوض نہریں اور فوارے بنا کر قسم قسم کے پھول اُور پودے لگا دیئے ہیں۔ خوبصورت روشوں کے گرد یورپی انداز میں سرتراشیدہ سبزہ کی دیواریں کھڑی کر دی ہیں جن کے درمیان سے گزر کر درِ جنت تک رسائی ملتی ہے۔ جنت العریف کی سربلند فصیل کے باہر سے یہ اندازہ مشکل ہے کہ اس سے پرے رقصِ گل اور نغمہِ آب رواں میں مقابلہ جاری ہے۔

باغ کی بیرونی ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے کی سیڑھیاں دیکھ کر گائیڈ بکس لکھنے والوں نے اندازہ کرلیا کہ شاہی سواری اسی ڈیوڑھی تک آتی ہوگی۔ گھوڑے سیڑھیاں تو چڑھنے سے رہے۔ انہوں نے اسے گھوڑوں سے اُترنے کا مقام قرار دے دیا۔ سیڑھیوں سے آگے کے کمرے میں پڑے بنچ سے اندازہ کیا کہ یہ دربان کے بیٹھنے کے لئے رکھا گیا ہوگا۔ اسے دربان رُوم قرار دے کر لکھ دیا کہ یہاں ہی دربان آگے بڑھ کر دروازہ کھولتا تھا۔ جنت العریف پر صدیوں ایک عیسائی امیر کی اولاد قابض رہی تھی اس نے یہ بنچ اسی لئے تبدیل نہیں کیا ہوگا کہ ان کے مؤرخین کو تحقیقات میں آسانی رہے۔ الحمرا کی مانند جنت العریف کے مختلف حصّوں کے نام اور ان سے متعلق وظائف بھی گائیڈوں نے ضرورت شعری کے تحت متعین کئے ہیں۔

سقوطِ غرناطہ جنوری ۱۴۹۲ء کا حادثہ ہے اس وقت فاتحین کو صدیوں کے خزینے لوٹنے اور بانٹنے سے ہی فرصت نہ تھی۔ جملہ اسلامی اور عربی کتب جلوادی گئی تھیں۔ عربی زبان سیکھنا ایسا جُرم ٹھہرا جس میں جان دینا پڑتی تھی۔ دورِ جدید میں حُسن وفن کے ان قدیم خزینوں کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ سیاح آئے، سیاحت چلی تو گائیڈ پیدا ہوئے۔ گائیڈ بکس تخلیق کی گئیں۔ مسلم معاشرت تاریخ اور تہذیب سے ناآشنا ماہرین نے قوت تخیلہ کی مدد سے اپنی مرضی اور سیاحوں کی پسند کے مطابق ہر مقام کا نام رکھا ہر مقام سے من پسند کہانیاں وابستہ کردیں۔ گائیڈوں کے دربان روم کے دوسرے

دروازے کی سیڑھیاں چڑھ کر جنت العریف کے پہلے تختہ میں داخل ہوتے ہی زمین سے رشتہ کمزور ہونے لگتا ہے اور تخیل کی پرواز بلند ہو جاتی ہے ماحول کا حزن و ملال اور اسراریت دل و دماغ میں اترنا شروع ہو جاتے ہیں۔ باغ کی پوری لمبائی میں رواں نہر کے دونوں کناروں کی طرف سے درجنوں فواروں کا پانی بلندی سے نہر کی شفاف سطح سے ٹکراتا ہے تو سطح آب سے سسکیوں کی آواز آتی ہے۔ فوارے آہیں بھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ ہر پھول کی آنکھ نمناک ہو جاتی ہے، باغ کے آخری سرے پر نہر شاہی آرام گاہ کے فرش کے نیچے روپوش ہو جاتی ہے جیسے شالا مار باغ کے پہلے تختے کے درمیان سے گزرنے والی نہر اس کے آخری کنارے پر بنی سرخ ڈیوڑھی کے فرش کے نیچے غائب ہو جاتی ہے۔ شالا مار باغ کی نہر ڈیوڑھی سے گزر کر دوسری طرف جانکلتی ہے اور دوسرے تختہ کے تالاب میں جا گرتی ہے۔ جنت العریف کے آخری سرے پر شالا مار باغ کی ڈیوڑھی کی جگہ بنی شاہی آرام گاہ سے آگے پہاڑی ختم ہو جاتی ہے۔ باغ کی فصیل پہاڑی کی ڈھلوان پر کھڑی ہے۔ شاہی آرام گاہ کا دروازہ، اس کے سامنے کے برآمدہ کی مرکزی محراب، آرام گاہ سے پیچھے جھروکہ شاہی کا دروازہ اور اس جھروکہ سے وادی میں پھیلے غرناطہ اور جبل سبیقہ پر ایستادہ الحمراء کا نظارہ کرنے کی کھڑکی سب نہر کی سیدھ میں بنے ہیں۔ ایک روز سُورج کے اختتام سفر سے پہلے میں جھروکہ شاہی کی اس کھڑکی سے لگا کھڑا تھا، ایک طرف جنت العریف کی جنت نظیر فضا تھی اور دوسری طرف رنگ وخون کی کشمکش غرناطہ اور الحمرا کی قدیم وجدید عمارتوں سے اوپر فضا آسمان کی حدود تک سنہری ہو رہی تھی۔ الحمرا کے قلعہ کا عظیم الجسامت نگران برج خون میں نہا رہا تھا اس کے زیر سایہ عمارتوں کی چھتوں پر سُرخ خُون جم کر سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ فصیل کی بلندیوں کو چھونے کی جسارت میں درختوں کے چہرے سیاہ پڑ گئے تھے۔ ان سے نیچے گہرائی میں البازین کے عرب مکانات اور ان سے آگے قدیم وجدید عمارات نے سروں پر کیسری چنریاں اوڑھ لی تھیں۔ مَیں نے پیچھے مڑ کر دیکھا نہر کے شفاف پانی کی سطح کا نور ماند پڑ گیا تھا، فواروں کے نغمہ میں حزن وملال کے سُر غالب آنے لگے تھے۔ نہر کے کنارے دونوں طرف کے تختوں میں رنگ رنگ کے پھُول افسردہ ہو گئے تھے۔ جنت العریف کے ماتمی ماحول سے گھبرا کر ایک بار پھر کھڑکی سے دُور دیکھنے کی کوشش کی تو اُفق سے سُرخ آندھی اور طوفان غرناطہ کے لئے بلند ہو رہے تھے۔ بچپن

میں سُنا تھا جب کہیں کوئی بے گناہ قتل کیا جاتا ہے تو اس بستی پر سُرخ آندھی اور طوفان نازل کئے جاتے ہیں۔

تختہ اوّل کی پوری لمبائی میں مغربی فصیل کے ساتھ محرابی دروازوں والا برآمدہ ہے جس کی پچھلی کھڑکیاں الحمرا کی طرف کھلتی ہیں۔ الحمرا کے باسی جنت العریف کی آسودگی کے لمحات میں بھی الحمرا کا نظروں سے اوجھل ہونا گوارا نہ کر سکتے تھے۔ مشرقی سمت دو کشادہ دالان ہیں، ایک سرمائی اور ایک گرمائی۔ ایک گائیڈ اپنے گاہکوں کو بتا رہا تھا کہ اصل میں یہاں چار دالان ہونا چاہئے تھے۔ ''وہ کیوں؟''..... ''کیونکہ مسلمانوں کا امیر شریعت کے مطابق چار بیویاں تو رکھتا ہی ہوگا۔'' سیاح ہنس پڑے۔ پہلے تختہ کے پہلو میں دوسرا تختہ ہے جس میں داخلہ کی سیڑھیاں پہلے تختہ کے اندر ہیں، اسے گائیڈ اور مؤرخ سروؤں والا باغ کہتے ہیں اس میں ایک صدیوں پُرانا سرو کا درخت بھی ہے جس کے پاس کھڑے ہو کر وہ اپنے گاہکوں کو بتاتے ہیں کہ اس درخت کے زیر سایہ آخری مسلمان حکمران ابوعبداللہ کی بیگم بنوسراج کے ایک نوجوان سے چھپ چھپ ملا کرتی تھی جس وجہ سے ابو عبداللہ نے بنوسراج کے چھتیس سرداروں کو الحمرا کے شیروں والے دالان سے ملحق ہال میں بلا کر قتل کرا دیا تھا۔ بنوسراج کا کوئی سردار اگر قتل ہوا بھی تو اس لئے کہ قرطبہ کی تباہی کے بعد بھی انہوں نے غرناطہ میں آ کر تخت وتاج کی تبدیلی کی سازشوں میں سرگرم حصّہ لینا ترک نہیں کیا تھا اور ابوعبداللہ کے ماتر بھائیوں کے ساتھ مل کر بنوسراج سازشیں کیا کرتے تھے لیکن یہ حقیقت سیاحتی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی اس لئے ایک افسانہ تراشنا لازم ہو گیا۔ دوسرے تختہ کے پہلو سے اوپر پہاڑی کی چوٹی کی طرف سیڑھیاں جاتی ہیں جن کے ساتھ بنی آبشاروں پر پانی رواں دواں رہتا تھا۔ گائیڈ اسے پانی کا باغ قرار دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ یہ آبشاریں اس لئے بنائی گئی تھیں کہ بادشاہ سب سے اُونچی سطح پر بنی مسجد میں نماز کے لئے جاتے ہوئے چلتا چلتا وضو بھی کر سکے اس دور میں مسلمان بادشاہ کتنے مصروف ہوتے تھے کہ بیٹھ کر وضو کرنے کو بھی وقت نہیں ملتا تھا لیکن وہ چلتے پھرتے وضو کیسے کر لیتے تھے؟ کوئی گائیڈ وضو کے اس شاہی طریقہ کی وضاحت نہ کر سکا۔ جنت العریف کی مسجد کی جگہ مسقّف چبوترہ بنا دیا گیا ہے۔ اس سے آگے پہاڑی پر دُور خانہ بدوشوں کے غار ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے چہرہ سنگ پر چیچک کے گھنے داغ ہوں اس پہاڑی پر مسلمان دور کی

فصیل کی باقیات کی لکیریں نامعلوم منزلوں کی طرف چلی جاتی ہیں۔ جبل شمس کا سینہ محلات اور باغات کے کھنڈرات سے داغ داغ ہے۔ سامنے خانہ بدوشوں کے غار جبل شمس کو چیرتی ہوئی دیوار اور پیچھے جبل سبیقہ پر مدینۃ الحمرا کے کھنڈرات اس مقام پر مجھے ابوالعباس کی وہ نظم یاد آنے لگی جو اس نے زوال پذیر اندلس کے کسی اور مقام پر کہی تھی۔

''غم کی وجہ سے وہ کھنڈر مجھے پسند نہ آئے
اور وہ میرے کسی سوالات کا جواب نہ دے سکے
ان کھنڈروں میں ان انسانوں کی بجائے جو گورے، نوجوان،
اور ہم عمر تھے
وحشیوں نے بسیرا کر لیا ہے
میں نے ان پر کھڑے ہو کر اس قدر آنسو بہائے
کہ میرے تمام ساتھی دیر تک کھڑے رہنے کی شکایت کرنے لگے
اور ان کھنڈروں میں میرے زیادہ رونے سے
میرے ساتھی بھی روئے
اور ان کی اونٹنیاں بھی بلبلانے لگیں۔''

سجدوں کی واپسی

جنت العریف کے سب سے بلند جھروکے میں دو نوجوان سجدے میں پڑے تھے ایک روز الحمرا کے دروازے پر ایک بزرگ ہاتھ میں رومال لئے کھڑا تھا۔ رومال کی پوٹلی میں تین سکّے تھے۔ اس نے اِردگرد کھڑے نوجوان سیاحوں کی طرف رومال بڑھایا۔ ''یہ کتنے سکّے ہیں؟'' ایک نوجوان نے پوٹلی ٹٹول کر جواب دیا ''تین۔'' پھر انہوں نے دو سکّے نکال لئے ''اور اب کتنے سکّے ہیں؟'' اُس نے پوٹلی اسی نوجوان کی طرف بڑھادی۔ نوجوان نے ایک بار پھر پوٹلی ٹٹولنے کے بعد جواب دیا ''ایک''۔ بقیہ نوجوان باریش بوڑھے کی باتیں بڑے غور سے سُن رہے تھے اور اس کی حرکتوں پر مسکرا رہے تھے۔ بوڑھے نے ایک بار پھر رومال کی پوٹلی میں تین سکّے ڈالے اور اسی نوجوان سے سکّوں کی تعداد دریافت کی۔ اس نے ایک بار پھر ''تین'' جواب دیا۔ بوڑھے کی آنکھوں میں چمک آ گئی: ''ان تینوں کا ایک بنا دو۔'' ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' نوجوان نے بوڑھے کی عقل پر قہقہہ لگایا۔ ''یہ تو تم اپنے پادریوں سے پوچھو جو کہتے ہیں تین ایک ہیں۔'' بوڑھا عملی طور پر تین کے ایک ہو جانے کی تردید کر چکا تو اور بھی اعتماد سے بات کرنے لگا۔ نوجوان اس کی باتیں ہنسی میں اُڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ نوجوانوں کی ہنسی اور مذاق سے بے نیاز بوڑھا ان کے درمیان کھڑا تصور وحدت کی مزید وضاحت کرتا رہا۔ مَیں خاموش کھڑا سُنتا رہا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور وحدت و تثلیث کی بحث چھوڑ کر گلے لگا لیا تھا۔

سیاح سجدے میں پڑے نوجوانوں کو حیرانی سے دیکھتے اور سجدوں کی واپسی پر پریشانی سے آگے نکل جاتے۔ گمشدہ سجدوں کی زمین پر جبینِ نیاز کو سجدہ میں دیکھا تو خوش کن حیرانی ہوئی۔

میں نے ثبوتِ سجدہ کے لئے دو تین تصویریں بنائیں اور اختتامِ سجدہ کے انتظار میں وہیں کھڑا رہا۔ آنے جانے دیکھنے اور تصاویر بنانے والوں سے بے نیاز نوجوان لمبے لمبے رکوع و سجود میں مشغول رہے اور دعا کے بعد جانماز لپیٹ کر کتابیں کھول لیں۔

اس شہر اور ملک میں ایک بھی مسلمان باقی نہیں بچا تھا۔ یہ سنگ و خشت پانچ صدیوں سے ایک سجدہ کو ترس رہے تھے۔ طویل سجدوں کی یہ واپسی کیسے ہوئی؟ وہ دونوں مراکشی نوجوان تھے۔ غرناطہ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے اور سجدوں کی پیاسی زمین غرناطہ کو ایک بار پھر سجود آشنا کرنے کے لئے جانماز ساتھ رکھتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ غرناطہ یونیورسٹی کے عرب طلبا اور دیگر مسلمانوں نے ایک جدید آبادی میں ایک مسجد بنائی ہے جہاں پانچ وقت اذان اور جماعت ہوتی ہے۔ مَیں نے ان سے مسجد عمر کا ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر لیا اور پوشیدہ سجدوں کی تلاش میں چل دیا۔

زیارتِ کھنڈرات کے سفر میں قبولِ دعوت وقت کا زیاں ہوتا ہے۔ چائے کی پیالی کہیں سے بھی مل جاتی ہے مگر گزر گئے لمحات کسی قیمت نہیں ملتے۔ وقت کی فضول خرچی سب سے بڑا گناہ ہے۔ میں اس بوڑھے کی دعوت چائے کی قبولیت کے گناہ سے اجتناب نہ کر سکا۔ چھوٹے سے فلیٹ کی سیڑھیوں کے پاس اس کے مشن اور نام کی تختی لگی تھی۔ چھوٹا سا ڈرائنگ روم سادہ سا۔ نہ یورپی رنگ، نہ اندلسی رُوپ۔ جانماز بھی تھا۔ مذہبی کتب بھی تھیں اور کچھ پمفلٹ بھی تھے۔ دودھ والی چائے اور پنجاب والی باتوں کا جو غرناطہ کے اس فلیٹ میں مزہ آیا بہت دیر تک یاد رہا۔ معلوم ہوا چائے ہی کی نہیں، رات کے کھانے کی بھی دعوت ہے شہر کے کسی اور حصّہ میں کسی اور پاکستانی کی طرف سے مَیں وہ شام اور شب البازین کی نیم تاریک گلیوں میں گزارنا چاہتا تھا۔ ان گلیوں میں جو زبانِ حال سے بیانِ ماضی پر قادر ہیں جن میں چلتے ہوئے اب بھی فضاء میں عربی نغموں کا احساس ہوتا ہے لیکن وہ اہتمام کر چکے تھے اور غرناطہ میں موجود دیگر پاکستانی بھی مدعو تھے۔

جس آبادی میں ہم دعوت کھانے گئے، وہ تکمیل کے مراحل میں تھی۔ غرناطہ سے باہر کئی منزلہ فلیٹ بن چکے تھے۔ سڑکیں پارک وغیرہ بن رہے تھے۔ کم آمدنی والے لوگوں کے لئے کم خرچ رہائشی آبادی کی بیرونی وجاہت کوئی زیادہ متاثر کرنے والی نہ تھی مگر بچّوں بڑوں کی تعداد سے اندازہ ہوتا تھا فلیٹ سب آباد ہیں۔ کسی اُوپر کی منزل پر سنگل بیڈ روم کے تنگدل فلیٹ میں کشادہ

دل پاکستانی نوجوان اور اس کی اندلسی بیوی نے بڑے احترام سے استقبال کیا۔ مجھ سے زیادہ ان بزرگ کا۔ نوجوان وہیں قریب کہیں کوئلے کی کان میں کام کرتا تھا۔ ان کانوں میں اور بھی پاکستانی کام کرتے تھے۔ اس نے مقامی لڑکی سے شادی کر لی تو حقوقِ کام اور قیام مستحکم ہو گئے۔ اس قیام و استحکام میں اس بزرگ نے مدد کی تھی۔ جس کے جواب میں اس جوڑے نے ان کی ''دعوت'' قبول کر لی تھی۔ ان دونوں کے بیانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے دل و دماغ پر اس قبولیت کا گہرا اثر ہے اس اثر سے وہ بزرگ بڑے خوش تھے اور بات بات پر فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھتے تھے۔

ان سے میری پہلی ملاقات ربوہ کے شاہی مہمان خانہ میں کئی سال پہلے ہوئی تھی۔ میں ربوہ جماعت کا سالانہ جلسہ کور کرنے گیا تھا اور ظفر صاحب اندلس سے سالانہ رپورٹ پیش کرنے آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ چالیس سال سے اندلس میں کام کر رہے ہیں۔ ان کے بچے وہیں پیدا ہوئے اور وہیں کے شہری ہو گئے ہیں۔ ان چالیس سالوں کے مشنری کام کے دوران وہ اپنی روزی بھی خود کماتے رہے اپنے مشن کے لئے بھی کام کرتے رہے۔ مقامی زبان کے علاوہ مقامی حکام سے بھی ان کی اچھی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے انہیں قرطبہ سے کچھ فاصلے پر اپنی عبادت گاہ بنانے کی اجازت مل گئی تھی۔

لندن سے مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ اسی ''مسجد'' اور اس سے ملحق مشن میں رہائش رکھتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ پہلے وہ پورے اندلس کے مشن کے سربراہ ہوا کرتے تھے۔ اب ربوہ کے ''شاہی'' خاندان کے کوئی اور فرد سربراہِ مشن بن کر آ گئے ہیں اور وہ غرناطہ بھیج دیے گئے ہیں۔

تاریخ اسلام کے واقعات اور کھنڈرات کی بات ہوئی تو اندازہ ہوا کہ انہیں نہ ان کا زیادہ علم ہے اور نہ ان سے کوئی دلچسپی ہے۔ وہ مسلمانوں کے ماضی کی بجائے اپنے حال میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ نو قادیانی خاتون بڑے تپاک سے ہمارے لئے کھانے پکاتی رہی۔ ان کا میاں بڑے جوش سے مجھے اپنے نئے جذبات سے آگاہ کرنے میں لگا رہا۔ تین چار اور پاکستانی بھی آ گئے۔ ان میں سے ایک مرزا صاحب تھے جو کافی سال سعودی عرب میں رہے تھے اور اب اندلس میں آ کر ''سعودی اسلام'' کے ردعمل کے طور پر قادیانیت کو دل سے قبول کر چکے تھے۔ بشارت صاحب

ربوہ سے لندن گئے تھے۔ سالانہ کانفرنس میں شرکت کے لئے اور وہاں سے اندلس میں جماعت کے کام کی ترقی دیکھنے آئے تھے۔ ایک اور نوجوان بھی لندن سے ان کے ساتھ ہی آیا تھا اور غرناطہ میں قیام کی کوشش کر رہا تھا۔ اخباری حوالہ سے سب میرے نام سے واقف تھے، اس لئے پہچان اور بحث میں کسی کو کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ ان کا کہنا تھا کہ اب امن اور شانتی کے پیغام کے ذریعے وہ اندلس کو مذہبی طور پر فتح کر لیں گے۔ مَیں نے کہا ''آپ اپنی ساری سرگرمیاں اسی ایک ملک پر مرکوز کر دیں۔ ہماری طرف سے اجازت ہے آپ اسے فتح کر لیں۔ ہم نے جو اندلس لڑائی جھگڑے سے گنوا دیا تھا، آپ کو مل جائے تو ہم خوش ہوں گے'' انہوں نے کہا اب بھی اندلسی نسل کو آپ کی فتوحات یاد ہیں۔ وہ اب بھی ان تلواروں اور نیزوں کو نہیں بھولے۔ کہتے ہیں اس وقت تم فوجیں اور تلواریں لے کر آئے تھے، اب تو آ کر دیکھو۔ میں نے کہا آپ کے پاس نہ تو فوج ہے نہ آپ کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ آپ سے تو وہ ناراض نہیں ہوں گے۔ ہم سے ناراض ہیں تو رہنے دو۔ انہوں نے کہا اسی لئے تو وہ ہماری بات سُن لیتے ہیں ہم محبت اور امن کی بات کرتے ہیں۔ محبت اور امن کی باتوں اور اندلسی خاتون کے تیار کردہ کھانا کھانے میں کافی رات گزر گئی تو خاتونِ خانہ کا شکریہ ادا کر کے ہم مرزا صاحب کی گاڑی میں گویا غرناطہ روانہ ہوئے۔

مسجدِ عمر میں دو باریش نوجوان ایک بڑی میز کے گرد غرقِ مطالعہ تھے۔ اسلامک ایسوسی ایشن کے صدر مہر اور ان کے معاون عبدالقادر پرائے دیس میں اپنوں کی مانند ملے۔ عبدالقادر کا خاندان ان ہزاروں میں سے ایک ہے جنہیں فلسطین میں ان کے گھروں سے نکال دیا گیا ہے۔ یہ مسلمانوں ہی کو ان کے گھروں سے کیوں نکالا جاتا ہے؟ اندلس سے فلسطین اور بھارت سے اِس کی کہانی میری اپنی کہانی تھی۔ وہ غرناطہ میں تعلیم حاصل کرنے آیا ہے۔ مَیں غرناطہ میں عبرت حاصل کرنے آیا ہُوں۔

مسجدِ عمر ہماری مساجد کی طرح ''محترم'' نہیں تھی اس کے ساتھ ایک بڑا دارالمطالعہ تھا، جس میں دین و دنیا کے کتب و رسائل رکھے تھے۔ عبدالقادر ڈاکٹری کی کتاب کھولے بیٹھا تھا۔ ہماری کسی مسجد میں کوئی یہ گستاخی کرے تو کتاب سمیت مسجد سے باہر پھینک دیا جائے۔ ہمارے مذہب اور عجمی اسلام کی مانند ہماری مساجد کا تقدس بھی کافی نازک واقع ہُوا ہے۔ مسجدِ عمر کے ایک کمرے

میں نوجوان ٹیبل ٹینس کھیل رہے تھے مگر اس کے تقدس کو پھر بھی کوئی خراش تک نہیں آئی تھی۔
کیوں؟ مَیں سوچ میں پڑ گیا۔ عبدالقادر مسکرایا۔ ''یہاں کوئی مولوی نہیں اِس لئے ہمارے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا''۔ باجماعت نماز کے بعد دل نے اور بھی شدت سے مشورہ دیا کہ ان کا آسان سا اسلام قبول کرلیں۔ دماغ نے پوچھا: تم نے پاکستان جانا ہے یا نہیں؟ آسان اور قابلِ عمل اسلام قبول کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ٹیبل ٹینس کی بازی ادھوری چھوڑ، ایک نوجوان نے اذان کہی پڑھنے والوں نے اپنی کتابیں اُلٹ دیں، کھیلنے والوں نے وضو کئے اور سب ایک ہی صف میں نمازِ عشا کے لئے کھڑے ہو گئے۔ پُرسکون نماز کے بعد پڑھنے والوں نے پھر کتابیں کھول لیں۔ کھیلنے والے کھیل میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے مجھے مسجد کا کچن بھی دکھایا جس میں کھانے پکانے کے جملہ لوازمات کے ساتھ ڈیپ فریزر بھی لائن حاضر تھے۔ عبدالقادر نے بتایا کہ ایسوسی ایشن مسلمانانِ غرناطہ کے لئے حلال گوشت کا بھی بندوبست کرتی ہے۔ لوگ نماز پڑھنے آتے ہیں، اپنی ضرورت کا گوشت بھی لے جاتے ہیں۔ ماہ رمضان کے انتظامات ہو رہے تھے۔ شہر کے دُور دراز حصوں میں بکھرے مسلمان اسی ایک مسجد میں تراویح پڑھتے ہیں۔ شب بھر تلاوت ومطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔ سب کی سحری کا اہتمام وہیں ہوتا ہے۔ سحری اور نمازِ فجر کے بعد وہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ اسلام میڈایزی کا وہ نمونہ دیکھ کر اپنے ہاں کی مشکلاتِ دین آنکھوں کے سامنے گھوم گئیں۔

وہ پاکستان کے صرف دو آدمیوں کو جانتے تھے ایک مرحوم کو اور ایک موجود کو۔ مولانا مودودی کی کتب اور خدمات کا ذکر کرتے رہے اور میاں طفیل محمد کی صحت کے بارے میں استفسار کرنے لگے۔ میں ان سے غرناطہ کے ماضی کی بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ حال کے بیان میں لگ گئے۔ دوصد مقامی خاندان گزشتہ ایک دو سالوں میں صرف غرناطہ میں مسلمان ہوئے ہیں۔ بچے، عورتیں، بوڑھے اور جوان پسماندہ آبادیوں میں رہنے والے ان مسلمانوں نے اپنی ایک تنظیم بھی قائم کر لی ہے اور ان کے محلّوں میں دو مساجد بھی بن گئی ہیں۔

غرناطہ کی گلیوں اور بازاروں کی جومنوں گرد دلِ ناتواں پر جم گئی تھی ہلکی ہونے لگی۔ انہوں نے پاکستان کے ایک مشن کی سرگرمیوں کی بھی بات کی جس کا میں نے گزشتہ شب ہی پیٹ بھر کر

نمک کھایا تھا'' پہلے لوگ ان کے بارے میں غلط فہمیوں کا شکار تھے۔ اب سب جان گئے ہیں۔ کوئی ان کے قابو نہیں آتا۔ ان پاکستانیوں کے علاوہ جو روزگار کی مشکلات کے ہاتھوں تنگ اِدھر آ جاتے ہیں، مشن انہیں ورک پرمٹ دلا دیتا ہے چھوٹے موٹے کام کرنے کے طریقے بتا دیتا ہے۔ زبان اور حکام سے واقفیت کی وجہ سے ان کی سرپرستی کرتا ہے لیکن مستقل کام اور قیام کی اجازت اس وقت ہی دلاتے ہیں جب وہ قربانی اور آزمائش کا امتحان پاس کر لیتے ہیں اور مشن کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب وہ پورے پورے قادیانیت میں شامل ہو گئے ہیں۔ جن کی اطاعت اور فرمانبرداری مشکوک ہو، انہیں دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ لوگ دنیاوی دھکوں کے خوف سے آخرت کے دھکے قبول کر لیتے ہیں۔ دولتِ دنیا کی خاطر دولتِ دین لُٹا دیتے ہیں۔''

مَیں نے ان دوصد گھرانوں کی دینی اور دنیاوی دولت مندی کا حال پوچھا۔ اس نے کہا ''دینی دولت سے سب مالا مال ہیں اور دنیاوی دولت سے محروم جو کوئی مسلمان ہو جاتا ہے اس پر ملازمتوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی موٹی ملازمت اور کسی سٹور میں کام مل جائے تو بڑی غنیمت ہے'' اپنی بظاہر روشن خیالی کے باوجود اہلِ سپین اندر سے کافی تنگ ہیں۔ جو اندر سے تنگ ہو وہ معاملات میں کیسے کشادہ ہو سکتا ہے؟ وہ لوگ ایک مراکشی مبلغِ اسلام صوفی عبدالقادر کی کوششوں سے مسلمان ہوئے ہیں۔ عبدالقادر نے میرے ہوٹل کے دروازے پر مجھے ڈراپ کیا تو رات گہری نیند سو رہی تھی۔ شراب خانے اور قہوہ خانے سب بند ہو چکے تھے۔ اس سکوت میں مسجدِ عمر کے مؤذن کی آواز اب بھی کانوں میں گُونج رہی تھی۔ حضرتِ اقبال کو اندلس کی بادِ سحر میں خاموش اذانیں سنائی دی تھیں، مَیں سکوتِ شب میں دلِ وجود سے پار گزر جانے والی اذان کی آواز سُن رہا تھا۔ آسمان پر چمکتے ستارے، زمینی قمقمے اور ان کے درمیان میں محوِ خواب غرناطہ جو میرے خوابوں میں آیا کرتا تھا، مَیں آسمان کے ستاروں کی چالوں میں اس خواب کی تعبیر ڈھونڈنے لگا۔

ہر طرف وہ عظیم شہر تھا جو مسلمانوں نے آباد کیا تھا۔ مسلمانوں نے اسے رشکِ ارم بنایا تھا اور پھر مسلمانوں پر اس کے گلیاں اور بازار تنگ ہو گئے تھے۔ غرناطہ کے زمین و آسمان نے مسلمانوں کا عُروج وکمال بھی دیکھا اور ان کا زوال بھی دیکھا ہے اس کے لب ورخسار کی سُرخی میں

آج بھی خونِ مُسلم کی جھلک نمایاں ہے۔مَیں نے ظفر صاحب سے پوچھا۔''آپ نے تیس چالیس سال کی محنت میں کتنے عیسائیوں کو غلامِ قادیان کیا؟'' وہ جواب سوچنے میں گم ہو گئے۔ مَیں نے اسے اپنا سوال یاد دلایا تو انہوں نے صاف دِلی سے کہا''ایک درجن سے زائد نہیں''۔ ''صوفی عبدالقادر نے چند سالوں میں اتنے لوگوں کو مسلمان کر لیا اور آپ اتنے سالوں میں ایک درجن سے بھی آگے نہ بڑھ سکے؟'' وہ پھر جواب کی تلاش میں نکل گئے''اگر آپ نے پاکستانیوں کو ہی قادیانی بنانا تھا تو پھر اتنی دُور آنے کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے ایک اور سوال چھیڑ ڈالا۔اس کا جواب ان کے پاس تھا مگر کہہ نہیں سکتے تھے کہ پاکستان میں اتنے بے یار و مددگار لوگ نہیں ملتے۔صوفی عبدالقادر کی تحریک کی کامیابی کے ضمن میں کہا''ہمارے پاس اتنا پیسہ بھی تو نہیں''۔ ''مگر آپ کے پاس امن و آشتی تو ہیں''۔وہ مسکرا دیئے۔میری باتوں سے ناراض ہوئے نہ کوئی جوابی حملہ کیا۔یہ قادیانی مبلغوں کی تربیت کا حصّہ ہے۔گفتگو میں نرمی تعلقات میں گرمی۔

مرزا صاحب اپنا کام چھوڑ کر مجھے غرناطہ لیے پھرے وہ میخانہ بناتے ہیں اور چلاتے ہیں اور پھر فروخت کر دیتے ہیں۔ان دنوں وہ میرے قیام والے ہوٹل کے سامنے ایک اور میخانہ بنا رہے تھے۔زمانہ قبل از تاریخ کے غار کی شکل میں۔ان کا خیال تھا کہ اس انفرادیت کی وجہ سے خوب چلے گا اور خوب چل جائے گا تو خوب منافع پر بک جائے گا۔ مجھے اس کی سعودی عرب والوں کے اسلام سے ناراضگی کی وجہ سمجھ آنے لگی۔

کھڑکی کے دائیں رخ وہ سڑک تھی جس پر سیدھے چلتے جائیں تو الحمرا پہنچ جاتے ہیں۔ اس سڑک سے تھوڑا سا ہٹ کر غرناطہ کا وہ کلیسا ہے جس میں فاتحین غرناطہ فرڈی ننڈ اور ازابیلا کی قبریں ہیں۔ان کے اوپر کسی مصور کی بنائی تصویر میں ابوعبداللہ فرڈی ننڈ کو شہر الحمرا کی چابیاں پیش کرتا دکھایا گیا ہے۔اسی کلیسا میں ایک تختی پر کنندہ ہے کہ اس جگہ مسلمانوں کی جامع مسجد ہوتی تھی۔ جامع غرناطہ،سقوط غرناطہ،الحمرا کی چابیاں،ابوعبداللہ،فرڈی ننڈ اور کلیسا صدیوں کی کہانی سمٹ کر سامنے آن کھڑی ہوئی۔ میں نے دونوں کواڑ بند کر دیئے۔مسجد عمر سے آواز آئی''اللہ اکبر! اللہ اکبر!!''میں نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے کمرے کی فضا مہک اور آسودگی سے معمور ہوگئی۔غرناطہ کے ہر گلی محلے سے جب دن میں پانچ وقت یہی صدا بلند ہوتی تھی تو اس کے گلیاں

محلے کتنے مہک انگیز ہوتے ہوں گے؟ جب اس آواز پر پابندی لگ گئی تو ان گلیوں اور محلّوں کا کیا حال ہوا ہوگا؟ غرناطہ اندلس کا شاید واحد شہر ہے جس کی پیدائش پر اس کے کان میں اذان کہی گئی تھی۔باقی شہر پہلے عیسائی تھے مسلمانوں کی آمد پر اسلام قبول کیا۔ان کے خاتمہ پر ان کے گلے میں صلیب لٹکا دی گئی جسے وہ اب تک اٹھائے ہوئے ہیں۔قرطبہ کی گلیوں اور بازاروں میں چلتے ہوئے محسوس ہوتا ہے سب رو رہے ہیں۔زمین اداس ہے۔اشبیلیہ کے در و دیوار اور آب رواں کبیر گلے ملنے کی کوشش کرتے ہیں۔غرناطہ کی ہوائیں چپکے سے کان میں کچھ کہہ جاتی ہیں۔جو کچھ اندلس کے تمام شہروں میں تھا،وہ اس ایک شہر میں اکٹھا ہو گیا تھا۔قرطبہ،اشبیلیہ،طلیطلہ،مرسیہ، جو شہر بھی سقوط سے دوچار ہوتا تھا اس کے مسلمان اپنا علم و فضل،ہنر،فن،تہذیب اور تعصب جو کچھ بچتا،اٹھا کر غرناطہ آجاتے تھے۔یہ مسلمانانِ اندلس کا آخری حصار تھا۔آخری بسیرا تھا۔اندلس کے تمام پھولوں کا رس اس ایک چھتہ میں جمع ہو گیا تھا۔

ابن خلدون نے قوموں کے بننے اور مٹنے کے اصول مرتب کیے۔قوموں میں مرض زوال کی علامات بیان کرنے والا ابن خلدون ان گلیوں اور بازاروں میں گھومتا رہا۔وہ اس شہر کے باسیوں میں اس مرض کی تشخیص کیوں نہ کر سکا؟ فلسفہ شہریت کے باوا آدم نے اپنی قوم کو اس کے انجام سے کیوں آگاہ نہ کیا؟ قد سے چھوٹا جُبّہ سر سے بڑا عمامہ علم و آگہی کا بوجھ وہ آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔وہ چلتا رہا..... میں دیکھتا رہا..... میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا..... اس نے گردن اٹھا کر دیکھنا چاہا تو بغل سے گٹھری نکل گئی۔ پہلے کتب بکھریں پھر ایک ورق ہوا میں اڑنے لگا۔تیز ہوا کا جھونکا آیا۔اُڑتا ہوا ورق کھڑکی سے ہو کر میرے سامنے آن گرا..... ''جہاں ذات اجتماعیت پر غالب آ جائے،ان شہروں میں ابن خلدون پیدا تو ہو سکتے ہیں،اس کے باسیوں پر اثر انداز نہیں ہوا کرتے''..... میں نے کاغذ اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔الحمرا کو جانے والی سڑک کے کنارے ابن خلدون مُردہ پڑا تھا۔دُور دُور تک نہ کوئی کتاب تھی اور نہ کسی کتاب کا کوئی ورق آوارہ!

حُسن کے دربار میں

ارضِ شرق کی سیاحت کے دوران ابن الحاج نے اپنے غرناطہ کے ہجر میں کہا۔

''کہتے ہیں غرناطہ کا قصرِ حمرا
لوگوں کو اپنا مشتاق بنالیتا ہے
اور دِلوں پر گرفت کرلیتا ہے
اے کاش ہمیں قصرِ حمرا کا طویل سفر نصیب ہو
ہمارے پاؤں گھس جائیں اور لنگ کرنے لگیں
ہمیں لنگڑا ہونے کی یہ خواہش اس لیے ہے
کہ ہم بابِ عدل کو کھٹکھٹائیں''

مشاقانِ قصرِ حمرا کے دلگرفتہ ہجوم میں خواہشیں دم توڑ دیتی ہیں۔اس کے نازک زاویوں، حساس جلووں اور پختہ جذبوں کو سمجھنے اور پرکھنے کی خواہشیں بے تعلق ہو جاتی ہیں۔ مدینۃ الحمرا کی کرخت سرخی مائل فصیل کے اندر پھیلے کھنڈرات و باغات کے ایک کونے میں قصرِ حمرا کا بچا کھچا حصہ خاردار جھاڑیوں میں کھلے سرخ گلاب کی مانند ہے تنہا اور اداس۔تنہا، اداس اور دلگرفتہ کرنے والے قصرِ حمرا کو جب بھی سمجھنا چاہا سوچ سمجھ کی دنیا تنگ پائی۔

مصری اہراموں، یونانی معبدوں اور یورپ کے شاہی محلوں کو دیکھ کر دل پر انسان کی کمینگی کا بوجھ محسوس ہوتا ہے ان فانی انسانوں کی لافانی اور عظیم بننے کی کوششوں پر ہنسی آتی ہے جو پتھر کی قوی الجثہ عمارتیں کھڑی کر کے سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ قوی اور قہار بن گئے ہیں۔قصرِ الحمرا کا ملکوتی حسن

بندے کے اپنے خالق پر یقینِ کامل اور اپنی صلاحیتِ تعمیر پر اعتمادِ کامل کا مظہر ہے۔اس کا ایک ایک ایوان اور دالان گھوم جائیں۔ دِل پر ان کے خالقوں کا رعب اور احساس پر ان کا دبدبہ مسلّط نہیں ہو جاتا۔ ہر کہیں ان کے فن کی نفاست اور جذبوں کے خلوص کا احساس ہوتا ہے۔قصر الحمرا تندرُو پہاڑ کے سیاہ سر پر چاندنی شب میں روشن برف ہے جو زمانے کی تپش سے محفوظ رہ گئی ہے۔قُبّہ و محراب اور در و دیوار پر سوسو انداز میں ثبت ''ولا غالب الا اللہ'' احساسِ آدمیت کو گہرا کر دیتا ہے۔ مرحلہ تعمیر میں اللہ کے لافانی اور اپنے فانی اس کے غالب اور اپنے مغلوب ہونے کے رویہ نے اس شاہکار کو ابدی معنویت سے روشناس کر دیا ہے۔

سیّاح جو قصرِ حمرا کی تاریخ کی نسبت اس کی تزئین سے غرض رکھیں اس مقام پر آنکھوں میں ٹھنڈک اور دل میں سرور محسوس کرتے ہیں اس کی داستانِ تعمیر و تذلیل کے قارئین تپش و یاس میں ڈوب جاتے ہیں۔احساس سنبھلیں تو فکر پشیماں فکر ٹھہرے تو احساس لرزاں۔

قصرِ حمرا کی موجود عمارتیں زمانی وحدت کی دعویدار نہیں پھر بھی مکانی اور معنوی وحدت کا شاہکار ہیں۔مختلف سطحوں پر رواں نہریں سبزہ و گل کے تختے باغات ایک ہی جسم کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ ایوانوں اور دالانوں میں رواں نہریں اس جسم میں خون کی شریانیں ہیں۔ یہ رنگین پتھروں میں سے گاہ ٹکرا کر نہیں گزرتیں ہر گاہ بچ کر نکلتی ہیں ان میں آبِ حیات بہتا نہیں جلوہ نما رہتا ہے مؤدب بے ساز بے آواز قدم بستہ۔

بنو نصر کا خوش بخت نوجوان الاحمر اندلس کے بد بخت مسلمانوں کے حصارِ آخریں کا تخیلاتی خاکہ بن رہا تھا تو اس کے تحت الشعور میں اس باغِ ارم کا نقشہ ہوگا، جو مدینۃ النبیؐ میں صدیاں قبل اس کے جدِ امجد نے چشمِ تصور سے دیکھا تھا اور جس میں رواں نہروں کے شفاف پانی میں اشجار آئینہ دیکھتے تھے جس کے باغوں میں طیور نغمے الاپتے تھے جس کے محلوں میں حسن خیمہ زن رہتا تھا اور جو بلند فصیل سے محفوظ کیا گیا تھا۔اس باغ کو جبلِ سبیقہ کے سنگین جسم میں اتارنے سے قبل الاحمر نے سبیقہ کو سنگِ سرخ کی بلند فصیل کی چار دیواری فراہم کی اس فصیل کے جسم میں جگہ جگہ برجوں کی مضبوط میخیں گاڑھ کر اسے سنگین چٹانوں کا حصہ بنا دیا۔آبِ رواں کے بغیر نہ باغ لگتے ہیں نہ باغِ ارم سجتے ہیں۔معمارِ الحمرا نے دریائے حدرہ کو لگام دے کر اس کی لہروں کا رخ سبیقہ کے جنم جنم

کے پیاسے وجود کی طرف موڑ دیا۔ جسم سبیقہ میں حدرہ کا خون دوڑنے لگا تو اس کی کوکھ ہری بھری ہوگئی، سُرخ دیوار سبز اشجار اور درمیان میں نازک مزاج قصر حمرا جس کی چھتیں، محرابیں اور در و دیوار نقوش رنگارنگ کے گل وثمر سے لدے ہوئے تھے۔ محل و محراب کا عکس نہر و تالاب کی شفاف سطحوں سے ہم کلام ہوتا تو قطعات و آیات چہرہ آب پر ثبت معلوم دیتے۔

مدینۃ الحمرا کے معماروں نے خشت دالانوں اور ایوانوں کی تعمیر میں لگا دی اور سنگ اس کے باسیوں کی عقل سلیم کے لیے محفوظ کر لیے۔ قلعہ بند مدینۃ الحمرا اور اونچے پہاڑی حصار میں گھرے غرناطہ کو دیکھ کر تعمیر اور تاریخ والے پریشان ہو جاتے ہیں۔ اتنی محفوظ اور مضبوط قوم مٹی تو کیسے؟ نہ بچی تو کیوں؟ تعصب اور طمع نے جب اس قوم کے اندر کا حصار فتح کر لیا تو جبل و حصار اس کا دفاع نہ کر سکے۔ قوموں کی فکر اور طرزِ فکر انہیں عروج عطا کرتے ہیں اور اندازِ فکر ہی انہیں الحمرا اور غرناطہ سے محروم کر دیتا ہے۔ زاویہ فکر بدل جائے تو تقدیریں پلٹ جاتی ہیں۔ الحمرا والے مٹ گئے الحمرا باقی ہے۔ اس لیے کہ فکر سے عاری اینٹ گارے سے بنا ہے۔

جب وہ تھوڑے تھے تو سب پر غالب آئے، سارے اندلس پر چھا گئے۔ جب بہت تھے تو سب مغلوب ہوئے اور سارے اندلس سے مٹ گئے۔

صحنِ حنا میں جھاڑیوں کے تراشیدہ سرمستی میں جھوم رہے تھے۔ مجھے مستی پسند نہیں۔ غرور کی بُو حنا کی مہک پر غالب آنے لگی تو آگے چل دیا۔ جامع الحمرا میں داخل ہوا تو فکر آوارہ اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوگئی۔ میں ایک مٹی گارے کی مسجد میں کھڑا تھا۔ کھجور کے تنوں کے ستون، کھجور کی چٹائیوں کی چھت۔ جبینِ ناز کو چومتی خاکِ فرش۔ خاک آلودہ سجدے جو ہمیشہ قبول ہوئے۔ اس منبر کے فیصلوں سے دشمنانِ محراب و منبر ہمیشہ کانپتے رہے۔ بنو نصر کے جدِ امجد نے اس مسجد و محراب کا ہر فیصلہ دل و جان سے قبول کیا تھا۔

جامع الحمرا کے سنگ و یاقوت کے فرش پر کئے گئے سجدے اور اس کے محراب و منبر کے فیصلے کتنے قبولیت کو پہنچے؟ بنو نصر کے فردِ آخر نے مسجد سے قوتِ فیصلہ چھین لی تو اسے دشمنِ محراب و منبر کا ہر فیصلہ قبول کرنا پڑا اور اس کے سجدے قبولیت کے مقام سے دور ہو گئے، کچے فرش پر سجدے کرنے والے ایک دنیا پر چھائے، سنگ و یاقوت کے فرش پر سجدے کرنے والے دنیا سے نابود ہو گئے۔ بنو

نصر کہاں سے چلے تھے کہاں تک پہنچے۔

فصیلِ مدینہ سے نکلتی جامع الحمرا کا فرش کھود دیا گیا ہے۔ گائیڈ فصیل سے باہر کو کھلتی کھڑکیوں کی طرف انگلی اٹھائے اس کھدائی کی وجوہ بیان فرما رہا تھا۔ ''دورانِ نماز مسلمان کہنیوں کے بل جُھک جُھک کر کھڑکیوں میں سے وادی میں پھیلے شہر کا منظر اور حُسن دیکھا کرتے تھے اور خالق کائنات کے معجزہ ہائے فن پر اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ہم نے فرش کھدوا دیا تا کہ سیاحوں کو شہر کا منظر دیکھنے کے لئے کہنیوں کے بل جھکنا نہ پڑے اور وہ کھڑے کھڑے بیرونی مناظر سے لطف اندوز ہو سکیں''۔ سجدوں والوں کے بعد نقوش سجدہ بھی مٹا دیئے۔ جامع الحمرا کی کھڑکیوں سے دیکھا تو ہر طرف شہر پھیلا تھا دُور دُور تک کلیسائیوں کے گھڑیال بردار میناروں کی جبینوں پر قدیم مسجدوں کے نشان روشن تھے۔

سقوطِ غرناطہ کے بعد فرڈی ننڈ کی ملکہ مسجد سے ملحق ایوان میں قیام پذیر رہی تھی۔ اس ایوان کا فرش اب بھی اصل حالت میں ہے اس کی بیرونی کھڑکیاں بھی فصیل سے باہر شہر کی طرف کھلتی ہیں۔ بیچاری ملکہ کو بھی کھڑکیوں سے آگے پھیلے حسین مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے کہنیوں کے بل جھکنا پڑتا ہوگا۔ ایک چوکور ایوان میں شفاف آبی چادر بچھی تھی۔ چادر کی طرف پاؤں اُٹھتے ہی ملکہ صبا کا انجام یاد آ گیا۔ یہ چادر بھی نشست گاہِ شاہی کی راہ میں بچھی ہے۔ کیا یہ بھی کسی ملکہ کے غرور کا سرِ دربار مذاق اڑانے کی خاطر بچھائی گئی تھی؟ مَیں اس کے پاس سے آگے نِکل گیا۔ ایسا نہ ہو سیاحوں کا مذاق بن جاؤں۔ نشست گاہِ شاہی کی مزین کھڑکیوں سے ٹکراتا ہوا ایک تیز ہوا کا جھونکا اِدھر سے گزرا تو آبی چادر کی پیشانی پر بل پڑنے لگے۔ اس کی نازک مزاجی میں اب تک فرق نہیں آیا۔ چہار سمت سے حسین و جمیل عمارتیں برائے غسل تالاب میں اتر آئی تھیں۔ شفاف چادر کے نیچے ان کے مرمریں جسم چمک رہے تھے۔ منقش ستون، محرابیں، قوسیں آئینہ دیکھ رہی تھیں۔ آبی چادر کے سنگ مرمر کے بارڈر سے آگے پھولدار پودوں کا بارڈر ہے۔

نشِست گاہِ شاہی کے دروازے کی دونوں طرف دو کرسیاں رکھی تھیں۔ سیاحوں کی جا گنگ کے مراحل میں، ہجوم خلق کے درمیان میں ایک کرسی میں دھنس گیا۔ دالان کے ایک طرف کے چار کمروں کی تعداد کی گائیڈ نے وضاحت کی۔ ''قرآنی تعلیمات کے مطابق بادشاہ کے لئے چار

شادیاں کرنا لازم تھا۔ان چار کمروں میں حکمران وقت کی چار بیویاں رہتی تھیں''۔کسی سیاح نے یہ پوچھنے کی جرأت نہ کی کہ اتنا عالیشان الحمرا بنوانے والے اتنے غریب تھے کہ دیوانِ خاص سے الگ اپنی بیویوں کے لئے باپردہ رہائش بھی فراہم نہ کر سکے؟ پہلی منزل کے کمروں کے بارے میں انکشاف فرمایا''جب بادشاہ کے بیٹے جوان ہو جاتے تھے تو وہ ان سب کو اتالیق سمیت ان کمروں میں مقید رکھتا تھا تا کہ وہ سب اس کی نظروں کے سامنے رہیں اور امراء سلطنت سے مل کر اس کے خلاف سازش نہ کر سکیں''۔گویا بادشاہ ہمہ وقت نشست گاہ شاہی پر ہی جلوہ افروز رہتے تھے اور ان کے ہر بیٹے پر باپ کے خلاف سازش تیار کرنا لازم ہوتا تھا۔وہ بیٹوں کو تو اس خوف سے مقید رکھتے کہ وہ ان کے خلاف سازش نہ کریں مگر ان کے اتالیق کو کس جرم میں سزا دی جاتی تھی؟ کیا انہیں اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مجرم اتالیق ہی دستیاب ہوتے تھے؟ نہ کسی نے پوچھا نہ مَیں نے ٹوکا۔ان کی روزی کا مسئلہ تھا اور ان کی قومی تاریخ کے تقاضے تھے۔تقاضے تو کچھ میری تاریخ کے بھی تھے مگر الحمرا پر میرا کوئی حق نہیں تھا میں خاموش سنتا رہا۔

ایوان الاسود کے پہلو کے ہال کے وسط میں ستم زدہ فوارے کے گرد سنگِ مرمر کا چوبچہ بنا ہے۔فوارے کا اُگلا پانی اس میں گرتا ہے اور پوشیدہ نالیوں میں معدوم ہو جاتا ہے۔خواتین و حضرات کی ایک ٹولی سرجوڑے گھٹنوں کے بل اس چوبچے کے گرد بیٹھی سنگ مرمر پر چھوٹے سے سُرخ دھبے کو دیکھ رہی تھی۔پھر وہ گائیڈ کے حکم پر دونوں ٹانگوں پر کھڑے ہو گئے۔اس نے کھلی کھڑکی سے پرے جنت العریف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہانی شروع کی۔''چیکو کی ملکہ بنی سراج کے ایک نوجوان سے خفیہ ملاقاتیں کرتی تھی ایک روز چیکو (ابوعبداللہ) نے ان دونوں کو اس بوڑھے سرو کے نیچے سرگوشیاں کرتے دیکھ لیا تو بنی سراج کے تیس سرداروں کو دعوت کے بہانے محل میں بُلایا اور اس ہال میں سب کو قتل کرا دیا''۔چیکو کے اس ظلم پر بڑی عمر اور چھوٹے دِل کی خواتین کی چیخیں نِکل گئیں۔کئی ایک نے تو نظر کے چشمے چڑھا کر گھٹنوں کے بل جُھک کر خون کے اس تاریخی دھبے کو پھر غور سے دیکھا اور بنی سراج کے سرداروں کے غم میں آہیں بھرتی ہوئی آگے چل دیں۔ایک روز میں اسی ہال کے وسط میں کھڑا تھا،ایک گائیڈ نے اسی انداز میں اپنے گروپ کے ارکان کو گھٹنوں کے بل جُھک کر سنگِ مرمر پر خون کا دھبہ غور سے دیکھنے کا حکم دیا اور جب وہ اس

مرحلہ سے گزر چکے تو اس نے انکشاف فرمایا کہ چیکو کے والد ابوالحسن نے ایک شادی ایک عیسائی دوشیزہ سے بھی کی تھی اور اس دوشیزہ کی محبت میں اس نے اپنی دیگر بیویوں سے جملہ اولاد کو اس ہال میں جمع کر کے ان کی گردنیں اڑا دی تھیں۔ابوالحسن کے ظلم کی داستان سُن کر ایک مائی چیکو کی درازیٔ عمر کی دعائیں کرنے لگی جس نے اتنے ظالم باپ کا خاتمہ کیا تھا۔ایک گائیڈ نے اس دھبہ خون کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ بنی سراج ابوعبداللہ (چیکو) کے ماتر بھائی کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔جب چیکو سازش کے ذریعہ الحمرا پر قابض ہو گیا تو اس نے بنوسراج کو اس جُرم کی سزا کے طور پر اس ہال میں بُلوا کر قتل کرا دیا تھا۔ایک کہانی یہ تھی کہ سلطان سعید نے سلطان محمد نہم کو اس ہال میں قتل کیا تھا یہ اس معصوم کے خون کا دھبہ ہے۔جس کسی نے جو کہانی سُنی سچ مان لی۔ابوالحسن کی جملہ اولاد یا بنی سراج کے تیس سردار اس ہال میں سروں کے بوجھ سے آزاد کیے گئے مگر ان کے خون کا صرف ایک ہی دھبہ باقی بچا؟ یہ کس گروپ کا خون ہے جو پانچ صدیاں گزر جانے پر بھی فیڈ نہیں ہوا،مَیں نے اس کی وجہ جاننے کے لئے اردگرد دیکھا اور مرمریں چوبچے کے کنارے گھٹنوں کے بل جُھک گیا۔چیکو یا اس کے والد محترم نے اتنی لاشیں اٹھوا دیں مگر خون کا یہ دھبہ صاف نہ کرا سکا؟ اسے کیا جلدی تھی؟ کون سی مشکل درپیش تھی؟ یہ فوارہ اسی ظلم کے دُکھ میں فوراً خشک ہو گیا ہو گا ورنہ اس کے قدموں میں پڑا یہ خون بھی دُھل جاتا اور آج کسی کو مسلمانوں کے ظلم کا علم بھی نہ ہو پاتا۔سیاحوں کی ٹولی کو آتے دیکھ کر مَیں پیچھے ہٹ کر در و دیوار کی مینا کاری اور سنگ کاری کا نظارہ کرنے لگا۔وہ ٹولی بھی اس فوارے کے روبرو جھکنے کے مراحل سے گزر چکی تو ان کے گائیڈ نے بلند آواز میں کہا''یہ سب بکواس کرتے ہیں یہ کسی کے خون کے دھبے نہیں مسلمانوں کے زوال پر یہ فوارہ سینکڑے سال اپنے عروج و زوال پر آنسو بہاتا رہا۔ویران قصر الحمرا سینکڑے سال تک غرناطہ کے آوارہ اور بدمعاشوں کا مسکن رہا تھا۔اس دور ویرانی میں کسی نے لوہے کا ٹکڑا پھینک دیا۔پانی اور ہوا سے زنگ آلود ہو کر وہ لوہا مرمریں فرش کو داغدار کر گیا تھا اور گائیڈ صدیوں سے اس زنگ کو بنی سراج کے سرداروں اور ابوالحسن کی اولاد کا خون بتا بتا کر لوگوں کو احمق بنا رہے ہیں''اس گروپ کی مائیوں نے طویل''ہائے''سے اس افسانہ طرازی پر غم و غصہ کا اظہار کیا۔

انہوں نے سیاحتی کتابچوں میں اس ہال کا نام ہی بنی سراج کا ہال رکھ دیا ہے۔

ہال پھر چند سیکنڈ کے لئے خالی ہو گیا۔ میں ایک کونے میں کھڑا رہا۔ شیروں کے ایوان میں نئے قہقہے گونجے۔ میں نے خروج سے پہلے اس ہال کا ایک دفعہ پھر جائزہ لیا تو محسوس ہوا روشنی کا سیلاب ہال کے اندر سے باہر کو بہہ رہا ہے۔ سیاہی باہر سے اُڑتی ہوئی اندر آ رہی ہے اور ہال کا دروازہ روشنی اور سیاہی کا مقامِ اتصال بن گیا ہے۔ ہال میں متحرک ہیولے اُڑتے پھر رہے تھے، پھر چھت کے گنبد کی اندرونی سطحوں پر قطار در قطار ''لا غالب الا اللہ'' ستاروں کی مانند چمک اٹھا۔ قہقہے اور بھی نزدیک ہو گئے تھے۔ گائیڈ کے نئی حکایت خوں شروع کرنے سے قبل میں باہر نکل آیا۔

شیروں کا صحن سنہری دھوپ میں چمک رہا تھا۔ میرے سامنے کے شیر نے آنکھیں بند کر لیں بقیہ گیارہ شیروں نے اس کی تقلید کی۔ اپنی پشتوں پر مرمریں تھال کا بوجھ لئے یہ پتھریلے شیر صدیوں سے پانی اگل رہے ہیں۔ مستطیل دالان کے وسط میں ابلتے فوارے کا پانی اس تھال میں گر کر بارہ شیروں کے جسموں میں سے ہو کر ان کے منہ کی راہ نیچے تالاب میں گرتا ہے۔ دالان کے طول و عرض میں بنی مرمریں نالیوں میں بہتا پانی بھی اسی تالاب میں آتا ہے اور وہاں سے زیر زمین نظام میں روپوش ہو جاتا ہے۔ ان شیروں کے قد کاٹھ اپنے ہاں کی بکری کے برابر ہیں شباہت سے بھی شیر کی دہشت نہیں ٹپکتی بس منہ سے پانی اُبلتا رہتا ہے۔ مَیں نے ایک شیر کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کی آنکھوں میں چمک لوٹ آئی۔ اس نے دہاڑنے کے لئے منہ کھولا تو پانی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔

مرمریں تھال کے کناروں پر ابن زمراق کے شعر کندہ ہیں اس کا کہنا ہے کہ یہ شیر سلطان محمد پنجم کے احترام میں بکریاں ہو گئے تھے ورنہ یہ گستاخ اور بے ادب بھی شیروں کی مانند ہی دھاڑتے اور چیرتے پھاڑتے تھے۔

مستطیل دالان کے چار طرف برآمدہ ہے اس کے تنگ پہلوؤں میں آگے نکلے ہوئے، حسین پویلین ہیں صدیوں سے برآمدوں اور پویلین کا بوجھ سہارے رشکِ سرو نرم و نازک مرمریں ستونوں کے جنگل میں گھری خالی جگہ میں رنگ رنگ پھول کھِلے تھے۔

''تعریفیں اسی کے لئے ہیں جس نے سلطان محمد کو اتنا حسین اور عظیم محل عطا کیا۔

اس گلشن سے حسین تر چیز کی تخلیق خالق کائنات کو بھی منظور نہیں''۔

ابن زمراق کے مطالب پر غور کیا تو مشاہدہ نے اس کی تصدیق کر دی۔ دالان کی تنگ دامانی میں شدید احساسِ وسعت، تعمیر و تزئین کے مقام کمال پر پیدا ہونے والا تحیر، دل نے حواس کی تنگ دامانی کا شکوہ کیا۔ اسی وصف کی بدولت یہ دالان چہار عالم میں غرناطہ کی شناخت بن گیا ہے۔ اہلِ فن ثبوتِ ذوق کے طور پر اس کی تصاویر اور ماڈل سجاتے ہیں۔ عروجِ علم و فن کے باوجود اس کی نقالی میں کہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ سلطان محمد پنجم نے البازین کے محلّہ میں اسی طرز پر ایک ہسپتال بھی بنوایا تھا خالق خاک ہوئے تو یہ ہسپتال خاک در خاک ہو گیا۔

ابنِ زمراق نے کبھی سوچا بھی ہو گا کہ اس کے سلطان اور قوم پر خالق کی یہ عطاء ایک وقت اہلِ نظر کے لئے نشانِ عبرت بن جائے گی؟ مرمریں ستونوں کے سروں پر سرنگوں منقش محرابوں اور شاہی مسکنوں کے چشم و ابرو پر ثبت ''ولا غالب الا اللہ'' پھیل کر دالان، قصر الحمرا اور نظر کی حدود سے بے پایاں ہو گیا۔ حُسن احساس کی گرفت اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوا تو میں شیروں والے فوارے کے پاس واپس آ گیا۔ پانی اسی رفتار اور انداز میں اُبل رہا تھا۔

''فلک کے چاند اور ستارے جب راتوں کو الحمرا کے حسن پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس پر رشک کرنے لگتے ہیں''۔

مَیں الحمرا کے شاعر کے مقدر پر رشک کرنے لگا جس نے رشکِ قمر قصرِ الحمرا دیکھا اور محسوس کیا۔ مجھے اس کے حُسن کے بیان پر قدرت رکھنے والوں پر رشک آنے لگا۔

ایوان الاسود کے شرقی ہال میں روشنیاں اور سائے اس طرز پر منقسم ہیں کہ صدیوں سے کبھی ایک دوسرے سے ہمکلام نہیں ہوئے۔ جامع الحمرا کی جگہ کلیسا بننے تک یہ ہال فاتحین کا کلیسا رہا تھا۔ مسلم دور میں یہ کس مصرف میں ہو گا؟ جس کے دِل میں جو آیا لکھ دیا۔ کسی نے ایوان انصاف کہا کسی کو یہ ایوان مہمانداری معلوم ہوا۔ ہال کے آخری سرے پر مستطیل اور مربع کمرے ہیں۔ ان میں سے ایک کی چھت پر بنی نصر کے دس حکمرانوں کی تیغ بکف رنگین تصاویر بنی ہیں۔ بغلی کمروں میں ایک عربی شاہسوار اور عیسائی نائٹ کی ایک عیسائی دوشیزہ کے حصول کے لئے لڑائی کے مناظر بنے ہیں۔ محبت کی اس لڑائی میں عرب سردار فتحیاب ہوتا ہے اور دوشیزہ اس کی ہو جاتی ہے۔ گائیڈ ان

تصاویر سے اندازہ کرتے ہیں کہ ان کمروں میں تشریف فرما مہمانانِ شاہی ایسی لڑائیوں اور فتح کے واقعات کا تبادلہ کرتے ہوں گے وُہ حسن جامد کی تخلیق میں اپنا حصہ ڈالنے کی خاطر سیاحوں کو اشکال کی مصوری سے مسلمانوں کی لاتعلقی کا یقین دلا کر انکشاف فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے قصر الحمرا بنا تو خود ہی لیا تھا مگر تصاویر عیسائی فنکاروں سے بنوائی تھیں مرحلۂ تعمیر میں دیواریں اُٹھ چکیں تو ماہرین نے کمروں کے سائز کی لکڑی کی کشتیاں بنوائیں پھر ان کشتیوں کو دیواروں پر الٹ دیا کشتی اور دیوار کے سنگم پر چوبی کالر لگائی۔ کالر پر نقش ونگار بنا دیئے پھر الٹی کشتیوں کی اندرونی سطح پر اسی انداز کے نقوش کندہ کر کے دیوار اور لکڑی میں دوئی کا احساس مٹا دیا گیا۔

حرم شاہی کے کسی بھی کمرہ سے دالان کی طرف نظر اٹھائیں تین شیر آپ کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ سُنا تھا نظر اٹھاتے ہی محسوس ہوتا ہے۔ تینوں شیر تھال کے بوجھ سے آزاد ہو کر آپ پر حملہ آور ہونے چل پڑے ہیں۔ مَیں آگے چلتا رہا شیر اپنی جگہ کھڑے رہے، وہ تھال کے بوجھ سے تو آزاد ہو جاتے مگر زمین نے ان کے پاؤں پکڑ لئے تھے۔ وہ شیر اسی زمینی گرفت کی بدولت صدیوں سے باقی ہیں۔

''مسلمان حکمرانوں کے حرم میں سینکڑے خواتین ہوتی تھیں۔ اس محل میں بھی یقیناً اس روایت کی پابندی کی جاتی ہوگی۔ آپ چشم تصور سے ان حسین وجمیل سینکڑے خواتین کو گھومتے پھرتے دیکھنے کی کوشش کریں۔ عربی لباس اور شاہی آداب کے ساتھ''۔ ''لیکن اس محل میں تو چار بیویوں کے لئے بھی کافی جگہ نہیں۔ ان سینکڑے خواتین کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہی یہاں بند کرتے ہوں گے''۔ گائیڈ کے پاس نوجوان خاتون کے اعتراض کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مسلمان اور اسلام کے اس دھرتی سے نابود ہوئے صدیاں بیت چکیں مگر، سپین کے عیسائیوں کے ذہن ابھی تک تعصب سے لبریز ہیں اور وہ اسلام اور قرآن پر حملہ کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

دالان کے شمالی سمت کے پہلے کمرے کا نام ''ماہرین'' نے دو بہنوں کا ایوان رکھ دیا ہے ان کے مطابق اس میں دو بہنیں صدیوں سے فوارے کے پاس فرش نشین ہیں۔ محل وایوان اور ان کے معدوم باسیوں کے بارے میں ہر روز نئی نئی کہانیاں سُنتی ہیں پھر بھی لب کشا نہیں ہوتیں۔ سینوں

میں صدیوں کے راز لئے تغیر دوراں کے ستم برداشت کرتی ہیں۔ مسلم دور میں یہ بہنیں حرم سرا میں کیا خدمات انجام دیتی تھیں، کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ بس ان کے حسن اور قد وقامت نے انہیں اعزاز شاہی بخشا تھا جو شاہوں کے بعد بھی قائم ہے۔ بہنوں کی یہ جوڑی پندرہ پندرہ فٹ طویل اور ساڑھے سات سات فٹ عریض بے داغ سنگِ مرمر کی دو سلیں ہیں جو بے مثل بتائی جاتی ہیں ان کے پاس کھڑے ہو کر مزارِ عظمت کے در و دیوار پر پہلی نظر ڈالنے سے ہی ان کے مرتبہ کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ تزئین آرائش، تناسب۔ یہ کمرہ حیرت کدہ ہے چھت سے فرش تک رنگ ونور حسن وزیبائش ایک دوسرے میں معدوم ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے تقدس کی حفاظت کرتے ہیں۔ ابن زمراق کے دیوان کے اوراق پوری حرم سرائے میں بکھرے ملتے ہیں۔ اس حیرت کدہ میں خوش رنگ ٹائلوں کے بارڈر کے اوپر بھی یہی اوراقِ پارینہ پیوست ہیں۔ ایک بوڑھے امریکی جوڑے نے اوپر کی منزل کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا ''اوپر کی منزل دیکھنا نہ بھولئے گا''۔

''شکریہ میں پہلے سلطانہ کی آنکھ سے حرم سرا کو غرق تالاب ہوتا دیکھ لوں۔''

''حسن، رحمت اور بارش ہمیشہ آسمانوں سے نازل ہوتے ہیں۔ الحمرا میں نزول کے دوران ان کا وافر حصہ اس اوپر کی منزل میں ہی رُک گیا تھا''۔ وہ میرے ساتھ ہی دوہری کھڑکیوں والے کمرے کے بیرونی برآمدہ میں آن کھڑے ہوئے جس کے بارے میں حیرت زدہ ماہرین تعمیر کہتے ہیں کہ یہ کسی ماہر تعمیر نے کانڈی تیسی سے نہیں تعمیر کیا بلکہ اس کے در و دیوار کسی سنار اور ہاتھی دانت پر نقش ونگار بنانے والے نے اپنے نازک اوزاروں سے تخلیق کئے ہیں۔ ایک خاتون کرسی پر بیٹھی بیرون دالان کا منظر فلم پر مقید کرنے میں مصروف تھی۔ امریکی بوڑھی نے ناک سکیڑ کر اپنے بزرگ سے کہا ''سلطانہ تو فرش پر گاؤ تکیہ لگائے ہر طرف پھیلے حسن کا نظارہ کرتی تھی نا؟''۔

''ہاں بالکل'' بزرگ نے تائید میں سر ہلایا۔

''اسی لئے تو اس بالکونی کو سلطانہ کی آنکھ کہتے ہیں۔''

''ہاں بالکل۔''

''پھر یہ کرسی پر بیٹھ کر کیوں تصویر بنا رہی ہے۔''

''اس لئے کہ ریشمی قالین اور گاؤ تکیہ تو سلطانہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ یہ ننگے فرش پر تو نہیں بیٹھ سکتی نا؟'' پھر میری طرف دیکھ کر بوڑھے نے معذرت کی ''آئی ایم سوری۔ میں صرف اسے خوش کرنے کے لئے کہہ رہا تھا ورنہ ابوعبداللہ اپنے ساتھ قالین اور گاؤ تکیہ کیسے لے جاسکتا تھا؟''

اس کی مائی پہلے انکشاف کی نسبت دوسرے بیان پر زیادہ خوش ہوئی۔ امریکن بوڑھیوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا وہ کس بات پر خوش ہو جائیں گی۔

''سلطانہ کی آنکھ'' کی چھت کی آئینہ بندی سامنے کے تالاب میں اترتی تو سطح پر رنگ رقص کرتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ اردگرد کیاریوں میں پھولوں پر وجد طاری ہو جاتا تھا۔ ابنِ زمراق کے شعروں کا تالاب گردِ دوراں سے اٹ گیا تو فاتحین نے اس خاک میں اپنی چاہت کے پھول پودے پیوست کر دیئے اس باغ کا نام بھی ''سلطانہ کی آنکھ'' پڑ گیا ہے۔ باغ کا فوارہ سلطانہ کی آنکھ اور زمراق کے شعروں کی جدائی میں آہیں بھر رہا تھا۔ اس کے آنسوؤں سے پوری فضا نمناک ہو رہی تھی۔ پھولوں کی نازک پتیوں پر پانی کے قطرے بھی افسردہ تھے۔ میں ان روشوں پر آہستہ آہستہ چلتا رہا اس باغ کے تصور میں کھو گیا جس کے بارے میں شاعر نے کہا تھا ''یہ باغ اتنا حسین ہے کہ اس کے پھولوں پر آسمان کے ستارے بھی رشک کرتے ہیں۔ شفاف پانی کے ان حوضوں کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ کوئی چیز نہیں۔ صرف صاف آسمان پر چمکتا پوری رات کا چاند ہی ان کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے''۔ باغ میں چلتے ہوئے ماحول کی اسراریت اور اُداسی اپنی ذات کا حصّہ محسوس ہوتے ہیں حرم سرائے شاہی کے حُسنِ جامد کے پہلو میں مقید اداسیوں سے نکل کر ایک منقش راہداری میں داخل ہوا تو سامنے ایک بار پھر وہی عمارت آن کھڑی ہوئی۔ ایوانِ شاہی جس کے در و دیوار تاریخ کے سنہری اور سیاہ ابواب ہیں، واپس مُڑنا چاہا تو نچلی سطح پر ایک مقید باغ نظر پڑا۔ سیڑھیاں اُتر کر نیچے چلا گیا۔ اس صحن میں ایک میانہ درجہ کے کمرے کے دروازے کھلتے ہیں جس کے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ ماہرین جدید نے ان کمروں کو ایوان شاہی کے باتھ روم قرار دیا ہے جن کے ساتھ ایک ریسٹ روم بھی ہے اس کے قبہ میں سے مدھم سی روشنی چھن چھن کر نازل ہو رہی تھی۔ خاموشی، ٹھنڈک، اندھیرے اور مدھم روشنی میں خیمہ زن ٹسکون دل نے کہا اگلی منزل پر روانگی سے پہلے یہاں قیام لازم ہے۔ گرم حمام سے رُوح اور جسم پر جمی افسردگی

کی کائی دھو ڈالیں۔ سیاحوں کی مانند ذہن کی سلیٹ صاف لے کر حُسن و رعنائی سے لطف اندوز ہوں مگر مرمریں فرش کے نیچے دفن تانبے اور جست کے گرم اور سرد پانی کے صدیوں پرانے پائپ تھکے ماندے مسافر کی خواہش پوری کرنے سے قاصر تھے۔ مسلمانوں کے اخراج کے ساتھ ہی پانی کی فراہمی کا زیرِ زمین نظام بھی مردہ ہو گیا تھا۔ اس کا جسدِ خاکی برائے نمائش رہ گیا ہے جسے سندھی اجرک سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ یہ اجرک صاف کی جائے تو اس کی ٹکڑیوں میں چمک آ جاتی ہے۔ کمروں کی دیواریں بھی اسی قسم کی اجرکوں سے مزّین ہیں۔

مدینۃ الحمرا میں قدیم ترین عمارت سلطان محمد سوم کے محل کا ایک حصّہ ہے۔ ایک وسیع حوض کے شمالی کنارے کو چھوتا ہوا پانچ دروازوں کا ایک برآمدہ اس کے پیچھے فصیل سے باہر نکلی گہری وادی میں اُگے سرسبز درختوں کے سروں کے اوپر معلق بالکونی اور برآمدے کی چھت کے ایک کونے میں ایک ہال، باقی ہیں۔ یہ شاہی رہائش طویل عرصہ تک نجی قبضہ میں رہی تھی۔ اِس کے چہرے پر وقت کے قدموں کے گہرے نشان ہیں۔ جہاں کہیں غازہ باقی ہے وہ اس کے حسنِ رفتہ کی گواہی دیتا ہے۔

لکڑی کی چھت پر بے مثل نقش و نگار بنے ہیں اس سے ملحق ایک خستہ حال مکان میں مسلم دور کی تصاویر کے آثار ہیں۔ شکار کے مناظر۔ فوجی مہم کی روانگی اور فتح کے بعد جنگی قیدیوں سمیت واپسی۔ محل سے تھوڑے فاصلے پر فصیلِ مدینہ سے چمٹی ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ لاکھوں کروڑوں سجدوں کی امین، دُعاؤں اور التجاؤں کا یہ مرکز بڑے سالوں رہائش کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ خدا کا گھر اس کی مخلوق کا گھر بنا تو اس نے اس میں بشری ضرورتوں کے مطابق ردوبدل کیا۔ مگر محراب اور اندازِ محراب نہ بدل سکے۔ بندے خدا کو اس کے گھر سے پوری طرح خارج نہ کر پائے۔ مسجد کی دیواروں کے بیرونی نقوش کی وضاحت کرتے ہوئے ایک گائیڈ بتا رہا تھا کہ شاہی محل کے ساتھ مسجد کا عکس بھی اس تالاب میں پڑتا تھا۔ معماروں نے ان پر بھی نقش و نگار بنا دیئے تاکہ پانی میں محل کے عکس کا حسن متاثر نہ ہو۔ تالاب کے کنارے پتھر کے دو شیر رکھے ہیں۔ یہ مسلم دور کے غرناطہ کے ہسپتال سے اُٹھا کر لائے گئے ہیں۔ تالاب سے آگے خوبصورت وسیع باغ ہے جس کے درمیان سے جنت العریف کے لئے راستہ بنا دیا ہے۔ راستہ سے ملحق ذرا بلندی پر بہت سے کھنڈرات ہیں۔ کھنڈرات ہی کھنڈرات ہیں۔ محل و مینار کے ان مزاروں پر قدرت نے پھولوں

اور پھولدار جھاڑیوں کی چادریں ڈال دی ہیں۔لکڑی کے کھوکھے میں مسکراتی خاتونِ اندلس سیّاحوں کو آئے ہواس بازار میں کچھ ساتھ لے چلو' پر آمادہ کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ میں اتنا کچھ ساتھ لے چلا تھا کہ کوئی کتاب تک اٹھانے کی سکت نہ تھی۔صدیوں پر پھیلی تاریخ عروج وزوال۔انسانوں اور حکمرانوں کی کمزوریاں اور خوبیاں مقاماتِ عبرت محلاتِ عشرت اس بازار میں ساتھ لے جانے کو اتنا کچھ ہے کہ دامن کی تنگی کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ امریکی جوڑا شاید پہلے سے کھڑا خاتونِ سیاحت سے کھنڈرات کی کہانیاں سُن سُن کر حیران ہورہا تھا۔میں مسجد کی طرف نکلنے لگا تو مائی نے دیکھ لیا۔

''اس کے پاس زبانی کہانیاں بھی ہیں''۔اس نے مجھے خبردار کرنا چاہا۔

''آپ ٹیپ کرلیں مَیں آپ سے سُن لوں گا۔''

بوڑھے نے صرف مسکرا کر مذاکرات میں مداخلت کی۔سیّاحوں کی ایک اور ٹولی آ گئی تھی خاتون انہیں الحمرا اور غرناطہ کے ویڈیو کیسٹ دکھانے لگی۔ مائی نے اپنے بابے کی توجہ مسجد کی محراب کی طرف دلائی۔''یہ بُرج تو نہیں؟ ہے نا؟''

''یقیناً نہیں''اس نے سرہلایا۔

وہ گائیڈ بک کھول کر نقشے میں اس کھنڈر کا نمبر تلاش کرنے کے لئے رُکی تو بابے نے چلتے رہنے کا مشورہ دیا۔''تیز چلو جھاڑیوں سے نکل کر کسی موریؔ آوارہ رُوح بغلگیر ہوگئی،تو میرے لئے تمہیں چھڑانا ممکن نہیں ہوگا''۔

مائی نے مسکرا کر اُندلسی حسینہ کی طرف اشارہ کیا''وہ مجھے چھڑالے گی آپ فکر نہ کریں۔''

اس کے باوجود بابا فکرمند ہونے لگا تھا اور میں ان کا انتظار نہیں کرسکتا تھا۔مسجد کی کھڑکیوں سے ہوا ٹکراتی تو محسوس ہوتا''حیَ الصلوٰۃ،حیَ الصلوٰۃ'' کی صدا آ رہی ہے۔مَیں نے دروازے پر جوتا اتارنا چاہا۔امریکی بابے نے منع کردیا۔''فرش پر پاؤں زخمی ہوسکتے ہیں''۔مائی نے سفر میں پاؤں کا خیال رکھنے کا مشورہ دیا۔

مسجد کے اندر سامنے کی دیواروں پر تحریروں کے بقایاجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کبھی درود اور آیاتِ قرآنی سے مزین ہوتی ہوں گی۔جگہ جگہ سے پلستر اور رنگ اتر جانے سے تحریروں کا

تسلسل ٹوٹ گیا ہے۔امریکی بابا محراب سے باہر کھڑا رہا شاید وہ میرے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ مائی حسبِ توفیق عربوں کے فنِ تحریر کی تعریف میں مصروف رہی۔وہ دونوں حسن کی دریافت اور تحسین کے عادی معلوم ہوتے تھے اور گائیڈوں کی جھوٹی سچی معلومات کی جگالی کی مدد سے الحمراء دیکھنے کی بجائے وہ اپنی عقل اور فہم استعمال کرنے کے عادی تھے۔

جبلِ سبیقہ اور جنت العریف کو ملانے والے پل کو وہی سیّاح چھوتے ہیں جو آزاد ہوں۔ ترجمانوں کے قیدی کھنڈرات شروع ہوتے ہی باب العدل کے سامنے کھڑی گاڑیوں کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔واپسی پر چارلس پنجم کا محل عجائب خانہ والا کلیسا دیکھ کر اپنی اپنی کتابوں پر''دیکھ لیا'' کے نشان لگا لیتے ہیں۔مَیں نے بھی ایک روز یہ حصّہ صرف دیکھ لیا تھا۔میں کھنڈرات سے آگے بھی فصیل کے ساتھ چلتا رہا جس کی کمر پر کجاوے کی مانند لدے بُرج ماضی کے جھروکے ہیں۔الحمرا کے بارے میں سیاحتی کتب میں ان سب سے عجیب وغریب داستانیں وابستہ کرکے سیّاحوں کو ان کی طرف مائل کیا جاتا ہے لیکن ان کا حال ایسا ہے کہ وہی سیّاح ان میں دلچسپی لیتے ہیں جن کا ماضی ان سے وابستہ ہو۔ میں ایک ایک بُرج گھومتا رہا ایک ایک کنگرے کو چھو کر دیکھا غرناطہ پر قابض فرانسیسی افواج نے ہنگامۂ حزیمت میں جبلِ سبیقہ کے ماتھے کا جھومر اڑا کر اسے داغدار کرنا چاہا تو ایک مقامی سپاہی نے بارود کا جلتا ہوا فلیتہ کاٹ کر الحمرا کو بچالیا تھا۔حکومت کو اس کے حسن اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کا اندازہ ہوا تو اس نے اسے محفوظ کرنے کی ضرورت محسوس کی لیکن اس ضرورت پر بھی زورانہی حصّوں تک دیا جارہا ہے جہاں تک حُسن قائم ہے۔ان برجوں کے اجزاء کا رابطہ باہم اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ ہاتھ لگانے سے جالیاں اور تحریریں الگ ہو جاتی ہیں۔ ہوٹل واشنگٹن ایروِنگ کے پاس نوادرات کی دکانوں میں ایسی جالیاں منقش ٹائلیں اور خطِ کوفی کی تحریروں کے پورے پورے ٹکڑے برائے فروخت موجود تھے لیکن ان کی قیمت اتنی زیادہ تھی کہ تمام امریکی سیّاح بھی نہیں خرید سکتے تھے۔دِل میں آیا ایک جالی بیگ میں رکھ لوں۔دماغ نے کہا اس زمین پر یہی نشانیاں ہیں انہیں دستِ دوست نہیں دستِ دشمن ہی بے نشان کرسکتا ہے۔میں نے فرش پر پڑے ٹکڑے بھی اُٹھا کر سوراخوں میں جڑ دیئے۔کسی غیر مسلم کے ڈرائنگ روم میں تو یہ اسلامی اندلس کی نشانیاں ہوں گی۔مسلمان کے تو دل میں انہیں محفوظ رہنا چاہئے۔

شنیل کنارے

مسلم اندلس کے شعراء دریائے شنیل کو ہزار نیل کے برابر باندھتے رہے ہیں۔ سنہری وادی کبانیہ میں سے جھوم کر بہتے شنیل کے کناروں پر چالیس میل تک باغات، محلات اور زرعی فارم پھیلے ہوتے تھے۔ فراعنہ مصر کے دَور میں بھی نیل کے کنارے چودہ ہزار محل اور ساڑھے چھ لاکھ فارم نہ دیکھ سکے ہوں گے۔ اہل غرناطہ نیل پر اور اپنے شنیل کے قصیدے لکھا کیے۔

دل میں وہی شعراء اور تاریخ کا شنیل موجزن تھا آنکھ اس کی جستجو میں پریشاں تھی مگر وہاں محلات نہ تھے نہ باغات نہ کہیں کوئی شفاف چہرہ آبجو نہ کوئی محبوب شیوہ سرو نہ جام بدست شاعر نہ تیغ بکف جوانمرد۔ کچھ بھی نہ ملا اُونچی ٹیڑھی میڑھی جگہ میں جگہ سے شنیل کی تہہ میں گدلا پانی مٹی گارا اور اینٹ پتھر ہی نظر آئے کیا اخراجِ مسلم پر اس زمین پر علم و فضل کے چشمے خشک ہو گئے تو کیا ان کا شنیل بھی لہر لہر ہار گیا تھا؟

دیدارِ شنیل کی خواہش پر مرزا یعقوب مُسکرا دیا تھا۔ تلاش شنیل میں ناکامی پر وہ اور اس کا اندلسی دوست گاڑی میں بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ مَیں پٹڑی پٹڑی چلتا رہا۔ گم گشتہ نقوش شنیل ڈھونڈتا پھرا۔ کئی جگہ پانی تک پہنچنے کی کوشش کی۔ جگہ جگہ سے خاک اُٹھا کر پیشانی سے لگائی بار بار مٹی پر فاتحہ پڑھ کر اسے خاموش لہروں پر نچھاور کیا۔ اندلسی نوجوان میری حرکات پر حیران ہوتا رہا۔ مَیں مرزا کی مسکراہٹ پر سوچتا رہا۔ ''یہ بھی نہیں جانتا کہ اس دریا نے مسلم اندلس کی غیرت اور شجاعت کے نشان آخری کو اپنی آغوش میں پناہ دی تھی؟ اسے بھی علم نہیں کہ اسی مٹی کو اندلس کے

موسیٰ کے پاؤں آخری دفعہ چومنے کا شرف حاصل ہوا تھا؟ نیل نے پیغمبر موسیٰ کی قوم کو سلامتی کی راہ دی تھی تو شنیل نے جرنیل موسیٰ کی غیرت اور حمیت کی حفاظت کی تھی۔ پیغمبر کی قوم کے تعاقب میں فرعون کی افواج تھیں اور جرنیل کی حمیت کا تعاقب فرڈیننڈ کی افواج کر رہی تھیں۔ حُکم خداوندی سے مصر میں نیل کی طوفانی لہریں دیوار بنیں تو اندلس میں شنیل کی موجیں ڈھال بن گئیں۔ جان کی نسبت آن کی حفاظت مشکل تر ہے۔ اس کے لئے ایک کی نہیں ہزار نیل کی ضرورت ہوتی ہے۔

غرناطہ کی ایک پہاڑی پر کھڑا ایک قدیم محل اس شہر اور مُلک کی داستانوں کا پسندیدہ موضوع ہے۔ پُرانے بوڑھے آج بھی بچّوں کو اس محل کی کہانیاں سناتے ہیں۔ نئی نسل اب تک اس سے وابستہ سحر پر ایمان رکھتی ہے۔ ارض غرناطہ کے ایک حکمران نے زمانہ قدیم میں یہ محل تعمیر کروایا اور اس کے سب سے اُونچے برج کی چوٹی پر ایک شہسوار کا کانسی کا مجسمہ معلق کرایا۔ نیزہ تانے زرہ بکتر لگائے مجسمہ عربی شاہسوار ہمہ وقت مستعد رہتا تھا۔ ہوا کی خفیف سی آہٹ پر گھوم جاتا تھا۔ دن رات وادیوں اور ان سے آگے پہاڑی راستوں کی نگرانی کرتا رہتا تھا۔ سینکڑے میل سے دشمن قدموں کی آہٹ پا کر تیغ زنی اور نیزہ آزمائی میں مصروف ہو جاتا تھا۔ بالغ نظر حاکم نے مستعد مجسمہ کے قدموں میں اہلِ فکر کے لئے ابوجبوس کا قول موٹے الفاظ میں کندہ کرایا تھا ''مُسلمانانِ اندلس صرف اسی طریق سے اپنے دشمنوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں''۔ مُسلمانانِ اندلس اسی طریق سے صدیوں اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرتے رہے تھے۔

ایک سہ پہر میں الحمرا کے قبۃ الوسطیٰ کے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ ترجمان اپنے اپنے حصّہ کے سیاحوں کو دانش عرب کے اس مرکز کی تزئین و آرائش کی باریکیاں سمجھا رہے تھے اس کے در و دیوار پر کے سنہری اور روپہلی نقوش پر لیکچر دے رہے تھے ''اس چھوٹے سے کمرے میں بیٹھنے والوں نے اپنی فراست اور شجاعت کی بدولت پُوری اڑھائی صدیاں یورپ کی قوت کا مقابلہ کیا تھا اگر آپ دیکھ سکیں تو ان دیواروں پر سیادت اور سفارت کے بھی نہایت اعلیٰ نشانات ملیں گے''۔ گائیڈ اپنے گروہوں کو الحمرا کے دُوسرے حصّے دکھانے اور ان سے وابستہ کہانیاں سنانے چلے گئے تو مَیں ان دیواروں پر فراست اور سیادت کے نقوش تلاش کرنے لگا۔ جاندار نقوش فراست مدھم

ہوتے ہوتے اوجھل ہو گئے اور مَیں لال قلعہ دہلی سے ہوتا ہُوا مقبرہ ہمایوں تک پہنچ گیا جس کے ایک کونے میں ہندوستان کی عظیم مغلیہ سلطنت کا آخری ''شہنشاہ'' سر جھکائے جلوہ فرما تھا، اس کے پہلو میں ملکہ عالیہ تھیں۔ پس پشت ہندوستان کی مسلم سلطنت کا آخری جرنیل حمیت اور ہمت کا تاج لئے ''شہنشاہ'' کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس سر میں کوہ نور کا بوجھ اُٹھانے کی ہمت نہ رہی تھی اسے حمیت کا عظیم بوجھ اُٹھانے پر آمادہ کر رہا تھا۔ روبرو شہنشاہ معظم کے دربار میں مرزا الٰہی بخش انگریز بہادر کی بلند بختی اور بلند کرداری پر اعتماد کی درخواست پیش کر رہا تھا۔ وہ انگریز بہادر کے وعدوں سے ملکہ اور شہنشاہ کو اچھی طرح آگاہ کر چکا تو بخت خاں نے تلوار کے دستہ کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے اذن گویائی حاصل کیا۔ شہنشاہ ہند کو غیرتِ تیمور یاد دلائی۔ شہنشاہ کو فراست و شجاعتِ آلِ تیمور کے قصے سنائے۔ انگریز اور اس کے ایجنٹوں کی عیاری اور مکاری سے باخبر کیا۔ ''جب موت ایک ہی بار آنی ہے تو شہادت سن کر کیوں نہ آئے۔ میدان جنگ میں آپ حمیت تیموری بچا لیں گے۔ مُسلمانانِ ہند کو اس آزمائش میں سرخرو بھی کر سکتے ہیں۔ انگریز کے وعدوں کے جال میں پھنس گئے تو نہ جان بچے گی نہ آن رہے گی۔ ملت مذہب اور آلِ تیمور سے محبت ہے تو میرے ساتھ چلیں۔ نصرانیوں کے ایجنٹوں اور ان کے وعدوں پر یقین کر کے اپنی قوم اور مساجد ان کے سپرد نہ کریں۔ نصرانی وہ قوم نہیں جو عہد پورا کرنے والی ہو۔''

ملکہ عالیہ نے ''شہنشاہ'' کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے بخت خاں کی درخواست اور تاریخ مغلیہ سے نظر پھیر لی اور الٰہی بخش مسکرا دیا۔ بخت خاں مقبرہ سے باہر آیا تو اکیلا تھا۔ مرزا الٰہی بخش مقبرہ ہمایوں سے نکلا تو اس کے ہمراہ ایک شاہی جلوس تھا۔ وہ عظمت اور آبرو کی منزلوں کی طرف گیا۔ یہ ذلت اور رسوائی کی راہوں پر نکلے۔ بنو نصر کے ابوعبداللہ نے خاندان تیمور میں جنم لیا ہوتا تو بہادر شہ ظفر نام پاتا۔ غرناطہ کا موسیٰ دہلی میں بخت خاں کہلایا قرطبہ کی ملکہ عالیہ دہلی میں آ کر بھی ملکہ عالیہ ہی بنی۔

غرناطہ کی جامع الکبیر سے اذان کی آواز بلند ہُوئی۔ علماء فقہا، طلباء ٹولیوں میں سوئے مسجد رواں تھے۔ شہر کی گلیوں اور بازاروں شہر پناہ کے برجوں اور دَروازوں پر پہرہ دینے والے نوجوان میدان جہاد میں سربسجود ہونے لگے۔ بیبیاں جو شب بھر اپنے اپنے خاوند بیٹوں اور بھائیوں کی

سرخروئی کی دعا مانگتی رہی تھیں۔ آنسوؤں سے وضو ساز کر پھر سے سجدوں میں گر گئیں۔ غرناطہ سے دعاؤں اور آہوں کے طوفان اُٹھ رہے تھے۔ الحمراء کے دیوان خاص سے نکل کر جرنیل نے مُڑ کر دیکھا تو اہل مصلحت نے آنکھیں جھکا لیں۔ شہادت کے سفر میں کوئی بھی جرنیل کا ساتھ نہ دے سکا۔ کوئی بھی اس کے ہمراہ نہ تھا۔ اس رخش کے سوا جو ہر میدان میں اس کے ساتھ ہوتا تھا۔

کبانیہ کے میدان میں اپنی افواج کے قلب میں محفوظ خیمہ کے باہر آہٹ پا کر ایک شب فرڈیننڈ نے پردہ اُٹھایا تو خیمے سے قریب گڑا نیزہ لرزاں تھا۔ محصور مسلمانوں کے اس جذبہ جانفروشی پر وہ کانپ گیا۔ خیمہ گاہ کی بجائے اپنے لئے ایک بستی بنوالی کہ حفاظت شاہی کے لوازمات بہتر طور پُورے ہو سکیں۔ غرناطہ کی دیواروں کے پیچھے سے شہادت کے دیوانوں کی ٹولیاں برآمد ہوتیں۔ ایک نوجوان نعرۂ تکبیر لگا کر اکیلا آگے بڑھتا اور فرڈیننڈ کی فوج کے سرداروں کو مقابلہ کے لئے چیلنج کرتا۔ ایسے مقابلوں میں اس کی فوج کے اتنے سردار اور نائٹ مارے گئے کہ اسے حکم جاری کرنا پڑا کہ آئندہ مُسلمانوں سے ایک سے ایک کے مقابلہ کا چیلنج قبول نہ کیا جائے۔ نوجوان آندھی کی مانند برآمد ہوتے نیزہ و تلوار کی دھاک بٹھا کر طوفان کی مانند غائب ہو جاتے۔ شوق شہادت اور جذبہ جانفروشی سے سرشار اہل غرناطہ کو موسیٰ نے آخری بار آواز کیوں نہ دی؟ جو مشورہ اس نے امراء ملت اور امیر ملت کو دیا تھا ملت کو کیوں نہ دیا؟ مَیں یہی سوچتا ہوا کنار شنیل چلتا رہا۔ چلتا رہا۔

تاریخ عالم کے چند وہ لمحات جن پر تاریخ خود خون روتی ہے یہ ان میں سے ایک لمحہ تھا۔ تاریخ انسانیت کے وہ چند واقعات جن پر قلم اُٹھاتے وقت مؤرخ تعصب برطرف کرنے پر مجبور ہوئے یہ ان میں سے ایک واقعہ بنا ''اگر ابوعبداللہ اپنے جرنیل کا مشورہ مان لیتا، اپنی قوم کے جذبہ شہادت اور قوتِ بازو پر بھروسہ کرتا تو سقوطِ غرناطہ کو ناممکن نہیں تو مؤخر ضرور کر سکتا تھا''۔

تاریخ اندلس کی یہ سچائی اسی مٹی میں مل گئی جس سے ابوعبداللہ کا خمیر اُٹھا تھا۔ ہمارے اندلسی ساتھی اردگرد کے کھیتوں، آبادیوں اور لوگوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ مرزا یعقوب اس کی کمنٹری میں کھویا جا رہا تھا اور مَیں ماہ و سال کی صدیوں موٹی سد سکندری کو تقدس مآب جذبوں کی زبان سے چاٹ چاٹ کر اس لمحہ کو تصور کی گرفت میں لانے کی جدوجہد کر رہا تھا جو سینکڑوں سال کی روایت کے ساتھ شنیل کی تہہ میں منجمد ہو گیا تھا۔

تاریخ اندلس میں بہت سے ایسے لمحات آئے جب ابوعبداللہ نے سقوط غرناطہ کی راہ ہموار کی اور عیسائیوں کے عزائم کی راہ میں حائل عزم وعظمت کے کوہِ گراں اپنی سرشت اور سازش سے چکناچُور کیئے۔ وہ مُسلمانانِ اندلس کو ان کے انفرادی گناہوں کی اجتماعی سزا کے کام پر مامور تھا۔ یہ ''اعزاز'' وہ اپنے مقدر میں لکھوالایا تھا۔ وہ مقدر کا لکھا پُورا کر گیا۔ عرب ماں کے دُودھ میں جرأت اور لوری میں غیرت کے عناصر عربوں کی سرفروشی اور سربلندی میں اہم رہے۔ ابوعبداللہ کو ماں کے دُودھ میں بزدلی اور لوری میں سازش کی خوراک ملی تھی عرب ماں کا زوال سقوطِ غرناطہ کا سبب بن گیا۔ وہ ماں جو خاندان کی آبرو ہوئی الحمراء کے ایوانوں اور دیوانوں میں آئی تو ماں اور بیوی کے مقدس نام پر بدنما داغ بن گئی۔ وہ کیا خاتون ہوگی جس کی سازشوں کی بدولت اس کے خاوند اور بیٹے کی شاہی ذلت نصیب ہوئی اور ایک قوم ایک زمین سے مٹ گئی۔ ایک سہ پہر میں الحمرا کے ایک ویران برج میں تنہا بیٹھا تھا۔ برج کی چھت کے ساتھ ساتھ حسین رنگوں میں قرآنی آیات اور کلمہ طیبہ کے ٹوٹے حروف جوڑ جوڑ کر پڑھتا رہا اور سوچتا رہا کہ عرب قرآن لے کر آئے اور حروف چھوڑ کر چلے گئے۔ عرب اور قرآن میں اس جدائی میں اس زمین اور حصار کا کتنا حصّہ ہے؟ سامنے سرسبز درختوں سے اٹی گہری کھائی سے پرے البیازین کی تنگ گلیوں میں رواں زندگی اچانک منجمد ہوگئی۔ شیخ ابواحمد کے درویش جب راتوں کو اس آبادی میں دیوانہ وار رقص کرتے تو تلاوت سے فضا گونج اُٹھتی۔ کھردرے کپڑوں میں ملبوس محنت پیشہ درویش، غرناطہ کے حریر و پرنیاں کے دیوانے امراء و رؤسا کے لئے ایک عجب مخلوق تھے جو باجا اور نفیری سے نفرت کرتے اور قوال کے ایک شعر پر رقص بپا ہو جاتے تھے۔ سلطانِ وقت دربارِ شاہی میں طلب کرتا وہ بے نیاز رہتے۔ تلاوت، نماز اور عبادت دانیہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا تو ان کے ساتھ یہی اثاثہ غرناطہ آیا تھا۔ البیازین میں بھی ان کا یہی طرز زندگی ٹھہرا تھا۔ مزارِ شیخ کا تقدس دشمنوں نے بھی قائم رکھا۔ البیازین ان تقدس مآب ہستیوں کا مزار ہے اور قدیم آثار اور ثقافت کے ماہرین البیازین کو محفوظ کرنے کا مُطالبہ کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں شہر کا کوئی حصّہ تو اپنی روح قائم رکھ سکے۔ میں سوچتا رہا یہ گلیاں اور گھر رہ بھی جائیں تو کیا ہوگا؟ وہ رُوح کہاں سے آئے گی؟ قرآن والے تو گئے کون قرآن کی آواز سے ان کوچہ و بازار کو زندہ کرے گا؟

امیر ابوعبداللہ فقیہہ شہر ابوجعفر قلعی کی جرأتِ گفتار سے ناراض ہوئے تو ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر قصرِ الحمراء کے ایک دیوان میں بند کر دیا۔ الحمراء کی روشن راتوں میں اندھیرے کمرے میں بند شیخ تلاوت کرتے تو پورا قصر گونج اُٹھتا۔ مدینۃ الحمراء میں ہر طرف خاموشی چھا جاتی۔ سُننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ امیر کی والدہ کانپ اُٹھتی: ''ایسا نہ ہو یہ دیواریں تم پر آ گریں۔ تم ابوجعفر کو بند کر سکتے ہو قرآن کو قید نہیں کر سکتے''۔ خوفزدہ امیر کو فقیہہ شہر کو رہا کرنا پڑا مگر پھر کیا ہُوا؟ رہ گیا حرف قرآں روحِ قلعی نہ رہی؟

اڑھائی صدی کے سفر میں الحمراء کے ایوانوں نے جرأت و ایثار اور سازش و فریب کے سینکڑوں مناظر دیکھے۔ جن ایوانوں کے اندھیروں میں سازش کے سپولئے نہ پلیں وہ شاہی مرتبہ سے گر جاتے ہیں۔ ابوعبداللہ کی ماں کی سازش نے سب کو مات کر دیا۔ اپنے تاجدار کے نیچے سے تخت اور اپنی قوم کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔ ابوالحسن نے عیسائیوں کی متحدہ قوت کو توڑ کر ظاہرہ پر قبضہ کیا تو دارالسلطنت سے پیغام ملا۔ الحمرا اور اس کے تخت پر ابوعبداللہ قابض ہوگیا ہے۔ ملکہ غرناطہ نے امیر غرناطہ کی پشت پر اس وقت وار کیا جب اس کی تلوار دشمن کے سینے میں اُترنے کے لئے بلند ہو چکی تھی۔ دلگرفتہ بوڑھا اپنی بیگم اور بیٹے کے لگائے زخموں سے چور بھائی کی طرف بڑھا۔ سوال الحمرا اور اس کے تخت کا نہ تھا سوال اندلس کی بچی کھچی مُسلم ریاست کے تحفظ کا تھا وہ عیسائیوں کو چیلنج کر چکا تھا۔ مالقہ میں شجاعت وحمیت اور الحمراء میں سازش و بے ہمیتی طوفانوں میں گھری چھوٹی سی ریاست دو حصّوں میں بٹ گئی۔ سازش کی عظمت کے قصیدے مدھم ہوئے تو ابو عبداللہ کے کانوں نے غرناطہ کے کوچہ و بازار کی آواز بھی سمجھنا شروع کیا۔ عوام کے بڑھتے ہوئے غیض سے بچنے کے لئے اس نے بھی میدان جہاد کا سفر اختیار کیا۔ دغا کا دودھ سازش کی لوری اور شجاعت کا خواب؟ لوسینہ کے میدان نے اندلس کی تاریخ میں پہلی بار کسی دعویٰ حکمرانی رکھنے والے مسلمان کو ذلت کی زندگی کو عزت کی موت پر ترجیح دیتے دیکھا۔ جس شام محرومِ سجود جامع قرطبہ میں صلیب بردار پادری فتح لوسینہ کی خوشی میں ماں بیٹے کے سامنے سربسجود تھے قرطبہ کی گلیاں اور بازار الناصر اور المنصور کی قوم کے ایک قیدی حکمران کے شاہی استقبال کا نظارہ کر کے اتنا روئے کہ سقوط قرطبہ پر بھی نہ روئے تھے۔

دانا فرڈی ننڈ نے نادان ابوعبداللہ کے لئے شاہی دوستی کے بازو اور جال پھیلا دیئے تھے۔لخت جگر کا لگایا گھاؤ ابھی بھرا نہ تھا کہ میراث بنونصر کے لٹ جانے کی خبر ملی۔ابوالحسن کی کمر دوہری ہوگئی۔غرناطہ والحمرا کی واپسی بھی ولولہ رفتہ واپس نہ لاسکی۔ذاتی ذلت اور رسوائی پر فخر کرنے والے بہترین ملت وفروش ہوتے ہیں۔باپ کے جانی دشمن نے بیٹے کو شاہی اعزاز کے ساتھ رہا کردیا۔ابوالحسن کو فرڈیننڈ کی افواج شکست نہ دے سکی تھیں اس نے یہ مشن اس کے فرزند کو سونپ دیا۔سازش اور شاباش کے ہتھیاروں سے مسلح ابوعبداللہ المیریا کی طرف نکل گیا۔محراب ومنبر ملک وملت کے لئے بڑھتے ہوئے خطرات کے طوفان دیکھ رہے تھے۔انہوں نے ماں بیٹے سے نجات کے لئے الزغل کو آواز دی تو اس نے فرڈیننڈ کی افواج کو یکے بعد دیگرے شکستیں دے کر بنونصر کی شجاعت کی بھولی کہانیاں تازہ کردیں۔فرڈیننڈ کو سوئٹزرلینڈ سے برطانیہ تک سے اس ''مقدس'' جنگ کے لئے امدادی دستے طلب کرنا پڑ گئے۔ان سُورماؤں کی غیرت کو بیدار اور شجاعت کو تابدار رکھنے کے لئے ملکہ ازابیلہ کو اپنے زنانہ دربار شاہی کے چاند ستاروں تک کو کبانیہ میں حاضر کرنا پڑا۔ لڑنے والوں پر صلیب کی چھاؤں کرنے کی خاطر آرک بشپ الفانسو پادریوں کی فوج کے ساتھ آ شامل ہُوئے۔

جب دنیائے اسلام آپس کی لڑائیوں میں سرگرم تھی تو عیسائی دنیا کی افواج غرناطہ کے شمال اور مغرب میں خیمہ زن تھیں۔اس محاصرے کے باوجود شہر اور مضافات کی لاکھوں کی آبادی کی ضروریات بزورِ شمشیر پوری کی جاتیں۔مالقہ کی بندرگاہ کی سمت سے آنے والے قافلوں کی راہ کی حفاظت کرنے والوں نے کسی مرحلہ پر اپنے فرض میں کوتاہی نہ کی۔فرڈیننڈ کے لئے یہ شرم کا مقام تھا۔الزغل کے دستے شہر سے نکلتے اور اس کی پشت پر گھاؤ لگا کر واپس چلے جاتے فرڈیننڈ میں غرناطہ پر کھلا حملہ کرنے کی جرأت نہ تھی۔اس نے سوچا شاید رسد کی بندش ہی انہیں مجبور کردے۔ ایک طویل محاصرہ کے بعد اس نے مالقہ پر قبضہ کرلیا اور غرناطہ کا مسلم دُنیا سے آخری رابطہ بھی ختم ہو گیا مگر شہ رگ کٹنے پر بھی الزغل کی شجاعت متاثر نہ ہُوئی۔عرب شاہسواروں نے زندگی اور موت کی جنگ میں عیسائی سورماؤں کو موت کی اور فرڈیننڈ کو قسطنطنیہ کی راہ دکھادی۔

سقوط مالقہ اور سقوط غرناطہ کے درمیان چار سال کا طویل سفر ہے۔عرب شاہسواروں کی

بے پناہ شجاعت اور عرب اُمراء کی بے پناہ کوتاہ بینی کے اس سفر میں ایک بار پھر الحمراء کی دیواروں کے نیچے سازش کے سپولئے پل کر جواں ہوئے اور ایک بار پھر فرڈیننڈ کا دوست ابوعبداللہ الحمراء کے تختِ ویراں پر قابض ہوگیا۔ایک دفعہ پھر اس نے الزغل کی پشت پر اسی انداز میں زہر میں بجھا خنجر گھونپ دیا جس انداز میں اس نے اپنے والد بزرگوار کو گھائل کیا تھا۔

شجاعت ایک دفعہ پھر سازش سے ہار گئی۔الزغل بسطہ میں فرڈیننڈ کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔مسلم اندلس اب ناصر ومنصور کا اندلس نہیں تھا جن کے زیرِ کمان لاکھوں عرب اور بربر تھے جن کی پشت پر مسلم افریقہ تھا اب سمندر پار کوئی یوسف بن تاشفین بھی نہ تھا جسے اندلس کی مسلم سلطنت کے مٹ جانے کا غم راتوں کو سونے نہ دے۔الزغل تاریخ کے اس نازک موڑ پر بھی سربلند رہا۔اس کا دشمن صرف عیسائی یورپ ہی نہ تھا۔مُسلم غرناطہ بھی تھا۔ابوعبداللہ کو غرناطہ کی فکر نہ تھی۔اسے تو بسطہ پر الزغل کی حکومت کا غم تھا۔الزغل تاریخ اور حالات کے جبر سے لڑنے کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔

فرڈیننڈ اور ازابیلہ ابوعبداللہ کی غیرت وشجاعت کی حقیقت سے آگاہ تھے دو سال کی تیاری کے بعد وہ غرناطہ کے مطلع پر نمودار ہوئے اور اسے سلام کرتے ہُوئے بسطہ کی طرف نکل گئے۔ان کے عزائم کی راہ کی واحد رکاوٹ الزغل تھا جو اپنی بقیہ سپاہ اور وسائل کو اس آخری معرکہ کے لئے منظم کرتا رہا تھا۔کئی ماہ تک لڑائی جاری رہی۔الزغل اور اس کے جانفروش اندلس کی مسلم سلطنت کی جنگ لڑتے رہے۔الحمراء کے ایمان فروش بیٹھے دیکھتے رہے۔الحمراء کے ایوان شاہی کی فراست و شجاعت کا ذکر کرتے ہوئے ایک ترجمان نے قہقہہ لگایا ''اچھا ہی ہوا ابوعبداللہ کو یہ وراثت منتقل نہ ہوئی ورنہ فرڈیننڈ کو نہ معلوم کب تک محنت کرنا پڑتی۔ابوعبداللہ الزغل کی مدد کرتا تو ملکہ ازابیلہ بھی فرڈیننڈ کو بسطہ کا آخری محاصرہ جاری رکھنے پر مجبور نہ کر پاتی'' ملکہ ازابیلہ نے فرڈیننڈ کو محاصرہ جاری رکھنے پر مجبور کیا مگر غرناطہ کے علماء وامراء ابوعبداللہ کو اہل بسطہ کی مدد پر مجبور نہ کرسکے پھر جب غیرت وشجاعت کی شکست کی خبر سنی تو ابوعبداللہ کانپ کانپ گیا۔اسے اپنا فرڈیننڈ سے کیا وعدہ ستانے لگا کہ چچا کی شکست پر وہ بلا لڑے غرناطہ اور الحمراء اس کے حوالے کردے گا۔اس ایوان کے در ودیوار نے پھر وہ منظر بھی دیکھا جب فرڈیننڈ کے ایلچیوں نے ابوعبداللہ کو اپنا عہد پورا کرنے کا

پیغام پہنچایا اور ساتھ ہی اس کی قوت اور غضب سے آگاہ کیا۔ جس تخت اور تاج کے لئے ابوعبداللہ نے میراثِ اجداد سے غداری کی تھی۔ ناموس بنونصر سے دستبردار ہوا تھا۔ ان سے جدائی کے احساس سے یخ بستہ شام میں بھی اس کی پیشانی پر قطرۂ آب چمک اُٹھا۔ ایک ہی بہانہ تھا۔ مسلمانانِ غرناطہ کی جرأت وشجاعت کا واحد سہارا ''مَیں تو عہد پر قائم ہُوں مگر میری قوم میری بات نہیں مانے گی۔'' فرڈیننڈ اس کی قوم کی جرأت اور شجاعت سے آگاہ تھا اس ایک شہر کے باسیوں کی جرأت وشجاعت کے مقابلہ کے لئے اسے تیاریوں میں مزید دو سال لگ گئے۔

کنارِ شنیل میں انہی جان فروشوں کے نقشہائے پاء کی تلاش میں رہا جن کے پاس صرف ایک شہر بچا تھا پھر بھی تمام یورپ کو دو سال تک تیاریاں کرنا پڑی تھیں جن کے جرنیل کا نام موسیٰ تھا جو ایک صبح الحمراء سے اکیلا میدان جہاد کی طرف نکلا تھا جبل شلیر سے آنے والی برفانی ہوائیں الحمرا کے در و دیوار سے اس شدت سے ٹکرائی تھیں کہ شاہی ایوانوں کے زرنگار پردے کانپ اُٹھے تھے پھر بھی ایوانوں کے باسی غافل امراء اور غرناطہ کی مساجد کے غمگین علماء کو خبر نہ ہو سکی کہ آج ایک موسیٰ اکیلا رہ گیا ہے۔

باب البیرہ کے سامنے میں وہ جگہ نہ ڈھونڈ سکا جس نے شمشیر موسوی کی چمک اور ڈیڑھ درجن نائٹوں کو سروں کے بوجھ سے سبکدوش ہوتے دیکھا تھا۔ موسیٰ فصیل غرناطہ کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ صبح کی خاموشی میں اس کے گھوڑے کے قدموں کی آواز دُور دُور تک گئی کسی پہریدار کو پھر بھی خبر نہ ہُوئی۔ باب السلطان کے روبرو ایک عیسائی دستہ صبح کی گشت پر تھا ایک اور انبوہ نیزہ وتلوار ہوئے تو مرگِ انبوہ نے شجاعت جرنیل کی شہادت دی اسپ کے پاؤں کٹ گئے، جرنیل کی تلوار پھر بھی چلتی رہی۔ دشمن پہچان چکا تھا کہ یہ شہادت کا دیوانہ کون ہے۔ پاؤں شل ہوئے تو گھٹنوں کے سہارے سربلند رہا وہ بھی زخمی ہوئے تو شنیل کی موجوں نے آگے بڑھ کر غیرت غرناطہ کو آغوش محبت میں چھپا لیا۔ دریا کے کنارے دُور تک زخمی کراہ رہے تھے ان کے ساتھی دیر تلک کھڑے سوچا کئے کہ اگر فصیل غرناطہ کے پیچھے سے ہر کوئی اسی طرح تلاش شہادت میں نکل پڑا تو کیا ہوگا؟ مقدس جذبوں کے امین غیرت غرناطہ کے محافظ شنیل کیا پھر کبھی تجھے کسی موسیٰ کے پاؤں چومنے کی سعادت نصیب ہُوئی؟ دریا کی آنکھ نمناک ہوگئی۔ مرزا یعقوب کا دوست ہارن بجا رہا تھا۔ مَیں

نے اپنی آنکھوں کی نمی دل میں چھپائی روح کو گرد آلود کیا اور ان کی طرف چل دیا۔

افریقہ کے لق و رعق صحرا میں جب بادِ سموم چلتی ہے تو ٹیلوں کے پیٹ میں پوشیدہ ہڈیاں بھی ریت کے ساتھ ساتھ اڑتی چلی جاتی ہیں اور ریزہ ریزہ ہو کر ریت میں بے نشان ہو جاتی ہیں۔ اندلس سے اسلام اور مُسلمانوں کو بے نشان کرنے کا مجرم ابوعبداللہ انہی صحراؤں میں کہیں بے نشان ہوا وہ شہادت وشاہی سے بچ نکلا اور کرایہ کے سپاہی کی موت مرا۔ غرناطہ کے موسیٰ پر شنیل کے کنارے اور تاریخ کے صفحات فخر کرتے ہیں۔ الحمراء کے ابوعبداللہ کا نام لیتے ہوئے تاریخ بھی شرمسار ہو جاتی ہے اور افریقہ کے صحراؤں کی خوش بختی پر رشک کرتی ہے جو اس بوجھ سے پاک ہو گئے۔

مدینۃ الحمراء کے روضہ شاہی کے کھنڈرات میں ایک گائیڈ ابوعبداللہ کی روانگی کی منظر کشی کر رہا تھا ''اس نے ان قبروں کو کھدوایا اور اپنے اجداد کی ہڈیاں اپنے ساتھ لے گیا اس خوف سے کہ عیسائی ان کی بے حرمتی نہ کریں۔ اگر اس کے اجداد کو کسی طرح علم ہو جاتا کہ ایک دن ان کے خاندان کا ایک سپوت ان کی قبریں کھدوا کر ان کی بے حرمتی کرے گا تو وہ اتنے خوبصورت قبرستان کی بجائے افریقہ کے انہی صحراؤں میں دفن ہونا پسند کرتے جن میں ابوعبداللہ نابود ہوا''۔

حاکم سے ناراض ہوا تو ابوالخطیب نے اندلس سے افریقہ ہجرت کا عزم ظاہر کیا تو استادِ المیریہ ابن خاتمہ انصاری نے اسے لکھا ''مغرب (مسلم افریقہ) اندلس کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ بجز مکہ اور مدینہ اندلس کا کوئی مثل نہیں کیونکہ اندلس کی سرزمین میں اولیاء وعباد مدفون ہیں اور بالائے زمین جہاد کے گھوڑے باندھے گئے ہیں جہاد کے جھنڈے بلند ہوئے ہیں اور جہاد کے خیموں کی میخیں ٹھوکی گئی ہیں اور اب تک اس ملک کے فرزند اپنے اجداد کی اس سنت پر عامل ہیں۔'' حاکم غرناطہ نے جب بالائے زمین سے جہاد کے گھوڑے کھول دیئے جہاد کے خیمے اُکھاڑ دیئے جہاد کے جھنڈے سرنگوں کر دیئے اور اس ملک کے فرزند اپنے اجداد کی سنت بھول گئے تو بے مثل اندلس کی سرزمین میں اولیاء وعباد کے مدفنوں کا نشاں تک نہ بچا۔

ایک یخ بستہ شب کے پچھلے پہر الحمراء کے محافظوں نے ایک خفیہ دروازہ کھول کر ایک قافلہ ہمیشہ کے لئے شاہی ایوانوں اور دالانوں سے رخصت کر دیا۔ اہلِ قافلہ کے چہروں پر بڑی بھاری

نقابوں کے نیچے اشکہائے ندامت برف میں ڈھل چکے تھے مگر کسی میں انہیں صاف کرنے کی سکت نہ تھی۔ چور دروازے سے نکل کر قافلہ اندھیری گھاٹیوں میں اُتر گیا ان کے قدموں کی صدا وہ سنگ ریزے بھی نہ سُن پائے جو ان کے نیچے آ کر اپنی حرمت اور تقدس سے محروم ہو رہے تھے۔ جبل شلیر سے آنے والی برفیلی ہواؤں کے غیض میں اضافہ ہو گیا وہ جھاڑیوں سے بچ کر چلتے تو اشجارِ جنگل نوکیلی شاخیں راہ میں پھیلا دیتے۔ بچے خواتین اور اندلس کی سازشی ملکہ اپنے خوابوں کے لاشے اُٹھائے ان کی تعبیر کی دوزخ کی طرف رواں رہے ماں جو ابوعبداللہ کی خاطر اندلس کی مُسلم سلطنت کی تباہی کا سبب بنی تھی اس کے عیال کو ذلت کی منزلوں کی طرف لے چلی تھی۔

غرناطہ کے جنوب میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک مختصر سا قافلہ سرنگوں ہوا تو گاؤں کی بیبیاں پردوں سے باہر نکل آئیں۔ بچّوں کے چہرے ویران ہو گئے بوڑھوں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے جو لوگ صدیوں سے جہاد کے قافلوں کو رخصت کرتے آئے تھے۔ اپنے اجداد کی روایت ٹوٹتے دیکھ کر نیم جان ہو گئے۔ افراد قافلہ کے چہروں کی محرابوں میں ان کے اعمال کی سیاہی کی تہیں جمی تھیں ان کی آنکھوں میں ذلت کے ڈورے موٹے ہو گئے تھے کوئی ایک بھی انہیں خوش آمدید کہنے آگے نہ بڑھا۔ جوانانِ دہ جہاد کے گھوڑوں کی طرف دوڑ پڑے اور بزرگ اپنا اپنا نسب سب بھول گئے۔ مائیں اپنے بیٹوں کے لئے شجاعت و کامرانی کی دعا کرتیں تو الفاظ ہونٹوں سے پھسل پھسل جاتے۔ ایک بوڑھی ماں نے قافلہ کی سربراہ کو دیکھا تو چلّائی۔ ''میرے نسب میں تو ایسے کسی قافلہ کا ذکر نہیں تیرا نسب کس سے ملتا ہے؟'' الحمراء کی رانی مٹی میں اپنا نسب ڈھونڈنے لگی۔

غرناطہ کے نیلگوں فلک پر یکم جنوری ۱۴۹۲ء کا سُورج بھی اسی شان سے طلوع ہُوا، جو اس کی قیام غرناطہ کے وقت سے روایت چلی آئی تھی لیکن اس روز الحمرا اور غرناطہ کے در و دیوار پر موت کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ الحمرا کے برجوں پر اب بھی بنو نصر کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ مدینۃ الحمراء کے گرد پہرہ سخت کر دیا گیا تھا۔ شہر کی طرف کھلنے والے سب دروازے بند تھے۔ سُورج نے ذرا بلندی سے مدینۃ الحمرا کی فصیل کے اوپر سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی تو الحمرا کے ایوان دھوپ میں نہا گئے لیکن کسی دیوان کی کوئی کھڑکی نہیں کھلی۔ شفاف نہروں پر نور نچھاور کیا تو بھی کسی محراب

کے چہرے سے نقاب نہ اُٹھ سکی۔ مدینۃ الحمراء کی زندگی موت کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

غرناطہ کی گلیوں اور بازاروں میں چلنے والوں کے قدموں کی آہٹ پتھروں میں جذب ہو گئی ایک دُوسرے کے پاس سے گزرتے وہ سلام کہنا بھی بھُول گئے۔ اپنی بے نور آنکھوں میں بیقرار سوالات ایک دوسرے سے چھپائے وہ ایسے گزر جاتے جیسے روزِ محشر قبروں سے برآمد ہوئے مردے ایک دوسرے کے پاس سے گزر رہے ہوں۔

سُورج نے اپنا زاویہ نگاہ بدلا تو الحمرا کے ایوانوں کی مشرقی محرابوں کے سامنے سائے پہرہ پر آن کھڑے ہوئے۔ مغربی سمت کی محرابوں سے دھوپ جھانک جھانک اس زندگی کو تلاش کرنے لگی جس سے اس کی صدیوں طویل آشنائی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ریشمی لبادوں میں چھپے پچاس جسموں کا ایک گروہ کسی طرف سے نمودار ہو گیا ہے ان کے عربی گھوڑوں کی چال میں استقامت تھی نہ سواروں کی آنکھ میں زندگی کی چمک۔ پھر وہ باب الشریعۃ کا چکر کاٹتے ہوئے باب الجدور سے باہر نکل گئے۔ پہرہ داروں نے ان جسموں کے پیچھے اس سختی سے دروازہ بند کیا کہ ان کے لوٹ آنے کا ڈر ہو۔ الحمراء سے نکل کر وہ پہاڑی کے دامن سے لپٹی گہری گھاٹی میں اُتر گئے جیسے اہل غرناطہ کے علاوہ سُورج کی آنکھ سے بھی خوفزدہ ہُوں۔ سنگین چٹانوں کی بلندی سے پھسلتے عمودی راستوں پر چلتے ہوئے وہ شنیل کے انہی کناروں پر جا نکلے جنہوں نے اسی صبح موسیٰ کے قدم چومے تھے۔ شنیل سر جھکائے بہتا رہا وہ سر جھکائے چلتے گئے۔

دریائے شنیل کے کنارے ایک چھوٹی سی مسجد پر ایک بڑی سی تختی لگی ہے جس پر درج ہے ''اس مقام پر ابوعبداللہ نے غرناطہ کی چابی فرڈیننڈ کے حوالے کی تھی''۔ اندلس کی لاکھوں مساجد کی مانند وہ مسجد بھی اب گرجا بن چکی ہے اس مسجد کے پاس کھڑا میں ان پچاس جسموں سے پیچھے جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا جو ریشمی لبادوں میں چھپے عربی گھوڑوں پر سوار تھے جو سفر طارق بن زیاد نے کشتیاں جلا کر شروع کیا تھا ابوعبداللہ نے چابی حوالے کر کے ختم کر دیا۔ وہ کیا لے کر آئے تھے یہ کیا ساتھ لے کر لوٹ گئے؟

''تمہیں جو دعوت میں دے رہا ہوں اسے سب سے پہلے مَیں خود قبول کرتا ہوں۔ جب

مَیں حملہ کروں تو تم بھی ٹوٹ پڑو۔ دشمن کو یوں نظر آئے تم جسدِ واحد ہو اگر مَیں شہید ہو جاؤں تو غم نہ کرنا کمر نہ توڑ بیٹھنا اپنے درمیان نفاق اور پھوٹ نہ پیدا کرنا اگر ایسا ہوا تو تم مرعوب ہو جاؤ گے تباہی اور بربادی آخری نتیجہ ہوگی''۔ مسلم اندلس کی سات سو اسی سال کی تاریخ کے مزار پر مَیں نے طارق بن زیاد کے اس خطاب کے ایک ایک لفظ پر غور کیا۔ مسلم اندلس کی تاریخ کے ایک ایک ورق پر نگاہ ڈالی۔ تاریخ نے طارق کے ایک ایک لفظ کی تصدیق کر دی۔

غرناطہ کے ایک چوک میں عیسائی حکمران کے حکم سے ایک نوجوان شاعر کو مصلوب کر دیا گیا۔ محمد بن محمد بن داؤد کا جرم صرف یہ تھا کہ اس نے سقوطِ غرناطہ کے بعد نفاق اور پھوٹ والوں کی حالت ایک قصیدہ میں بیان کر دی تھی۔

''یہ ملک اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا
ان تمام باتوں میں دنیا بھر میں شہرت رکھتا تھا جو کسی قوم کو عظمت عطا کرتی ہیں۔
آج وہی ملک سب سے زیادہ ذلیل ہے
کفار اور ان کی بے رحم فوجوں نے ہمیں ہر طرف سے گھیر رکھا ہے
ہم جو اسی ملک کی اولاد ہیں
آج اس حالت میں ہیں جیسے بھیڑ بکریاں کہ ماری ماری پھرتی ہوں
یا ایسے سوار ہیں جو بغیر چار جامے کے گھوڑے کی پشت پر سوار ہوں
ہر روز کی تعذیب اور اذیت ہمارے مقدر میں لکھ دی گئی ہے
اس وقت تک جب موت آ کر ہمیں ہمارے مقدر کے شکنجہ سے چھڑا دے
اس وقت جو ہم پر گزرتی ہے وہ موت سے بھی بڑھ کر ہے
ان کفار نے ہم پر یہودیوں کو چوکیدار مقرر کر رکھا ہے
یہودی بھی وہ جو نہ ایمان کو جانتے ہیں نہ حق پہچانتے ہیں
یہ کفار ہمیں اذیت دینے کے ہر روز نئے طریقے نکالتے ہیں
ہمیں مجبور کیا جاتا ہے کہ ہم
ان کے ساتھ مل کر ان کی مسیحی ناپاک رسموں کے ساتھ عبادت کریں

منقش بتوں کے سامنے سجدے کریں
یہ اس خدائے واحد کی ہنسی اڑانا ہے جو نظر نہیں آتا
کسی کی مجال نہیں کہ اس معاملہ میں عرض و معروض کرے
یا ایک لفظ بھی زبان پر لائے
کون بیان کر سکتا ہے کہ ہم کس عذاب میں مبتلا ہیں
ہم وہ لوگ ہیں جو خدائے واحد پر سچا ایمان رکھتے ہیں
جس وقت گھڑیال بجتا ہے
ہمیں حکم ہے کہ ہم نجس اور ناپاک بت کے سامنے سجدے کرنے کے لئے جمع ہو جائیں
گرجا میں ایک واعظ کھڑا ہوتا ہے
اس کی آواز ایسی کرخت ہے جیسے اُلّو چیختا ہے
یہ واعظ شراب اور سؤر کے گوشت کی تعریف کرتا ہے
از روئے فریب مسکین بن کر کہتا ہے
''دین حق یہی ہے''
ان سرمنڈوں میں سے ان کا سب سے ''مقدس'' آدمی بھی
یہ نہیں جانتا کہ حق ہے اور باطل کیا ہے
سب لوگ بتوں کے سامنے سر جھکاتے ہیں
ہم سب کے نام ایک فہرست میں درج ہیں
بچے بوڑھے اور جوان سب پکڑ کر لائے جاتے ہیں
ہر چوتھے مہینے ایک سرکاری اہلکار سب متشبہ لوگوں کے پاس آتا ہے
ہم سب کو اپنا اپنا صداقت نامہ دکھلانا پڑتا ہے
یا اس کو اس کے بدلہ میں چاندی دینا پڑتی ہے
وہ کاغذ قلم لے کر گھر گھر پھرتا ہے
جو لوگ زندہ ہیں اور جو مر چکے ہیں

ہمیں سب کا ٹیکس دینا پڑتا ہے
خواہ کوئی جوان ہو یا بوڑھا
امیر ہو یا غریب
جو کوئی ٹیکس ادا نہیں کر سکتا بس خدا ہی اس کی مدد کرے
اسے وہ عذاب بھگتنا پڑتا ہے جس کا بیان ممکن نہیں
ہمیں جھوٹ موٹ عیسائی بننا پڑتا ہے
کہ بے رحمی اور سختیوں سے بچ سکیں
وہ ہماری اس طرح حجامت بناتے ہیں جیسے کوئی بھیڑ بکری کی اُون کاٹتا ہے
بے رحم حکام کسی کو نہیں چھوڑتے
ہماری نگرانی کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے
جو کوئی خدا کا نام لیتا ہے یا اس کی حمد کرتا ہے
اس کو تباہی کے جال میں پھنسا لیتے ہیں
نہ چھپنا کام آتا ہے نہ بھاگنا
اگر ہزاروں فرسنگ دُور بھاگ جائیں تو بھی مخبر پیچھے رہتے ہیں
اور پکڑ لاتے ہیں
اپنے خوفناک مکروہ قید خانوں میں بند کر دیتے ہیں
ہر گھنٹہ کے بعد نئی تعذیب دیتے ہیں
مجبور کرتے ہیں کہ اپنا دین چھوڑ کر عیسائی ہو جائیں
پکار کر کہتے ہیں ''سچ'' پر ایمان لاؤ
مصیبت کا مارا روتا ہے
بھاگتا ہے دیواروں سے سر ٹکراتا ہے
مگر کچھ نہیں بنتا
ہماری مثال اس تیراک کی سی ہے

جو کھلے سمندر میں طوفان میں گھر جاتا ہے
تیرہ و تاریک دہشت ناک قید خانوں میں بند کر کے پہلے تو وہ آدمی کو سڑا ڈالتے ہیں
پھر اس کی اس طرح تعذیب کرتے ہیں
کہ معلوم ہوتا ہے جوڑ جوڑ الگ ہو جائے گا
پھر اسے لکڑیوں کے بازار میں لے جاتے ہیں جہاں صلیب گڑی ہوتی ہے
یہ روز قیامت کا میدان ہے
یہاں سزائیں ہی ملتی ہیں
جس کسی کو چھوڑتے ہیں اسے زرد لباس پہننے پر مجبور کرتے ہیں
اور باقیوں کو آگ میں ڈال کر اپنے منقش بتوں کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں
یوں ہمارے چاروں طرف آگ جل رہی ہے اور ہم درمیان میں بیٹھے ہیں
جو خطائیں ہمارے اجداد سے ہوئی ہیں ان کی گٹھریاں ہمارے سروں پر رکھی ہیں
ہم ان کے تہواروں کا احترام کرتے ہیں
پھر بھی ان کے احکامات کے بوجھ سے ہماری کمریں دوہری ہو گئی ہیں
ہم جمعہ اور سنیچر کے دن روزہ بھی رکھتے ہیں
پھر بھی ہمیں امن نصیب نہیں ہوتا
ان میں سے چھوٹے سے چھوٹا ظالم بھی ہمارے لئے قانون بنا سکتا ہے
ہر شخص ہمارے لئے نیا ظلم ایجاد کرتا ہے
اور پھر ایک تیز تلوار لے کر ہمارے سر ہو جاتا ہے
نوروز کو انہوں نے ایک نیا قانون بنایا
پھر ہمارے مکانوں کے کواڑ کھول کر پھینک دیئے
سوتے ہوؤں کو جگا کر بٹھا دیا
ہمارے اجداد کے تمام رسوم ہمارے لئے ممنوع ہیں
ہم نہ اپنی طرز کا لباس پہن سکتے ہیں نہ نہا سکتے ہیں

ہمیں یہودیوں کے سپرد کیا جاتا ہے
وہ بھی ہمیں خوب لوٹتے ہیں
اوّل تو پادری ہی ہمارے پاس کچھ نہیں چھوڑتے
اس پر یہ ظالم تو ہمارا خون ہی پی جاتے ہیں
ہماری حالت بالکل اس فاختہ کی سی ہے
جو گدھ کے پنجوں میں ہوتی ہے جو اسے نوچ نوچ کھاتا ہے
جو مصائب ہم پر پڑے ہیں
ان کو تفصیل سے بیان کرنے کے لئے ہماری تمام عمریں بھی کم ہیں''

وہ جن پر فلک رشک کرتا تھا اب زمین ان کی حالت پر خون روتی تھی۔ زمین کے آنسو قوموں کے دامن سے ان کے اپنے اعمال کے دھبے نہیں دھو سکتے۔ پھر وہ اپنی زمین سے بے نشان ہو گئے۔ کچھ محمد بن محمد بن داؤد کی راہ سے گزر گئے کچھ افریقہ کے صحراؤں کی طرف نکل گئے بعض نے ایمان دے کر امان حاصل کر لی۔ آزادی اور خوشحالی کی نعمتوں کے منکرین کے لئے ہمیشہ سے غلامی اور مسکنت مقدر رہی ہیں۔

تاریخ عالم کے اس وحشت ناک المیہ کے تند تانے میں الجھا میں گاڑی کی راہ بھولنے لگا تو میرے ساتھیوں نے زور زور سے ہارن بجا کر راہ سلجھا دی۔ وہ میرے چہرے میں کچھ تلاش کرتے رہے میں کھیتوں اور میدانوں میں کچھ ڈھونڈتا رہا۔ اندلسی نوجوان نے اپنے گاؤں کے حسن کا افسانہ چھیڑ دیا اس کے باغوں کی باتیں کرنے لگا وادیوں اور پہاڑیوں کے دامن میں محفوظ عرب آثار کا حال بیان کر کے مجھے اگلی اتوار گاؤں چلنے پر آمادہ کرتا رہا لیکن مَیں اپنا سفر اسی مقام پر ختم کرنا چاہتا تھا جہاں اس قوم نے اپنا صدیوں کا سفر ختم کیا تھا جس سے میری کچھ نسبت بنتی تھی۔ مرزا یعقوب نے آج کی شب رُک جانے کی درخواست کی مگر مَیں جلد از جلد غرناطہ سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا۔ اندلسی نوجوان نے ریڈیو کی آواز بلند کر دی۔ مغنیہ کی آواز مدھم پڑتی تو اولے! اولے! کے نعرے بلند ہونا شروع ہو جاتے۔ مرزا یعقوب بھی تالیاں بجانے والوں میں شامل ہو گیا۔ کنارِ شنیل کھیتیاں اور ان کے درمیان ذرۂ خاک بن کر اس مٹی میں بے نشان ہوئی صدیاں،

بند شیشوں پر مٹی کی تہہ موٹی ہو رہی تھی۔ مٹی کے کسی ایک بھی ذرہ کے چہرے پر بے نشان صدیوں کے بوجھ کا کوئی نشان نہ ملا۔ ایک قوم نے مٹی سے بے وفائی کی اور بے نشان ہو گئی اس کی ہڈیاں خاک میں مل کر خاک ہو گئیں خاک میں خاک کی تلاش کا سفر یہیں ختم کیوں نہ کر دیں مزید خاک چھاننے سے کیا حاصل؟ مَیں نے غرناطہ سے روانگی کے فیصلہ کا اعلان کر دیا نغمہ کے تاروں سے بندھے نغمہ نواز ''اولے! اولے!'' پکار اُٹھے۔

تنگ دل قرطبہ

غرناطہ سے قرطبہ دوسو پچاس سال کے فاصلے پر ہے۔ جامع قرطبہ ۱۲۳۶ء میں گرجا بنی اور غرناطہ کی چابیاں ابوعبداللہ نے ۱۴۹۱ء میں فرڈیننڈ کے حوالے کیں۔ اڑھائی سو سال کا یہ سفر ساڑھے چار گھنٹے میں ختم کر کے قرطبہ میں داخل ہُوئے تو شہر پر سیاہی پھیل رہی تھی۔ دِن راستہ ہی میں کہیں گم ہوگیا تھا۔ مسلمانانِ اندلس نے اس سفر میں صدیوں کی حکمرانی گنوادی تھی۔ میرے لئے ایک دن کا غم نا قابل برداشت ہو رہا تھا۔ میں عروس البلاد قرطبہ میں روز روشن میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ ٹیلے، میدان، کھیت، باغیچے قربتِ شہر، فصیل شہر، جامع قرطبہ، قصرِ امیر، وادیٔ الکبیر، گلیاں اور بازارِ دِل کے آئینے میں درجنوں تصاویر محفوظ تھیں شب کے اندھیرے میں وہ سب گڈمڈ ہوگئیں۔ سیاہ چادر کا پلوسر کا کر نہ عروس کے حسن و جمال کا اندازہ کرنا ممکن ہوتا ہے نہ عروس البلاد کی روح تک رسائی ہوسکتی تھی۔

قرطبہ کی گلیوں اور بازاروں میں قطار اندر قطار قمقمے روشن تھے۔ آنکھوں کے سامنے پھر بھی اندھیرے گھومتے ہُوئے محسوس ہُوئے۔ یہ آسمانوں سے نازل ہونے والا اندھیر ہے یا بختِ مسلم کی سیاہی؟ اندھیرے آسمان سے آئیں تو آسمان انہیں واپس بھی بُلا لیتا ہے۔ بختوں اور بدبختوں کی دی سیاہی اقوام کے ماتھے اور تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو جاتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے شاید تاریخِ اندلس کے صفحات پر پھیلی یہی سیاہی جمع ہو رہی تھی۔

مسلمان قرطبہ سے غرناطہ تک کے سفر میں ایک ایک قریہ کے لئے لڑے ایک ایک قریہ میں لڑے۔ بادشمال آتی تو اکٹھے ہو جاتے طوفان گزر جاتا تو عرب و عجم کی لڑائی پھر سے شروع ہو

جاتی۔ یمنی شامی کے خون میں شمشیر رنگ لیتا۔ بربر حجازیوں سے نیزہ و تلوار ہو جاتے۔ اُمراء نشۂ دولت میں مست درباری سازشوں میں مگن محراب و منبر پر جاہ پسند تختِ شاہی پر ریا پسند۔ نہ وحدتِ فکر نہ وحدتِ نظر نہ وحدتِ مقاصد۔ ان کی شمشیر زنی کا دشمن بھی معترف تھا۔ میدان میں آتے تو طارق و موسیٰ کے کارنامے زندہ کر دیتے۔ ان میں طارق بھی تھے موسیٰ بھی تھے مگر طارق و موسیٰ کی حمیتِ ملّی نہیں تھی۔ تسبیح کی ڈور گم ہوگئی تھی۔ اپنی جگہ پر ہر کوئی بے مثال تھا۔ لاجواب تھا پھر بھی ہر کوئی ذلیل تھا خوار تھا۔ تلواریں اور توانائیاں ذلت و رسوائی کے لئے وقف ہوں تو ذلت و رسوائی مِل جاتی ہیں۔ وقار و منزلت تلاش کریں تو قدرت وہ عطا کر دیتی ہے۔ ''انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے'' انفرادی سطح پر بھی اجتماعی طور پر بھی۔

آرام دہ کوچ، سرسبز وادیاں، کوتاہ قامت پہاڑیوں کی چوٹیوں تک لہلہاتی گندم اور جو کی فصل، قطار اندر قطار زیتون کے درخت، گھاٹیوں سے پہاڑیوں کی چوٹیوں تک کہیں کہیں حدِ نظر تک انگور کے باغ زمینِ اندلس پر سبزہ و شفق برس رہے تھے۔ صاف ستھرے گاؤں، گھروں کے سامنے سر سے سر جوڑ کر عمر رفتہ کو آواز دیتے سالخوردہ بوڑھوں کی ٹولیاں، کوچ میں عربی دھنوں پر اندلسی نغمے، خوش باش جوڑے نغمے کی تھاپ پر تالیاں بجاتے اور پھر مل کر نعرہ لگاتے۔ موسمِ گل میں ہر طرف خوشی تھی مستی تھی۔ کہیں کہیں اونچی چوٹیوں پر عرب قلعوں کے نشان بکھرے ہوئے تھے۔ واچ ٹاوروں کی شکستہ دیواروں کے نشانات تھے۔ دیہات میں حویلیاں اور مکان دیکھ کر شبہ ہوتا تھا یہ بھی دیکھے بھالے ہیں۔

کوچ دوڑتا جا رہا تھا۔ مُسافر تالیاں بجا بجا کر عربی دھنوں پر اندلسی نغمے گانے والوں کو داد دے رہے تھے۔ میرے کانوں میں غرناطہ کے آخری عرب شاعر کا وہی قصیدہ گونجنے لگا جس کے لکھنے پر عیسائی حکمرانوں نے اسے مصلوب کر دیا تھا۔

میں تمہیں اندلس کے آخری دور کی دردناک کہانی سناتا ہوں۔
یہ ملک بے مثل تھا اس میں ہر وہ چیز تھی جو کسی ملک و قوم کو عظیم بناتی ہے
آج وہی ملک سب سے زیادہ ذلیل ہے
کفار اور ان کی بے رحم فوجوں نے اسے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے

آج ہم اس حالت میں جیسے بھیڑ بکریاں ماری ماری پھرتی ہیں
یا ایسے سوار جو بغیر چار جامے کے گھوڑے پر سوار ہوں
ہر روز کی ذلت اور اذیت ہماری قسمت میں لکھ دی گئی ہے
ہماری روزی ذلیل پیشوں پر منحصر ہو کر رہ گئی ہے
اس وقت تک جب موت آ کر ہمیں ہمارے مقدر کے پنجہ سے رہائی نہ دلا دے
اس وقت جو ہم پر گزر رہی ہے وہ موت سے بھی بڑھ کر ہے۔
ان کفار نے یہودیوں کو ہم پر چوکیدار مقرر کر رکھا ہے
جو ہمیں اذیت دینے کے ہر روز نئے طریقے ایجاد کرتے ہیں۔''

محمد بن محمد داؤد یہ طویل قصیدہ لکھ کر ہمیشہ کے لئے اس ذلت اور اذیت سے نجات پا گیا۔
اندلس میں سینکڑوں ہزاروں محمد بن محمد داؤد اس راہ سے گزر گئے۔

میرے ہم سفر مل کر تالیاں بجا رہے تھے۔ محمد بن محمد داؤد پر بھی ان کے بڑوں نے اسی انداز میں مل کر تالیاں بجائی تھیں۔ ان دیہات میں ہر کہیں کوئی نہ کوئی محمد بن محمد داؤد ہو گزرا ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں اور گھاٹیوں کی گہرائیوں میں ہر کہیں ان بے نام شہیدوں کا خون خاکِ اندلس میں رچا ہوا ہے۔

ڈرائیور نے کوچ کے پیٹ سے پورا سامان نکالا بھی نہ تھا کہ طویل سفر کے ساتھی اپنا اپنا بوجھ اٹھا کر یہ جا وہ جا ہو گئے۔ بس سٹینڈ کا دربان پھاٹک بند کرنے کے لئے بے چین کھڑا تھا۔ اندلس کی بسیں ہمارے ہاں کی مانند آزاد منش نہیں کہ جب دل میں آیا جدھر دل آیا چل دیں۔ اندرونِ ملک دِن میں آنے جانے والی بسوں کی تعداد اور وقت مقرر ہیں۔ وہاں لوگ ہر وقت سفر میں نہیں رہتے۔ بڑے بڑے شہروں کے درمیان بھی گنتی کی بسیں چلتی ہیں۔ بس سٹینڈ پر نہ بسوں کا ہجوم خلق ہوتا ہے نہ مسافروں کا روزِ محشر نہ کوئی آواز لگانے والا نہ سامان اٹھانے والا نہ کپڑے پھاڑنے والا اور نہ ناز اٹھانے والا۔ نہ کھوکھے نہ ریڑھیاں نہ شور نہ شرابا۔ ہمارے ہاں کی مسجدوں میں قرطبہ کے بس سٹاپ سے زیادہ رونق ہوتی ہے۔ ہمارا کوچ اس دن شاید آخری کوچ تھا اس لئے دربان گھر پہنچنے کی جلدی میں تھا اور میرے جیسے سُست رفتار مسافروں کو بڑی تیز نگاہوں

سے گھور رہا تھا۔ میرے پاس سامان تو ہلکا تھا مگر اس مقام پر بھی دیگر مسافروں کی مانند پھرتی نہیں دکھا سکتا تھا۔ بس سٹینڈ سے باہر نکلا تو دربان نے کھٹ سے پھاٹک بند کر دیا۔ پھاٹک زیادہ بھاری نہیں تھا مگر دربان کی موجودگی میں بہت اونچا اور بھاری معلوم ہوتا تھا۔ کچھ فاصلے پر گلی میں کھوکھا نما دکان پر کچھ گھسے پٹے بندے سرگوشیوں میں قہقہے لگا رہے تھے۔ انہوں نے ایک نظر مجھے بھی گھورا اور پھر سے سرگوشیوں میں مگن ہو گئے۔

ذرا سا گھوم کر میں بڑی سڑک پر نکل آیا۔ آگے سڑک پیچھے سڑک۔ قرطبہ کی داستانِ زوال سے بھی طویل اور اندھیری۔ کوئی بھولی بسری کار آ جاتی تو سڑک سے ہم آغوش اندھیرا ایک لمحے کے لئے راستے سے ہٹ جاتا۔ اِدھر گاڑی گزری اُدھر دونوں پھر سے یک جان ہو گئے۔

مجھے ورغلایا گیا تھا کہ وکٹوریہ پارک میں ہوٹل ملیہ والے میرے منتظر ہوں گے۔ مجھے ان کی شدت انتظار کا احساس تھا۔ مگر جاؤں کدھر کو؟ اندھیرے کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ کولمبس کی مانند اپنے ذہن میں وکٹوریہ پارک کی سمت کا تعین کیا اور حسبِ توفیق تیز چلنا شروع کر دیا۔ تھوڑا ہی تیز چلا تھا کہ بغلی گلی سے ایک صاحب مجھ سے بھی تیز چلتے ہُوئے برآمد ہوئے۔ چلنے کے عمل کے دوران وہ بار بار پیچھے مُڑ کر دیکھتے جاتے تھے اور پھر اور بھی تیز ہو جاتے تھے جیسے کسی بدنصیب کے مقدر سے بچی کھچی خوش بختی اُڑا لائے ہوں۔ میں نے اپنا سامان اس کی راہ میں ڈال دیا۔ ناپسندیدگی سے پہلے راہ روکی۔ سامان کو اور پھر غصہ سے مجھے گھورا اور دوسرے ہی لمحے ''کیا حکم ہے میرے آقا'' کے انداز میں سر جھکا دیا۔ شاید وہ اُلجھ کر بچ نکلنے کا چانس ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پارک کو اندلس اور قرطبہ والے اپنی زبان میں جو چاہیں کہیں وکٹوریہ کا تو ترجمہ کرنے سے رہے۔ ''وکٹوریہ پارک؟'' وہ اس سے بھی تیزی سے ایک طرف کو چل دیا۔ میں اس کے پیچھے دوڑنے کے انداز میں چل رہا تھا۔ مُنہ سے کوئی لفظ کہے بغیر اس نے ایک طرف کو اشارہ کیا اور بھاگتا ہُوا دوسری گلی میں گم ہو گیا۔

ایک روشن ضمیر سڑک کے پار ملیہ ہوٹل کا بڑا سا بورڈ چمک رہا تھا۔ یہ ہوٹل اندلس کے ایک ریٹائرڈ بُل فائٹر کی ملکیت ہے اور امریکہ اور یورپ کے سیاحوں میں بڑا پاپولر ہے۔ ایک تو اس لئے کہ اس کا عملہ انگریزی سمجھ لیتا ہے دوسرے اس لئے کہ اگر کہیں بُل فائٹنگ دیکھنا نصیب نہ بھی

ہوتو بھی بُل فائٹر کے درشنوں سے وہ یہ کمی پوری کر لیتے ہیں۔بُل فائٹر کو بھی میموں کی اس کمزوری کا احساس ہے وہ لان میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا ہے اور بڑی بیبیوں کو آٹو گراف دے کر رخصت کرتا جاتا ہے۔

باوردی ملازم نے آگے بڑھ کر سامان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور استقبالیہ کے حضور جا کر ڈال دیا موٹی سی کتاب میں ملک ملک کے سیاحوں کے اندراجات مکمل کرنے کے دوران میں ریزرویشن افسر نے چند لمحے میرا دُکھ درد سُننے کے لئے بھی نکالے۔گردن اُٹھا کر مجھے اور میرے سامان کو غور سے جانچا اور ''کمپلیٹو'' کا اعلان کر کے پھر سے رجسٹر پر جھک گیا۔

مجھے پختہ یقین تھا کہ بوڑھا بُل فائٹر بذاتِ خود میرے استقبال کے لئے استقبالیہ پر منتظر ہوگا۔اس نے ساری امیدوں پر پانی ڈال دیا۔باوردی ملازم کچھ کہے پوچھے بغیر کھسک گیا۔اندر سے بوڑھی میموں کا ایک جوڑا برآمد ہوا۔اپنے دیس میں اس عمر کی مائیاں پردیسی کی مدد نہ بھی کر سکیں تو بھی تسلی کے دو بول تو عنایت فرما جاتی ہیں۔وہ بُل فائٹنگ پر رننگ کمنٹری کرتی اس تیزی سے پاس سے گزر گئیں جیسے ابھی پندرہ سولہ کے سن میں ہوں۔

مسٹر استقبالیہ بھی رجسٹر سے بُل فائٹنگ میں مصروف رہا۔بُل فائٹر خود کہاں ہے؟ جب اس نے سر نہ اٹھایا تو سامان اٹھانے سے پہلے اس سے کسی قریبی ہوٹل کا نام پوچھ کر اس کے خشوع و خضوع میں مداخلت کی۔اس نے دو چار ہوٹلوں کے نام جپ کر ہاتھ کے اشارے سے ان کا محلِ وقوع بھی اچھی طرح سمجھا دیا۔

اس علاقے میں دو چار نہیں دو چار درجن ہوٹل ہیں مگر جس کسی استقبالیہ پر بھی دستک دی آگے سے ''کمپلیٹو'' ہی میں جواب ملا۔

شاید سارے یورپ کو میری آمد کا پہلے ہی سے کسی نے بتا دیا تھا اور وہ سارے کام کاج چھوڑ چھاڑ ہوٹلوں پر قبضہ جما بیٹھے تھے۔استقبالیہ پر چابیاں جمع اور وصول کرنے والوں پر رشک حسد میں بدلنے لگا۔رات اور بھی گہری ہوتی جا رہی تھی اور رات گزارنے کا ٹھکانہ ابھی نایاب تھا۔ ٹھنڈی رات میں ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ایک استقبالیہ والے نے یہ حالت دیکھی تو فوراً ٹھنڈے پانی کا گلاس پیش کیا۔کوئی بات کئے بغیر درجن بھر مقامات پر ٹیلیفون کئے اور پھر نہایت

عاجزی سے اطلاع دی کہ اس کے اپنے ہوٹل ہی میں نہیں بلکہ اس علاقہ میں دُور دُور تک کسی ہوٹل میں کوئی جگہ نہیں۔

''اب کیا کروں؟''

''جو آپ کے دِل میں آئے''۔

باہر آیا تو ایک ٹیکسی خالی مِل گئی۔مزید خوش قسمتی سے اس کا ڈرائیور انگریزی کو بھی تھوڑا بہت منہ مار لیتا تھا۔''کہاں چلوں؟''

''جہاں رات گزارنے کے لئے کمرہ مل جائے''۔میں نے پچھلی سیٹ پر قبضہ کر کے منزل اس کی مرضی پر چھوڑ دی۔وہ روشن علاقوں سے نکل کر اندھیرے علاقوں کی طرف چل دیا۔راستے میں ایک عمارت کی پیشانی پر مسجد قرطبہ کی تعمیر کا ایک منظر دکھایا گیا تھا۔ایک مزدور سیمنٹ ملا رہا ہے دوسرا کانڈی پر سیمنٹ اٹھانے کے لئے آگے بڑھ رہا ہے۔پاس ہی ایک ستون سے ٹیک لگائے اپنے مخصوص جبہ و دستار میں ایک عرب عالم بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے۔سیمنٹ اور رنگوں سے بنایا یہ منظر نہایت دلکش تھا اہلِ قرطبہ کے دل و دماغ پر مسجد ابھی تک چھائی ہوئی ہے؟ میری بات اور حالت پر توجہ دیئے بغیر ڈرائیور دوڑا جا رہا تھا۔

معلوم نہیں وہ کہاں کہاں لئے پھرا۔دو تین جگہوں پر وہ ٹیکسی روک کر باہر بھی گیا اور واپس آ کر وہی ''کمپلیٹو'' والی خوشخبری دی۔اب ہم کسی مزید قدیم علاقے میں گھوم رہے تھے۔پرانی عمارتیں پرانی سڑکیں اور پُرانے لوگ۔ڈرائیور نے اتنے دروازوں پر دستک دی تھی کہ اس سے یہ بھی پوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ قرطبہ کتنے میل پیچھے رہ گیا ہے۔گیارہ بجے کے قریب اس نے خوشخبری دی کہ ایک میگاس میں جگہ مل گئی ہے۔کرایہ سات سو پسیتے فی شب ہوگا۔وقت وہ آ گیا تھا جب جو بھی مل جائے غنیمت تھا۔اس نے سامان اٹھایا اور چند سیڑھیاں چڑھ کر مجھے ایک موٹی تازی مائی کے حضور پیش کر دیا۔

مائی نے ایپرن باندھا ہُوا تھا اور طویل راہداری کی صفائی میں خون پسینہ ایک کر رہی تھی۔ اس نے مجھ سے زیادہ شدت سے ڈرائیور کا استقبال کیا جو اس رات کے لئے ایک پارو تلاش کر لایا تھا۔راہداری کے دونوں طرف مائی کے خاندان کے رہائشی کمرے تھے اور آخری سرے پر ایک

بڑے سے کمرے میں تین چار چارپائیاں قطار اندر قطار خالی پڑی تھیں۔ ''اگر کوئی اور سیاح نہ آیا تو آپ ان سب چارپائیوں پر سو سکتے ہیں''۔ ڈرائیور نے انگریزی بولنے کی آخری کامیاب کوشش کی۔

ابھی وہ دروازے ہی میں تھا کہ مائی جھاڑو سمیت آ وارد ہوئی ''پاس پورٹا'' پھر وہ رہائشی فارم نکال لائی۔ نہ روٹی نہ پانی سب کام کاج چھوڑ کر وہ میری ٹہل سیوا میں لگ گئی۔ کپڑوں کی الماری کھول کر دکھائی۔ غسلخانہ کے آداب اشاروں میں بیان کئے۔ ٹھنڈے اور گرم پانی کی ٹونٹیوں سے تعارف کرایا۔ رات نصف کے قریب گزر چکی تھی۔ بھوک بھی تنگ کر رہی تھی۔ میں نے کپڑے بدلے اور قسمت آزمائی کی مہم پر چل نکلا۔

راہداری کے ایک کونے میں ٹیلیویژن کے سامنے ایک بدحال بوڑھا ایک کافی نوجوان کا پروگرام دیکھ رہا تھا۔ مائی نے اپنی زبان میں معلوم نہیں اسے کچھ سمجھایا اور کاغذ کے ایک پُرزے پر ایک ہزار پسیتہ لکھ کر میرے سامنے پھیلا دیا۔ جواباً میں نے اِسی کاغذ پر سات سو پسیتہ لکھ کر کاغذ واپس کر دیا۔ مائی نے جھاڑو ایک طرف رکھ دیا۔ یہ تو بازو چڑھا کر مجھے سامان سمیت باہر پھینک دے گی۔ اس کے انداز کچھ ایسے ہی تھے۔ میں اگرچہ لڑنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔ پھر کسی کے اپنے گھر میں؟ صورتحال بگڑتی دیکھ کر بوڑھے نے ثالثی کے فرائض اپنے ذمہ لے لئے اور کاغذ پر سات سو پسیتہ لکھ کر ''چلو ٹھیک ہے آپ کیا یاد کریں گے'' کے انداز میں سر ہلایا۔ میرے علاوہ مائی نے بھی ان کی ثالثی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

کھانے پینے کی اشیاء لے کر واپس آیا تو مائی صاحبہ ابھی تک صفائی ہی میں مصروف تھیں۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ اس ویرانے میں صرف ٹیلی ویژن کی آواز گونج رہی تھی۔ طویل راہداری کے دونوں طرف کی دیواریں عیسیٰ علیہ السلام کی درجنوں تصاویر سے مزین تھیں۔ میرے کمرے میں داخل ہونے تک وہ خاموش کھڑی دیکھتی رہی۔ ابھی دروازہ بند بھی نہیں کر سکا تھا کہ محترمہ نے پیچھے سے مین سوئچ آف کر دیا۔ قہر درویش بر جان درویش سے بھی کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس کی موجودگی سے بے پرواہ ہو کر مَیں نے مین سوئچ آن کر دیا۔ وہ کھڑی گھورتی رہی، منہ سے کچھ نہیں بولی۔

تھکا ہوا تھا جلد ہی پلک جھپک گئی۔ میزبانوں کو شاید یہ بھی پسند نہیں آیا۔ گھڑی کی سوئیاں بارہ بجے سے آگے نکلی ہی تھیں کہ پورا گھر جاگ اُٹھا۔ نوجوان جوڑے ایک کے بعد دوسرا گھر واپس آ رہے تھے۔ پورا گھر ان کے قہقہوں اور جھگڑوں سے گونج اٹھا۔ انہیں دیکھ کر بڑے میاں کا بھی حوصلہ بڑھ گیا۔ ''سنورا سنورا'' وہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد پکارتا۔ ہنگامہ خیز ماحول اور سنورا سنورا! کے شور میں معلوم نہیں میں کب خوابِ غفلت میں ڈوب گیا۔

جہاں آسمانوں سے نور برستا تھا

جامع قرطبہ کے صحن میں ہر طرف کنکریاں ہی کنکریاں تھیں، شکست خوردہ قوموں کی مانند بے نوک، بے ضرر اور ملائم، اہل قرطبہ کے سنگہائے گرانمایہ کیا ہوئے؟ وقت کے قدموں کے بوجھ سے اس حال کو پہنچے یا اہل اسلام اپنے پتھر بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے؟ جن راہوں نے سنگ چشیدہ قاضی شہر کو بھاگتے دیکھا تھا میرے پاؤں سے لپٹی جا رہی تھی جن پتھروں نے اسے خدا حافظ کہا تھا میرے استقبال کے لئے ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔ نارنگی کے پست قامت صف بستہ درختوں کے درمیان دور تک بکھرے پڑے ریزے۔

ایک چوک میں اونچے پیڈسٹل پر تشریف فرما پتھر عرب کو دیکھا تو اس کی طرف چلتا گیا۔ عربوں کو گئے گزرے صدیاں گزریں، اہلِ اندلس کے ذہنوں سے عربوں کا خوف اب تک نہیں گیا۔ اندلسی مائیں آج بھی ضدی بچوں کو ''مورآیا'' کہہ کر ڈراتی ہیں۔ یہ کون مور اپنے جبہ و دستار سمیت قرطبہ کے چوک میں آن بیٹھا ہے؟ خدا اندلسی ماؤں اور بچوں پر رحم کرے۔ میں پتھرائی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا اور وہ پتھر آنکھوں سے مجھے گھورتا رہا نہ اس نے داستانِ غم چھیڑی اور نہ میں اس کا دُکھ پوچھ سکا وہ بھی شرمسار تھا میں بھی شرمسار تھا۔

اس کے گلے میں چھوٹی سی تختی لٹک رہی تھی ''ایواروز''

سینے پر درج تھا۔ ''اہل قرطبہ ایواروز پر فخر کرتے ہیں۔ ایواروز جس نے مغرب میں علمی ترقی کی بنیادیں ڈالیں اور اہل یورپ نے ان بنیادوں پر علوم جدیدہ کی شاندار عمارت کھڑی کی۔ ایواروز اس شہر میں پیدا ہوا تھا اس نے ساری دنیا میں اپنے شہر کا نام روشن کیا۔''

پتھر نے بعد از مرگ بھی ابن رشد کا پیچھا نہیں چھوڑا؟ اہل اندلس کے لئے جس قوم کا ایک فرد بھی ناقابلِ برداشت تھا اہل قرطبہ اس کے ایک فرد پر ابھی تک فخر کرتے ہیں؟ ایک فرد کی فضیلت کا اقرار اور اس کی پوری قوم کی فضیلت سے انکار۔ ابن رشد سے دوستی اس کی قوم سے دشمنی قوموں کا اندازِ فخر بھی کتنا عجیب ہے۔

زوال پذیر قرطبہ کی گلیوں میں گھومتے ایک خچر کی پیٹھ پر دنیا کا سب سے قیمتی بوجھ رکھا تھا ایک طرف ابن رشد کی میت اور دوسری طرف اس کی تصانیف۔ اہل قرطبہ ابن رشد کو بنو عباد کے قبرستان میں دفن کرنے لئے جا رہے تھے اس مٹی کے سپرد کرنے جس سے اس کا خمیر اُٹھا تھا۔ ماتمی جلوس میں ابن عربی بھی تھے، اندلس کے علماء و فضلاء اور ادیب سب ہی تھے اور وہ بھی تھے جنہوں نے سنگ باری کا فتویٰ دیا تھا وہ بھی جنہوں نے ابن رشد پر سنگ برسائے تھے وہ بھی جنہوں نے ساحل سے طوفان کا تماشہ کیا تھا۔

بنو عباد کا قبرستان کہاں تھا؟ کسی کو کچھ علم نہیں جس زمین سے مسلمانوں کا نشان تک مٹا دیا گیا اس کی چھاتی پر کسی قبر اور قبرستان کا نشان کیسے بچتا؟ ابن رشد نے وفات مراکش میں پائی، وصیت قرطبہ میں دفن کرنے کی چھوڑی۔ کسے گماں بھی ہو سکتا تھا کہ ایک روز اس شہر اور زمین سے اس کی پوری قوم حرف غلط کی طرح مٹا دی جائے گی۔

میں پتھر کو نہ سلام کہہ سکتا تھا نہ اس پر سلام بھیج سکتا تھا اور نہ فاتحہ پڑھ سکتا تھا۔ جب کوئی قوم کسی ملک سے بے دخل ہوتی ہے تو اس کے اجداد کی رُوحیں حقوق فاتحہ تک سے بھی محروم ہو جاتی ہیں۔ زمین اندلس میں لاکھوں مرحوم روحیں مدفون ہیں۔ میں انجانے راستوں پر چل دیا یہ سوچتا ہوا کہ ابن رشد کا جرم کیا تھا۔ کہیں سے آواز آئی۔ ''جس مٹی میں زوال کی جڑی بوٹیاں جڑ پکڑ لیں وہ شجرِ افکار کی پرورش کے جوہر سے بیگانہ ہو جاتی ہے''۔

امام مالکؒ نے ایک شاگرد کے اطوار دیکھ کر بشارت دی۔ ''یہ اس زمین کے لئے باعث فخر ہوگا جس نے اسے جنم دیا ہے۔ یہ اندلس کا عاقل ہے''۔ میرے بائیں ہاتھ مقام مسند علم تھا۔ عاقلِ اندلس یحییٰ بن یحییٰ کی نشست گاہ۔ عبدالرحمان امیر اندلس نے پوچھا ''روزہ چھوٹ گیا ہے کیا کفارہ دُوں؟''

''ساٹھ روزے رکھیں'' قاضی یحییٰ بن یحییٰ نے جواب دیا

''ایک غلام کی آزادی یا ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانے کا کفارہ کیوں نہیں؟ درباری علماء نے سوال اٹھایا۔

''یہ کفارہ امیر اندلس کے لئے نہیں عام مسلمانوں کے لئے ہے''۔

امیر کو دو ماہ روزے رکھنا پڑے۔

یہی تھی وہ مسند جس پر بیٹھنے والوں کے دل پر خوف امیر کا نہیں خوفِ خدا کا غلبہ رہا؟ یہی دنیائے مغرب کی اوّلین یونیورسٹی کی سب سے بلند مسند تھی؟ جس پر سے اندلس کے عاقل سے مغرب کے عاقل تک نے علم وانسانیت کا درس دیا؟ وہ چشمہ فیض اس جگہ سے پھوٹا تھا جس سے صدیوں پیاسے سیراب ہوئے؟ مسند عقل مقام علم مقام عدل۔

ٹوٹے فرش پر سرخی مائل گرد کی بے شکن موٹی تہہ جمی تھی۔ مسجد کے ہزاروں زائرین میں مسند علمی کا کوئی ایک زائر بھی نہیں؟ اہل قرطبہ نے کھلے چوک میں ایوار وز کا پتھریلا مجسمہ سجا دیا ہے، فروغ سیاحت کے لئے صحن جامع میں چھوٹی سی تختی بھی نہیں لگائی جو بتا سکے کہ یہ تھی ابن رشد کی مسند فکر جس کی جنم بھومی ہونے پر اہل اندلس کو آج بھی فخر ہے۔ درس عبرت کے لئے مقام عبرت کی طرف بڑھا تو سُرخ مٹی پاؤں سے چمٹ گئی۔ داغ دل پر ہو تو چھپا رہتا ہے۔ لباس پر ہو تو ہر کوئی انگلی اٹھاتا ہے۔ رومال نکال کر ماضی کی دھول کا ہر دھبہ مٹا دیا کہ کوئی اہل سیاحت انگلی نہ اٹھا سکے۔

بہار آلود نارنگیوں کے نومولود پتے سرگوشیاں کرنے لگے۔ قرطبہ کے نیلگوں آسمان کا مسافران کی سرگوشیاں سننے کے لئے قریب تر آ گیا۔ خوفِ قرب سے سائے درختوں کے قدموں سے لپٹ گئے۔

امیر عبدالرحمان نے جامع دمشق تخیل کے نہاں خانہ سے زمین قرطبہ پر ثبت کی تو اس کے صحن میں کھجور کے درخت لگوائے، اونچے اونچے سرگرداں درخت، درمیان میں زیتون کی صفیں کھڑی کر دیں، بلندی کے درمیانی خلا پستی کے پھیلاؤ سے بھر دیئے۔ جب اس کے وارث بلندیوں سے اتر آئے تو آنے والوں نے صحن جامع سے اونچے کھجور کے درخت کٹوا دیئے، پستہ

قامتی کو دراز قامت اشجار سے بھی بیر ہوتا ہے، یہ خلاء نارنگی کے درختوں سے پر کرنے کی کوشش کی گئی مگر ان میں خُو رصحرائی کی سی سرفرازی ہے نہ سرگردانی، اونچی پسماندہ فصیل میں قلعہ بند پستہ قامت اشجار کے درمیان تنہا تنہا سا فوارہ اپنے ناتواں وجود کا احساس بیدار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا، ٹپ! ٹپ! ٹپ! قطرہ قطرہ پانی کارواں سے بچھڑے کسی تھکے ماندے مسافر کے آنسوؤں کی مانند ٹپک رہا تھا۔

اس جگہ پانی کے وسیع تالاب ہوتے تھے زیر زمین نلوں کے ذریعے ان کا رشتہ میلوں دُور سرامورینا کی بلندیوں پر بنے شفاف پانی کے تالابوں سے قائم تھا جن کے گناہوں کا میل اعتراف گناہ سے دھل جائے وہ تالاب اور پانی کی محتاجی کیوں اختیار کریں؟ دور تثلیث میں صحن جامع کے تالاب بھر دیئے گئے۔ زمین قرطبہ میں تانبے کے وہ نل اب تک مدفون ومحفوظ ہیں۔ سرامورینا کی بلندیوں پر آج بھی شفاف پانی کے تالابوں کے آثار باقی ہیں اور صحنِ جامع میں تنہا اور اُداس فوارے کی ٹونٹی سے پانی ٹپ! ٹپ! ٹپ! گرتا رہتا ہے۔ کارواں سے بچھڑے تھکے ماندے مسافر کی آنکھ سے ٹپکتے آنسوؤں کی مانند۔ کارواں کو روانہ ہوئے ساڑھے سات صدیاں بیت چکیں۔ صحن مسجد کا ماحول آج بھی نمناک ہے۔ علم اور انصاف کی یادیں کتنی گہری ہوتی ہیں۔

ایک باریش شخص سر جھکائے کھردری چٹائی پر بیٹھا تھا۔ پیوند آشنا لباس علم آشنا چہرہ فکر آشنا آنکھیں،

''ہے کوئی جو مجھے قاضی شہر کا پتہ بتائے''؟ ایک ناآشنا نے صحن جامع میں قدم رکھتے ہی بلند آواز میں کہا۔

حاضرین نے نوارد کو دیکھا اور چٹائی نشین کی طرف اشارہ کر دیا۔

''اہل قرطبہ اجنبیوں سے مذاق؟'' نووارد چٹائی نشین کو دیکھ کر واپس ہونے لگا۔

''واللہ یہ مذاق نہیں''

''عظیم اندلس کا یہ قاضی؟''

اجنبی کو یقین نہیں آیا۔

''عظمت اندلس کی بنیادیں اسی عدل پر ہیں جو شوکتِ لباس سے نہیں خوفِ خدا سے کیا جاتا ہے۔ انصاف میں پیوند کاری سے لباس میں پیوند آشنا قاضی ہی محفوظ ہو سکتا ہے''۔

اجنبی کا سر خود بخود جھک گیا۔

میرے سامنے قرطبہ کی عدالتِ عالیہ کا وہی کمرہ تھا، ایک کھلا کمرہ جس میں نہ کوئی مسند ہوتی تھی نہ امتیاز عدالت، صحن جامع کے ایک طرف کے برآمدہ میں مسندِ علم بچھتی تھی اور دوسری طرف کے برآمدہ میں عدالتِ عالیہ لگتی تھی۔

باجہ کے والی نے خلیفہ وقت سے شکایت کی کہ قاضی قرطبہ نے اس کے خلاف فیصلہ دیا ہے۔

''محمد بن بشیر پہلے آپ کا کاتب تھا قرطبہ کا قاضی تو بعد میں ہوا آپ اس کے گھر تشریف کیوں نہیں لے جاتے''؟

گورنر خلیفہ وقت کے مشورہ پر قاضی کے گھر جا حاضر ہوا۔ دستک پر نوکر باہر آیا۔

''قاضی صاحب کو خبر کر دیں کہ گورنر باجہ ملنا چاہتا ہے۔''

''حاکم باجہ سے کہہ دیں جامع قرطبہ میں دیگر حاجتمندوں کے ساتھ انتظار کریں یہ میرا گھر ہے عدالتی معاملات کا تعلق عدالت سے ہے۔''

ملازم نے قاضی کا جواب گورنر باجہ تک پہنچا دیا۔

خلیفہ نے والیٔ باجہ کے خلاف قاضی کا فیصلہ برقرار رکھا۔ اس نے پہلے واضح کر دیا تھا کہ اگر قاضی محمد اپنے گھر پر تمہیں مل لیں اور عربوں کی روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کریں تو میں سمجھوں گا کہ آپ سچے ہیں، اگر وہ ملنے سے انکار کر دیں تو تنازعہ زمین میں اس غریب کا موقف درست ہے جس کے حق میں قاضی نے فیصلہ دیا ہے۔

کھلے صحن کے گرد برآمدہ میں عدل و انصاف اور علم و عرفان کی سینکڑے ہزار داستانوں کے اوراق پارینہ بکھرے پڑے تھے۔ قرطبہ کے اس قاضی کی عدالت کا کمرہ بھی وہی تھا جس نے اپنے بیٹے کو پھانسی کا حکم دے کر انصاف کا پلڑا برابر رکھا تھا۔

صحن کی مشرقی اور مغربی دیواروں کے ساتھ بنے برآمدوں کو شمالی سمت کا برآمدہ آپس میں ملاتا ہے۔ جنوب میں مسجد کے مسقف حصّہ کے دروازے کھلتے ہیں۔ اسی شمالی برآمدہ میں داخلہ کے بڑے دروازے کے اوپر وہ مینار ہے جسے اقبال نے جلوہ گہِ جبرائیل لکھا ہے۔ اس جلوہ گاہ کی طرف چلا تو ذہن کی سکرین پر ان گنت نام ابھر آئے، عالم، فاضل، فقیہہ، عادل، مفکّر، مبلّغ،

محدّث، مفسّر، عظمت رفتہ کا امین رشکِ فلک ٹکڑا زمین جہاں صدیوں تک رموزِ کائنات سمجھنے اور سمجھانے کی محفلیں جمیں۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں مسائل دنیا پر بحثیں جاری رہیں۔ حکومت اور حاکم وقت کی مصلحتوں اور پالیسیوں سے بے نیاز اہل دین و دانش بحرِ فکر میں غوطہ زن رہے۔ دُنیائے اسلام کے کناروں تک کے شاگرد پیشہ جب شام ڈھلے اپنے اپنے کمروں کی طرف چلتے تو ان کی جھولیاں بھری ہوتی تھیں۔ میں برآمدہ برآمدہ گھوما مگر خالی جھولی خالی ہی رہی۔

سکول کے بچے گروہ در گروہ آتے اور جلوہ گاہِ جبریل کی سیڑھیوں میں روپوش ہو جاتے۔ ان کی استانیاں سروں کے سفید رومال درست کرتی دوڑی پھر رہی تھیں۔ اسی دروازہ کے عقب میں کہیں ایک درخت ہوتا تھا۔ قرطبہ کا قاضی اپنا خچر اس درخت سے باندھ دیتا۔ انصاف عالیہ سے فارغ ہوتا تو خچر کھول کر خاموشی سے گھر روانہ ہو جاتا۔

یہیں کہیں باہر ایک شخص زمین پر بیٹھا سائلوں کی درخواستیں لکھا کرتا تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ اس فرش آشنا کے نام سے یورپ کے ایوانوں اور خانقاہوں میں لرزہ طاری ہو جاتا۔ اس عرائض نویس نے اندلس کی اسلامی سلطنت کو وسعت اور قوت کی معراج تک پہنچا دیا۔ وہ تشلیثی اندلس کی خانقاہوں کے گھڑیال اتروالایا۔ ان سے جامع قرطبہ کے لیے قندیلیں بنوائیں۔ جامع قرطبہ کی وسعت میں کئی گنا اضافہ کیا، اس کی موت پر یورپ کے گرجوں میں شکرانے کی مجلسیں منعقد کی گئیں وہی جس کی موت اسلامی اندلس کی داستانِ زوال کا حرفِ آغاز ہے۔ عرب تاریخ شخص کو ابن ابی عامر کے نام سے یاد کرتی ہے۔ تاریخ اندلس میں اسے المنصور لکھا جاتا ہے۔ اس کے سنگِ لوح پر لکھا گیا۔

''خدا کی قسم زمانہ اب اس کی مثل پیدا نہ کرے گا اور نہ اس جیسا اس ملک کی سرحدوں کا محافظ پیدا ہوگا۔''

خدا کی قسم زمانہ اس کی مثل پیدا نہ کر سکا، المنصور کی مانند کوئی اور مسلم اندلس کی سرحدوں کی حفاظت نہ کر سکا۔ جب سرحدیں غیر محفوظ ہو جائیں تو مملکتیں کاغذ کی ناؤ کی مانند ہوتی ہیں۔

اس ہنگام سیاحت کے عین درمیان ایک تنہا تنہا سا نوجوان ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔ گورا رنگ تیکھے نقوش سنہری داڑھی کندھے پر سویٹر نظریں فصیل جامع کے پتھروں میں پیوست،

چاروں طرف سکول کے بچے دوڑے پھر رہے تھے لیکن اس کی نہ تار نگاہ ٹوٹتی نہ خشوع وخضوع میں فرق آتا۔ مقام زیارت میں مشقت فکر؟ بیتی صدیوں کا بیتا ہوا بشر یہ کون ہوگا؟ میں نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کئی بار اپنے آپ سے دریافت کیا مگر کوئی جواب نہ ملا۔

مینارہ توحید کی سیڑھیوں میں بوڑھی راہبہ نے کانپتے ہاتھوں سے سکے صندوقچی میں ڈالے اور ٹکٹ تھما کر مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ پیچھے کھڑے بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ وہ مجھے پہچان نہ سکی۔ آنکھیں سکوں کے حروف پر مرتکز کر کے ٹکٹوں کی تعداد کا تخمینہ کرنے میں لگ گئی۔ پھر بھی جب تک میں مینار کی آخری منزل تک نہ پہنچ گیا۔ یہی خدشہ رہا کہ ابھی آ کر مائی راستہ روک کر کہے گی۔ ''تم آگے نہیں جا سکتے یہ وہ مینار نہیں جس پر سے تم گلا پھاڑ کر اپنے ساتھیوں کو بلایا کرتے تھے' یہ سینٹ رافائیل کا مینار ہے دیکھتے نہیں وہ کس انداز میں پر پھیلائے محو حفاظت ہے۔ وہ صدیوں سے اندلس اور اہلِ اندلس کو اپنے پروں کے نیچے لیے ہوئے ہے چلو نیچے اترو تم پھر کہاں سے آ گئے؟''

صبح ہی سے مجھے ایسی مائیوں اور ان کی نظروں سے واسطہ پڑ رہا تھا۔ پیاسی آنکھوں کی پلکوں پر صدیوں کا بوجھ لیے کمرے سے باہر آیا تو میزبان سنورا اب بھی شب رفتہ والی مشینی صفائی میں مصروف تھی۔ یہ رات بھر سوئی نہیں اس بھرے گھر میں اس کا اور کوئی مصرف نہیں؟ شاید اسے میری کج فہمی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں رات کے غصہ کے سرخ ڈورے موٹے ہونے لگے۔ ادھر بھی برابر کی آگ لگی تھی۔ شب بیداری کے اثرات کافی گہرے تھے۔ ناشتہ کا ارادہ ترک کیا اور سات صد پیتے اس کی نظروں کے سامنے لہرا دیئے۔ خوش ہونے کی جگہ نظارۂ زر سے وہ اور بھی مشتعل ہو گئی جیسے زخمی سانڈ کے سامنے کوئی سرخ رومال لہرا دے زبان خویش میں وہ کوس رہی تھی یا ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کی درخواست کر رہی تھی کچھ سمجھ نہ سکا۔ بیگ اٹھایا اور در و دیوار پر مصلوب مسیح کو حسرت ناتمام سے دیکھتا ہوا سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ بلند آواز میں نغمہ جدائی الاپتی وہ پیچھے چلی آ رہی تھی۔ بڑے میاں نے بستر میں خوابیدہ بلند آواز میں اس غصہ کی وضاحت چاہی۔ موٹی سنورا نے جواباً اپنا بھاری پاؤں ٹھنڈے فرش پر دے مارا۔

کنڈی کھولی اور باہر سڑک پر آ گیا۔ ٹیکسی میں گھومتے بار بار موٹی سنورا کی خوفناک شکل آنکھوں

کے سامنے گھوم گھوم گئی۔

عربوں کو پورا اندلس فتح کرنے میں اتنی مشکلات سے دوچار نہیں ہونا پڑا ہوگا جن سے مجھے تلاش ہوٹل کے منہ نہار سفر کے دوران واسطہ پڑا۔ جس کسی ہوٹل کے استقبالیہ پر دستک دی وہی رات والا ''کمپلیٹو'' سا جواب ملا۔ ٹیکسی ڈرائیور خوش تھا کہ کرایہ بڑھ رہا تھا اپنا دل ناخوش کہ وقت گھٹ رہا تھا اور یہ خوف کہ ویزا کی عمر دراز ٹیکسی میں ہی بسر نہ ہو جائے کسی انجانے موڑ سے دفتر سیاحت کا بورڈ نظر پڑ گیا۔ میں خوش ہوا، ڈرائیور ناراض ہو گیا۔ وہ دفتر سیاحت کی بجائے مجھے کسی ہوٹل پہنچانا چاہتا تھا میں نے زبردستی سامان اٹھایا تو اس نے بھی موٹی سنورا کی نظروں سے دیکھا۔ انہی ابھی نہ جاؤ والی نظروں سے، کرایہ اس کی تلی پر رکھ کر عرض کیا ''کمپلیٹو'' اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا میں دفتر سیاحت میں روپوش ہو گیا۔

دو عدد اندلسی نوجوان اور اتنی ہی تعداد میں سنورائیں سیاحوں کی مشکل کشائی کے لیے مسکراہٹیں بدل رہے تھے، دخل در معقولات پر معذرت سے پہلے ہی وہ سب مسکرا دیئے۔ حالت دیکھ کر یا عادتاً کچھ پتہ نہیں۔ ان کی مسکراہٹوں کا نوٹس لیے بغیر میں قریب ترین کرسی میں ڈھیر ہو گیا۔ ایک نوجوان نے صورتحال کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے پانی کا گلاس پیش کیا۔ خالی گلاس وصول کر کے جھک کر کسی قسم کی خدمت لائقہ سے آگاہ فرمانے کی درخواست پیش کی۔ دیار متروک میں یہ طرز آشنائی؟ اسے کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی۔

وہ اُسی انداز میں دست بستہ کھڑا تھا جب جواباً میں کافی دیر تک خاموش رہا تو اس نے مسکراہٹ سمیٹتے ہوئے پوچھا ''کیا ہوا ہے؟''

''غلطی''

''کیسی غلطی'' وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔

''قرطبہ آنے کی غلطی''

''یہ غلطی تو ہر سال ہزاروں لاکھوں لوگ کرتے ہیں''

''لیکن میں ان ہزاروں لاکھوں لوگوں میں سے نہیں ہوں''

''آپ کن لوگوں میں سے ہیں؟'' چاروں میزبان اب حیرانی کی بجائے دلچسپی سے مجھے گھور رہے

تھے۔

''ان میں سے جنہیں ساڑھے سات صدیاں پہلے آپ نے قرطبہ سے نکال دیا تھا۔''

''لیکن اب ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔''

''کسی ہوٹل والے نے کل سے اب تک اس خوش آمدید کا مظاہرہ نہیں کیا۔''

وہ چاروں مجھے سمجھانے لگے کہ اس میں ہوٹل والوں کے کسی خوف یا بددیانتی کا دخل نہیں اصل میں سردی کے مارے یورپی اتنی تعداد میں قرطبہ آ گئے ہیں کہ ہوٹلوں کے دامن تنگ پڑ گئے ہیں۔

میں نے انہیں اپنی مشکل بتائی اور یقین دلایا کہ جو کوئی کمرہ بھی لے دیں گے دو چار روز بعد خالی کر جاؤں گا۔''ہم پورا اندلس خالی کر سکتے ہیں تو ایک کمرہ کہاں اٹھالے جائیں گے۔''

خواتین وحضرات نے مشترکہ قہقہہ بلند کیا۔ ذرا معتبر قسم کا نوجوان بڑے سے ٹیلیفون سیٹ کے نمبر گھمانے میں لگ گیا لیکن اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہر کہیں سے وہی ''کمپلیٹو'' میں جواب مل رہا ہے۔ وہ نمبر گھماتا رہا اور میں خوف اور مایوسی کے ملے جلے انداز میں اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے میں مصروف رہا۔ کافی دیر بعد جب اس نے اپنی کامیابی کا اعلان کیا تو سب حاضرین وسامعین نے اس عظیم کامیابی پر اس انداز میں داد دی جیسے اس نے کوئی شہ زور سانڈ مار گرایا ہو۔ مسکراہٹ زدہ ہونٹوں سے مجھے خوشخبری سنانے کے ساتھ ہی اس نے ہوٹل کا ایڈریس لکھ کر تھما دیا اور تاکید کی کہ فوراً جا کر کمرے پر قبضہ جما لو ورنہ نتائج کا وہ ذمہ دار نہیں ہوگا۔

دفتر سیاحت کی گنگا سے پاؤں بھی دھوتے چلیں، میں نے چلتے چلتے خاتون متعلقہ سے قرطبہ کا نقشہ مانگ لیا۔

''عربی؟'' اس نے مسکرا کر حملہ کیا۔

''نہیں اردو'' میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

''آپ مسلمان نہیں؟''

''وہ تو ہوں۔''

''پھر عربی کیوں نہیں۔''

''آپ عیسائی نہیں؟'' حملہ بہترین دفاع ہوتا ہے۔

''وہ تو ہوں'' اس نے سینے پر صلیب لہراتے ہوئے کہا۔

''پھر لاطینی کیوں نہیں؟''

بقیہ خواتین وحضرات بڑی دلچسپی سے مناظرہ سن رہے تھے اپنی ساتھی کے دفاعی پوزیشن لیتے ہی انہوں نے مداخلت کی اور انگریزی زبان میں نقشہ پر سمجھوتہ ہو گیا۔

ہوٹل گنگورا کے استقبالیہ پر بھی ایک سنورا سے ہی واسطہ پڑا لیکن یہ مائی رات والی سنورا جیسی خوفناک نہیں تھی بلکہ بڑھیا کی بجائے زمانہ رفتہ کی گڑیا سے زیادہ قریب تھی۔ لحیم، شحیم، نرم و نازک، گوری چٹی، نرم دم گفتگو، مائی نے دوسری منزل کے کمرے تک خود میری رہنمائی کی پردے ہٹا ہٹا کر کھڑکیوں اور ہنگامی راستہ کے محل وقوع سے آگاہ کیا۔ غسلخانہ کے آلات کو ٹھیک طور پر استعمال کرنے کا ٹھیک طریقہ سمجھایا۔ کمرے کی ابتدائی رسوم سے فارغ ہو کر نیچے آیا تو مائی ہوٹل کا کارڈ اور شہر کا نقشہ لیے کھڑی تھی۔ اس نے بلا درخواست نقشہ میں قابل زیارت مقامات وعمارات کا راستہ بھی دکھا دیا اور پھر ''پاسپورٹا'' واپس کرتے ہوئے زیر لب مسکرائی۔

''مسلم؟''

''نہیں مور'' میں نے مزید مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں مور نہیں مسلم'' اس نے رجسٹر کے اندراجات پر انگلی رکھ دی۔''پاکستان''

مائی مسلمان اور ''مور'' کے فرق سے بخوبی واقف تھی۔

میں تنگ تنگ صاف ستھری، پر پیچ گلیوں میں گھومتا ہوا پانچ ہی منٹ میں مسجد کے دروازے پر پہنچ گیا۔ کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ محسوس ہوتا تھا پاؤں ان راہوں سے آشنا ہیں۔ کوئی ڈوری کھینچ رہا ہے۔ لیکن دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی ڈوری ٹوٹ گئی تھی اور میں تاریخ کی اندھیری راہوں پر بھٹکنے لگا تھا۔

جامع قرطبہ تاریخ مسلم کی شاہراہ کے ایک اندھے موڑ پر واقع ہے اس موڑ تک عزم ہے، استقلال ہے، اتحاد ہے، ایمان ہے، علم ہے، روشنی ہے، عروج ہے، اس سے آگے انتشار ہے، ہوس ہے، زوال ہے، ذلت اور رسوائی ہے، گھپ اندھیرا ہے، جب اندر کا اندھیرا باہر کے انتشار سے بغل گیر ہو جائے تو مسجدیں مندروں اور کلیساؤں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، میں کلیسا کے مینار

کا ٹکٹ خرید کر مسجد کا مینار تلاش کرنے لگا تھا۔ بوڑھی راہبہ کو میرے قدموں کے انداز سے دل کی حالت کا اندازہ ہوگیا۔ زائرین کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے ایک ایک کو ٹکٹ جاری کرنا پڑتا۔ ایک ایک کے پیسے گن کر صندوقچی میں بند کرنا ہوتے تھے۔ ورنہ شائد وہ میرا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی۔

مینار کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میری رفتار اور بھی مدھم ہوگئی اوپر جاتے اور نیچے آتے بچے بوڑھے غور سے دیکھتے اور آگے نکل جاتے۔ آخری منزل پر پہنچا تو وہی سنہری داڑھی والا نوجوان اسی انداز میں سویٹر کندھے پر رکھے گم سم بیٹھا تھا۔ جنگلے سے ٹیک لگائے حدِ نظر تک پھیلے گھروں کی چھتوں، کھڑکیوں اور پھولوں سے آراستہ صحنوں میں کوئی گم گشتہ چیز تلاش کرنے کے انداز میں۔ مجھے اس پر شبہ سا ہونے لگا، ہم کہاں ملے تھے کس مقام پر جدا ہوئے تھے؟ دُوسری طرف جنگلے سے ٹیک لگا کر مَیں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

جامع سے آگے وادی الکبیر نہایت سکون سے اپنی منزل کی طرف رواں دکھائی دیتا تھا جس روز امیر عبدالرحمان نے اپنے آنسوؤں سے دھو کر مسجد کی بنیاد کی اینٹ زمین قرطبہ کے سُپرد کی تھی۔ ان گنت ولولے، انمٹ خواہشیں اس بنیاد میں محفوظ کیے تھے۔ اس روز بھی وادی الکبیر اسی انداز میں اسی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ دریا اپنا رُخ تبدیل کر لیتے ہیں منزل مقصود کبھی نہیں بدلتے۔ ان کی ابدی زندگی اور لازوال سفر کا راز اسی استقلال منزل میں ہے۔ آلِ امیر نے تخت و تاج کو ہی منزل قرار دیا تو عروج و بلندی کی راہ سے بھٹک گئے۔ صدیوں وادی الکبیر کے پڑوس میں رہے اس سے بھی زندگی کا راز نہ پا سکے۔

وقفہ دوپہر کا اعلان ہو چکا تھا سکول کے بچے اور یورپ کے بوڑھے سب مینار سے نیچے چلے گئے تھے۔ مَیں اور باریش نوجوان اب بھی جنگلے سے چمٹے کھڑے تھے، اب بھی کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ ''چلیں ورنہ مائی دروازہ بند کرا دے گی۔'' اس نے ہوش میں آتے ہوئے مجھے خبردار کیا۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگے۔ ''جس مینار کی تزئین کی تکمیل پر عبدالرحمان الناصر نے نماز شکرانہ ادا کی تھی یہ وہ مینار تو نہیں ہے۔'' معلوم نہیں کیوں اس نے مجھے آگاہ کرنا

ضروری سمجھا۔ ''آپ کے بنائے ہوئے مینار کی سیڑھیاں بھی دوہری تھیں۔ آنے جانے والے ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ آپ کا وہ مینار اس مینار کے اندر مقیّد ہے۔''

''جس طرح آپ کا گرجا گھر اس مسجد کے اندر مقیّد ہے۔'' ہم نے بلا کسی تعارف کے مناظرہ شروع کر دیا۔

''بہرحال مجھے افسوس ہے۔''

''گرجا کی قید پر''؟

''نہیں اصل مینار کی قید پر۔ دوسرا مینار کسی اور جگہ بھی بن سکتا تھا اس مینار کے گرد دیواریں کھڑی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''یہ سوال تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہئے تھا۔''

''حسن مسجد کا ہو یا کلیسا کا اس پر تعصب کی سیاہی ملنا گناہ ہے۔ اصل مینار کی دنیا میں کوئی مثال نہیں تھی، یورپ کے جملہ چکور مینار اس کی اولاد ہیں۔ میناروں کے جدِ امجد سے مل کر مجھے خوشی ہوتی اس جیسے مینار تو میرے جرمنی میں بھی کافی ہیں۔''

اچھا تو موصوف جرمن ہیں میں نے اپنے آپ کو آگاہ کیا۔ صحن کے پستہ قامت اشجار کے درمیان پہنچ کر اس نے گردن اوپر اٹھائی اور مینار کی بلندی پر محوِ پرواز سینٹ رافائیل کو مخاطب کر کے کہا:

''آپ کی جگہ سوسن کے سنہری پھول دیکھ کر مجھے اور زیادہ خوشی ہوتی۔''

اسلامی دور میں مینار کی بلندی پر کلس میں ساڑھے سات فٹ محیط کے تین گولے اوپر نیچے ہوتے تھے۔ اوپر اور نیچے کا گولا خالص سونے کے تھے۔ درمیان کا چاندی کا، گولوں سے اوپر چھ پنکھڑیوں والا سونے کا سوسن کا پھول اور پھُول سے اُوپر سونے کا انار ہوتا تھا۔

اب اس کلس پر صرف سینٹ رافائیل کا قبضہ ہے۔

سیاح چائے خانوں میں گھُس رہے تھے۔

''آپ کو گلیوں سے بھی کچھ انس ہے؟''

''قرطبہ کی گلیوں سے تو ہے۔''

''آئیں پھر اس کا اظہار کریں۔'' وہ ایک گلی میں داخل ہوگیا۔

مسجد کے سامنے کے محلّہ کی گلیوں میں وہ میرا گائیڈ بن گیا اس کے پاس ہر سوال کا جواب تھا، فکرِ تعمیر، طرزِ تعمیر، حسن تعمیر، اور اہل تعمیر سب کے بارے میں اس کا علم قابل اعتماد تھا۔ وہ فنِ تعمیر میں پی ایچ ڈی کے سفر پر تھا۔ مصر، شام، روس، یورپ، روم میں گھوم پھر کر وہاں کے طرزِ تعمیر کا مطالعہ کر چکا تھا اور اب سپین کے مورش طرزِ تعمیر کی باریکیوں کو سمجھتا پھر رہا تھا۔ گلیوں میں دیواروں سے باتیں کرنے کے دوران اس نے بتایا کہ کسی تہذیب کی رُوح اور قوم کے طرزِ فکر و خیال کو سمجھنے کے لئے اس کے شہروں کی گلیوں سے تعارف بہت ضروری ہوتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں اور یہ گلیاں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں لیکن پھر بھی اس کے ساتھ چلتا رہا۔

سٹیفن کو جس ملک کے فنِ تعمیر کا مشاہدہ درپیش ہوتا وہ اس کی زبان سیکھتا، تاریخ اور تاریخ فن کا مطالعہ کرتا، تاریخی آثار پر جو کچھ ملے پڑھ ڈالتا اور پھر سائیکل پکڑ کر سفر علمی پر نکل پڑتا۔ وہ شب رفتہ ہی قرطبہ پہنچا تھا اور اب مجھے قرطبہ کی گلیوں سے متعارف کراتا پھر رہا تھا۔ پرانی عمارتوں کی جگہ بن جانے والی نئی عمارتوں پر غصّہ کا اظہار کر رہا تھا۔ در و دیوار سے باتیں کرتے چکنا چور ہو گئے تو اس نے ایک کپ چائے کی قرارداد پیش کی۔ مَیں نے اس قرارداد کی پُرزور حمایت کی۔ چائے کی میز پر غم ہلکا کرنے کے لئے ہم نے ماضی کی بجائے حال کی بات چیت شروع کی لیکن جلد ہی راستہ بھول گئے۔

ٹکٹ والے کی کھڑکی پر اب بھی وہی ہجوم تھا۔ میں ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سبک خرام ہوا میں پتے سرگوشیاں کرنے لگے۔ سٹیفن نے مجھے تسلی دی اور جان کی پرواہ کئے بغیر بحرِ ہجوم میں کود گیا۔ میں پتوں کی سرگوشیاں سمجھنے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''جانتے ہو یہ کون ہے؟'' ایک شوخ پتا پھڑ پھڑایا۔

''بالکل'' دوسرے نے بے نیازی سے سر ہلا دیا۔

''یہ بھلا اتنی دور کیوں آیا ہے؟''

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا سب پتے قہقہہ میں شامل ہو گئے۔

''اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے؟'' پہلے نے اظہارِ ناراضگی کیا۔

''یہی تو ہنسنے کی بات ہے'' وہ پھر ہنس پڑے۔

ایک اور جھونکا آیا اور ایک زرد رو پتہ ٹوٹ کر میرے سامنے آن گرا۔

''عروج بہار میں یہ زردیٔ زوال؟'' میں نے پتا زمین سے اُٹھا لیا۔ اس کی شریانوں میں خون کا رنگ بھی زرد تھا۔ ڈنڈی اتنی کمزور تھی کہ وہ پتے اور شاخ کے ربط باہمی کا بوجھ بھی برداشت نہ کر سکی۔ زرد رو برگ بادِ بہاری کے بوسہ کی شدت سے زمین پر آ رہا۔ تنے سے جو ہر زندگی کی فراہمی ربط باہم کے استحکام میں ہے۔

میں نے پتا اٹھا کر بیگ میں رکھ لیا۔

''شاید یہ سمجھ گیا ہے'' پتوں نے پھر سرگوشی کی۔

جامع قرطبہ کا کھلا صحن اور مسقّف حصّہ ایک دوسرے کی توسیع ہیں۔ صحن میں کھلنے والے ڈیڑھ درجن عظیم الشان کشادہ دروازے ان حصوں کی حد بندی کرتے تھے انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے تھے۔ اہل کلیسا نے چار چھوڑ سب دروازوں میں تعصب کی دیواریں چُن دی ہیں۔ امیر عبدالرحمان کے اولین حصہ کے دو دروازوں میں بڑے بڑے پھاٹک باقی ہیں مگر وہ ہمیشہ بند رکھے جاتے ہیں۔ انہی میں سے ایک کو کلیسا کی زبان اور عیسائی اندلس کی تاریخ میں باب العلم کہا جاتا ہے۔ سقوطِ قرطبہ کے بعد مسلمانوں کے خلاف لڑائی کے لئے جو لشکر بھی روانہ ہوتا اس کا علم اسی دروازہ سے برآمد ہوتا تھا۔ المنصور کے اضافہ کے آخری دو دروازے عبادت اور سیاحت کی ضروریات کے لئے وقف ہیں۔

ان بند دروازوں کے پیچھے کیا ہے؟ جس کی ایک جھلک کے لئے لاکھوں ہزاروں میل چل کر آنے والے دیوانے ہو رہے ہیں؟ مَیں تو جامع قرطبہ کا زائر ہوں ان کا کیا چھن گیا ہے؟ مَیں نے بند پھاٹک پر آنکھ جما دی۔ تختوں پر صدیوں کے اندھیروں کی دبیز تہہ دل و نگاہ کی بیتابی کی راہ میں حائل ہو گئی۔ انتہاءِ دیوار کو دیکھنا چاہا تو نگاہ پھسل کر خلا کی وسعتوں میں دم توڑ گئی۔ چشمِ فلک میں سُرخ ڈورے اُتر آئے۔

''چلیں'' کہیں دُور سے سٹیفن کی آواز آئی۔ مُڑ کر دیکھا تو پاس ہی وہ ٹکٹ لئے کھڑا تھا اس کی آواز میری نظر سے بھی نایاب تھی۔ عاشقی کا ایک اور مرحلہ ختم ہوا۔ آزمائش کی ایک اور منزل شروع ہوئی۔ آفتاب اپنی اس روزہ منزل کی طرف تیزی سے جھکا جا رہا تھا۔ وقت اور پیمانہ وقت

کی بے نیازی کے احساس سے سٹیفن بے تاب ہونے لگا۔ ہم نے اپنے اپنے وجود خواتین و حضرات کے بحرِ رواں کے سپرد کر دیئے۔

چیونٹی کی رفتار چلتا وقت یک دم ساکت ہو گیا۔ ''او مائی گاڈ'' سٹیفن دونوں ہاتھوں سے سر تھامے چلایا۔ اس کی آنکھیں خوفناک انداز میں کھلی تھیں۔ اندھیرے سے آشنائی کے لئے آنکھیں بند کرنا چاہیں تو پتھر کے جادو سے میری آنکھیں بھی پتھرا گئیں۔

''یہ سب کیا؟'' اس کے لفظ میرے کانوں میں منجمد ہو گئے۔

''ایک خواب ایک حقیقت۔'' میرے الفاظ میرے لبوں پر دم توڑ گئے۔

''اتنا حسین خواب دیکھنا کسی انسان کے بس میں نہیں۔''

''اتنے حسین خواب کو ایک انسان ہی نے دیکھا اور حقیقت کا رُوپ دیا تھا۔''

''یقیناً وہ اس زمین کا انسان نہیں تھا۔''

''یقیناً وہ ایک اور زمین سے بھاگ کر آیا تھا۔''

سٹیفن نے میری طرف دیکھا ''تم ابھی تک تاریخ اور جغرافیہ کی قید میں ہو۔ یہ فکر اور رُوح کی آزادی کا مقام ہے۔''

بازو سے پکڑ کر اس نے مجھے ہجوم سے الگ کر دیا۔ ''احمقوں کی راہ سے ہٹ جاؤ یہ پیسے اور گائیڈ کی زبان کے زور پر مشقِ سیاحت کرنے والے ہیں اور نہیں جانتے کہ بخت انہیں کہاں لے آئے ہیں۔''

گائیڈ اپنے اپنے مقدر کی بھیڑوں کو زبان کی چابک سے ہانکتے پاس سے گزرتے رہے اور ہم ایک طرف کھڑے آنکھیں ملتے رہے۔ حقیقت کو خواب کے روپ میں دیکھنے کے لئے۔

قطار در قطار نازک اندام سُرخ و سفید مرمریں ستون۔ سروں پر دو منزلہ محرابوں کے تاج سجائے۔ ہر طرف پھیلی دیوارِ مقدر میں مقید نیم تاریکی، داستانِ تخیل کا منظر زمین قرطبہ پر اترا اور مسجودِ ملائک کی مانند واپسی کا راستہ بھول گیا۔ حقیقت خاک در خاک ہو جائے تو داستان بنتی ہے۔ تخیل پیوستِ خاک ہو کر لازوال حقیقت کا رُوپ دھار لیتا ہے۔ اہلِ تخیل نے پہلے قطار در قطار مرمریں ستونوں کی فصل کاشت کی۔ جب یہ فصل اچھی طرح تیار ہو چکی اور شاخیں نکل آئیں تو ان شاخوں کو آپس

میں باندھ دیا جیسے قطار در قطار کھڑے آدمی ایک دوسرے کا بازو پکڑ کر سروں سے نکلتی ہوئی محرابیں بنا دیں۔ محرابوں کی اونچائی تخیل امیر کو پھر بھی چھو نہ سکی تو ستونوں کے سروں پر ایک ایک مزید ستون کھڑا کر دیا گیا۔ ان ستونوں کے سروں سے سُرخ و سفید سنگِ مرمر کے بازو نکال کر پہلی محرابوں کے اوپر ایک ایک مزید محراب بنا دی۔ جب محرابوں کا جنگل تیار ہو گیا تو اس کے چاروں طرف حفاظتی دیوار کھڑی کر دی۔ اس حسین جنگل کو آفاتِ فلکی سے بچانے کے لئے محرابوں کے سروں پر چھت بچھا دی گئی۔ ماہرین قرطبہ نے سریا و سیمنٹ کے ستونوں کی طرز پر سنگِ مرمر کے ستون بوئے اور چھت کا بوجھ سہارنے کے لئے ان ستونوں نے ایک دوسرے کے بازو تھام لئے۔ احتیاط یہ کی کہ ان محرابوں کا رُخ محراب مسجد کے متوازی نہ ہو تاکہ منبر پر بیٹھے خطیب کی تارِ نگاہ میں کسی محراب سے رکاوٹ پیدا نہ ہو سکے۔ وہ بیرونی دروازے تک چھت اور فرش تک ہر چیز صاف صاف دیکھ سکے۔ اسی اندازِ تعمیر سے خواہش توسیع ہر بار پوری ہوئی جس سمت میں توسیع مطلوب ہوتی اس طرف کی بیرونی دیوار ہٹا کر موجود محرابوں کے آگے یا متوازی مزید محرابی ستون بو دیئے اور پھر دیوار کھڑی کر کے چھت آگے تک بڑھا دی جاتی۔

نگاہ آشنائے منظر ہوئی تو قدم ڈول گئے۔ قریبی ستون کا سہارا لینا چاہا تو اس کی نقطہ انجماد کو پہنچی ہوئی حرارت گریزی سے فکر کانپ اُٹھی پاؤں کے نیچے سے فرش سرکنے لگا۔ مقامِ عبرت پر نشانِ عبرت بھی نہ رہا تو اہلِ درد درسِ عبرت کے لئے کہاں جائیں گے؟

ہم اس طلسم کدہ میں کتنی ہی دیر کھڑے رہے۔ ہم محراب دار ستونوں کا تعاقب کرتے وہ آگے چل کر کلیسا کے اندھیروں میں گم ہو جاتے۔ میں نے بات کرنے کی کوشش کی، زبان کنگال ہو گئی۔ سٹیفن نے کچھ کہنا چاہا الفاظ کہیں باہر رہ گئے تھے۔ مجھے بازو سے پکڑ کر اس نے سرگوشی کی۔ ''پہلے ایک چکر پورا کر لیں دوسرے چکر میں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔''

''اہلِ قرطبہ کو اپنی مسجد پر بڑا ناز تھا'' ایک جگہ گائیڈ بزبان انگریزی دردِ قرطبہ بیان کر رہا تھا ''وہ حرامی کیا جانے یہ مسجد کیا تھی، اس نے دنیا کی حسین ترین مسجد برباد کر دی اور یہ بدصورت گرجا گھر کھڑا کر دیا''۔ اس نے قلب جامع میں پیوست گرجا کی طرف اشارہ کیا۔

عیسائی زائرین اپنے اپنے گہرے تاسف کا اظہار کر چکے تو اس نے پھر سے بیان شروع

کیا۔ ''مسلمان صدیوں اس ملک پر حکمران رہے ان کے دور میں چرچ نے بہت ترقی کی ان کی تباہی پر چرچ ایک مسجد بھی برداشت نہ کر سکا''۔ میں اس کی جرأت گفتار پر حیران ہوتا رہا اور سٹیفن لمبے چکر پر نکل گیا۔ اس کی تلاش میں نکلا تو وہ ایک ویران کونے میں رکھے بنچ پر خاموش بیٹھا تھا۔ اسی اپنے روایتی گم سم انداز میں۔ ''یہاں سے ویو بہت خوبصورت ہے''۔ اس نے بنچ کا ایک حصہ میرے لئے خالی کر دیا۔ مسجد کو اس بے ڈھب انداز میں گرجا گر جا کیا گیا ہے کہ محرابی ستونوں کی قطاریں جگہ جگہ سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ اس زاویہ سے کچھ قطاریں کافی دور تک سلامت تھیں۔ میں نے کیمرہ آنکھ سے لگایا۔ سٹیفن نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ''یہ کیا کرنے چلے ہو اس منظر کی وسعت اور گہرائی کسی کیمرے کی آنکھ میں نہیں سما سکتی اسے محسوس کرو اور ذہن میں محفوظ کر لو۔''

آنکھ بند کر کے ذہن کا شٹر گھمایا تو نور کی ایک کرن دِل سے پار نکل گئی۔ الف لیلیٰ کی داستان گو شہزادی نے حاکمِ شرق کو دیارِ غرب کی ایک مسجد کے بارے میں بتایا تھا کہ اس کی چھت میں جڑے گنبدوں کی نوکیلی کھڑکیوں کے راستہ اہلِ ایمان پر نورِ آسمانی برستا رہتا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہو؟''

''گنبد جن کی نوکیلی کھڑکیوں سے نورِ آسمانی اہلِ ایمان پر برستا رہتا تھا۔''

''وہ تو مسجد کی چھت میں تھے۔''

''مَیں بھی تو مسجد دیکھنے ہی آیا ہوں۔''

''پھر تو آپ تھوڑے سے لیٹ ہو گئے یہی کوئی ساڑھے سات صدیاں۔ ویسے میں خود بھی اتنا ہی لیٹ ہوں، لیکن اس میں ہمارا کوئی قصور بھی تو نہیں ہم تو دوسروں کے گناہوں اور حماقتوں کے سزاوار ہیں نہ آپ مسجد گنوانے کے ذمہ دار ہیں نہ میں یہ بدصورت گرجا کھڑا کرنے کا قصوروار۔'' وہ تھوڑا سا مسکرایا۔ ''آؤ تھوڑی دیر کے لئے ہم مسجد اور گرجا کو بھول جائیں اور اس خوبصورت عمارت کے باقیات کو سمجھنے کی کوشش کریں تا کہ مسجد بنانے والوں کی فنی عظمت اور بگاڑنے والوں کی فکری پستی کا اندازہ ہو سکے حسن عیسائی ہے نہ مسلمان۔''

میں نے مسجد اور کلیسا کو دل و دماغ سے نکالنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ میرے سامنے دو اٹل حقیقتیں موجود تھیں۔ حریم قرطبہ اور اس کے قلب میں پھنسی گرجا کی پھانک۔ اس جگہ کبھی مندر تھا پھر معبد بنا، کلیسا نے مسجد کو جگہ دی اور پھر دنیا کی وسیع ترین مسقّف مسجد کا وجود چھلنی چھلنی ہو گیا۔ مسجد کی چھت کے نیچے چار پانچ درجن چھوٹے موٹے گرجا گوشہ نشیں ہیں۔ یہ کیسے ہوا؟ یہ کیوں ہوا؟ حقائق ایک دوسرے میں ضم ہو گئے یا قوی حقیقت کمزور کو نگل گئی؟ حقیقت کی قوت کس حقیقت میں ہے؟ رومی ایک حقیقت تھے قوطی ایک حقیقت تھے، مسلمان ایک حقیقت تھے انہیں کیا ہوا؟ اٹل حقیقت کیا ہے، آستانۂ حسن کے ٹھنڈے نمناک فرش کے نیچے مدفون مٹی؟ جو پہلے بھی یہیں تھی آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔ اس مٹی نے رومنوں کا قہر دیکھا، قوطیوں کا عیش دیکھا، اہلِ حرم کا طیش دیکھا اور ان سب کو ان کے قہر طیش اور عیش سمیت نگل گئی، جو کچھ بچا ہے اس کی منتظر ہے سب کچھ اسی کا ہے سب کچھ اس کی جھولی میں گرے گا کوئی بچ کر کہاں جائے گا؟ کوئی بچ کر کیسے جا سکتا ہے؟

انسان زندہ ہو تو مٹی پاؤں چومتی ہے، رُوح نکل جائے تو مٹی کا محتاج ہے، اقوام انسانوں کے گروہ ہوتے ہیں انسان ہی کی مانند ہیں۔ مٹی کا پتلا مٹی کے سینے پر اینٹ پتھر کے گھروندے کھڑے کر کے سمجھتا ہے اس نے مٹی کے سینے پر مہر ثبت کر دی ہے، گھروندے رہ جاتے ہیں پتلا مٹی میں مل جاتا ہے۔ ''اس مٹی کو انسان اور اقوام سے بیر کیوں ہے؟''

''قومیں اپنے گناہوں کے بوجھ سے مٹی ہوتی ہیں معصوم مٹی کو الزام نہ دو۔''

''انسان جب دُنیا میں آتا ہے تو معصوم آتا ہے۔''

''یہ معصوم مجرم کیسے بنتا ہے؟''

''دھرتی اور اس کی نعمتوں کے عشق میں۔''

''جنت دھرتی پر تھی؟'' اس کے اندر سے عیسائی سر نکالنے لگا۔

''جنت تو دھرتی پر نہیں تھی انسان نے جنت کو بھی زمین سمجھ لیا تھا۔''

''اور زمین کو جنت سمجھ کر اس کے سینے پر بھی جنت والی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔''

مسلمانوں نے ارض اندلس کو جنت بنایا پھر قوم مسلم نے اس زمین پر جنت والی حرکتیں

دہرائیں۔وہ اس جنت سے نکالے کیوں نہ جاتے۔''اگر جنت ایسی ہی تھی تو پھر تو زمین پر آ کر ہم بہت گھاٹے میں رہے''۔سٹیفن نے سیمیں کھجوروں کی سنہری شاخوں کو آپس میں بغل گیر ہوتے دیکھ کر کہا۔

ایک بیس سالہ اموی شہزادے پر اس کے اجداد کی وسیع وعریض سلطنت کے زمین وآسمان تنگ پڑ گئے،صحرا اور سمندر اسے پناہ نہ دے سکے تو وہ اندلس کے ساحل پر اترا۔بے پناہ خوف اور باعمل خواہش کے ہتھیاروں سے مسلح اس شہزادے نے اندلس کی عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ جب دمشق کے عباسی حکمران اس اموی حکمران کے خوف سے کانپ رہے تھے تو قرطبہ کا اموی حکمران جامع دمشق اور صحرائے عرب کے نخلستانوں سے جدائی میں ملول رہتا تھا۔اس نے نخلستان اور جامع کو یکجا کرنے کا خواب دیکھا۔ جب ہزاروں معمار اور مزدور خوابِ امیر کی تعبیر میں مصروف ہوتے تو امیر خود ان کی نگرانی کرتا پھر بھی تسلی نہ ہوتی تو مٹی گارا اپنی پیٹھ پر لاد لیتا۔ سالخوردہ امیر کے جسم اور روح سے آشنا مٹی پر ہم سب جوتوں سمیت چل رہے تھے۔یہ مٹی کتنی بلند بخت ہے،کتنی بد بخت ہے۔

تعمیر مکمل ہوگئی،تکمیل تشنہ تھی،امیر کا پیمانہ انتظار لبریز ہوگیا حکم افتتاح جاری فرمایا،اولین خطبہ جمعہ خود دیا،شاہی سفر کے لئے نکلے اور سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے۔جو سفر جامع دمشق سے شروع کیا تھا حریم قرطبہ کے منبر پر تکمیل پذیر ہوا۔آخر منزل پر سے سب سے آخری منزل کے لئے چل دیئے۔بارہ صدیاں گزر چکی ہیں۔امیر کی تعمیر کردہ دیواریں اور محرابیں آج بھی اس کے خواب کو سہارے ہوئے ہیں۔ایک اجنبی زمین پر۔لوگ اہلِ فن کو داد دیتے ہیں،اہل خواب و خواہش کو بھول جاتے ہیں۔فن نے خواب کی کوکھ اور خواہش کے بیج سے جنم لیا ہے۔

صدیوں نخلستان امیر میں اضافے ہوتے رہے۔لڑائیوں اور شورشوں کے درمیان حکمران اس میں اپنے ہاتھ سے پودے لگاتے رہے،اس کی تزئین وآرائش میں لگے رہے،المنصور کے اضافہ کے بعد اس کے مرمریں پودوں کی تعداد چودہ سو سے اوپر بتائی جاتی ہے۔سقوط قرطبہ کے بعد اہلِ کلیسا نے قلب نخلستان کو صاف کر کے وہاں گرجا و قربان گاہ کھڑے کر دیئے۔کلیسا کے پہلو میں فرڈیننڈ اور انفانسو کے مدفن بنے،دائیں بائیں اور دیوار قبلہ کے ساتھ ساتھ درجنوں چھوٹے

چھوٹے گرجا بنا کر یسوع،اس کی والدہ اور ان کے پیاروں کے سپرد کر دیئے گئے،دیوار قبلہ میں صرف کمرہ محراب بچا۔اب اس کمرے کے سامنے آہنی زنجیر لگا دی گئی ہے۔اہل کلیسا نے محرابِ مسجد کو مسجد تسلیم کر لیا ہے اس میں جوتوں سمیت داخلہ کی اجازت نہیں۔دولت ایمانی سے سرشار عربوں نے اندلس کو دارالسلام بنایا دولت سیال سے سرشار عربوں نے مسجد قرطبہ کے محراب کو مسجد تسلیم کرایا۔

ان دنوں قرطبہ کے میئر اور کلیسا کے درمیان مقام مسجد کے بارے میں شدید جنگ جاری تھی۔میئر اسے فن تعمیر کے عالمی شاہکار کی حیثیت سے محفوظ کرنا چاہتا تھا۔اہل کلیسا کو جامع قرطبہ سے بے دخل کرنے کی مہم چلا رہا تھا،کلیسا اپنی ساری سیاسی اور روحانی قوت سے میئر کا مقابلہ کر رہا تھا۔تعمیر مسجد کی بارہ سو سالہ تقریبات میں کلیسا نے شاہِ سپین کو شرکت پر آمادہ کر لیا،میئر نے تقریبات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔شاہ نے رعایا کے جھگڑے میں فریق بننے سے انکار کر دیا۔مرکزی گرجا کے سٹیج پر''اندلس میں زوال اسلام'' ڈرامہ کی ریہرسل ہو رہی تھی۔سکول کے درجنوں بچے امیر المومنین،قاضی وزراء،علماء،ملکہ،شہزادے،جرنیل،درباری،شاعر،مغنی کے مخصوص لباس پہنے اپنے اپنے حصہ کا کردار ادا کر رہے تھے۔اردگرد بنچوں پر براجمان بچے اور ان کی استانیاں قہقہے لگا رہے تھے،مسلم سپین میں پادریوں اور عیسائی سورماؤں کے مکالموں پر تالیاں پیٹ رہے تھے۔

سیاح چلتے چلتے رُک جاتے،گائیڈ انہیں آگاہ کرتے کہ کس طرح اندلس کی مسلم سلطنت بامِ عروج تک پہنچی اور پھر حکمران قوم قعر مذلت میں گم ہوگئی۔اس کی مسجدیں گرجوں میں تبدیل ہو گئیں۔کیسے؟ بارہ سو سالہ تقریبات کا یہ داستان عروج وزوال بھی ایک حصہ تھی۔چھوٹے بڑے بچے یہی داستان پیش کرنے کی ریہرسل کر رہے تھے۔

''کل یہ ڈرامہ دیکھیں؟''سٹیفن نے تکلفاً پوچھا۔

''نہیں آپ دیکھیں۔''

''میں ترجمہ کر دوں گا۔''

''شکریہ۔''

''وجہ؟''

''یہ کہانی مسجد کے در و دیوار پر کندہ ہے۔ چشمِ بینا اس نیم تاریکی میں بھی پڑھ سکتی ہے یہ منحنی تھکے ماندے ستون زبانِ حال سے مسلمانانِ اندلس کے عروج و زوال کی داستانِ عبرت سناتے ہیں کوئی سننے والا ہونا چاہئے۔ ابھی جب میں امیر عبدالرحمان کے تعمیر کردہ حصہ سے گزر رہا تھا تو ایمان، عمل، استحکام کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ عبدالرحمان ثانی کے اضافہ کی طرف گیا۔ ستون اتحاد، نظم اور عروج پکارا، الحکم ثانی کے اضافہ میں علم و انکسار کی کہانی سُن کر آیا ہوں، المنصور کا حصہ مسجد آج بھی ہوس، حرص اور لالچ سے پناہ مانگتا ہے جو کہانی ایمان و عمل سے شروع ہوئی وہ لالچ و ہوس پر اختتام کو پہنچی۔ عروج کی ہر داستان اسی مقام سے شروع ہوتی ہے۔ زوال کے ہر ڈرامہ کا آخری سین یہی ہوتا ہے''۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور آگے چل دیا۔ گنبد، جن کی نوکیلی کھڑکیوں سے اہل ایمان پر نورِ آسمانی برستا تھا اسی سٹیج کی سیدھ میں تھے۔ عیسائی معماروں نے حصہ اولین کی چھت کو بپتسمہ دیا تو ایک نور افشاں گنبد بے نشان ہو گیا۔ دوسرا گنبد مرکزی گرجا اور مدفن شاہی کی نذر ہوا، یہ دوسرا گنبد حسن تعمیر کے تاجِ شاہی میں جڑا کوہِ نور ہیرا تھا۔ سٹیفن خود بھی چھت میں گنبد رفتہ کے آثار ڈھونڈ رہا تھا۔ ''ہم ہمیشہ سے کوہ نور لٹاتے رہے ہیں کوئی آپ نے تاجِ شاہی میں سجالیا کوئی مدفن شاہی پر لٹا دیا۔''

''مجھے بھی تو اس کے لٹانے کا دُکھ ہے۔''

دوسری طرف ایک گائیڈ سیاحوں کو نور افشاں گنبد کی گمشدگی کا یہی قصہ سُنا رہا تھا اور سفید مائیاں لمبی لمبی آہیں کھینچ رہی تھیں۔ ایک پادری جی اپنے تقدس مآب لباس میں مقید کہیں سے برآمد ہوئے۔ ایک لمحہ کے لئے رُکے، گائیڈ کی روانی کے زیرِ اثر دایاں ہاتھ گلے میں سنہری زنجیر سے لٹکی صلیب تک لے گئے۔ پھر تیزی سے چلتے ہوئے سیمیں جنگل میں پھنسے اندھیرے میں کہیں روپوش ہو گئے۔ کسی کیمرے کی فلیش منظر زوال کو محفوظ کرنے کے لئے آنکھ جھپکتی تو نخلستان کا حسنِ نہاں ایک لمحہ کے لئے سیاہ ماتمی ردا چہرے سے سرکاتا اور فلیش کی آنکھ بند ہوتے ہی نیم تاریکی کے سمندر میں نیم دروں نیم بیروں حالت میں چلا جاتا۔

محراب کے سامنے تیسرے نور افشاں گنبد کا کچھ حصہ محفوظ ہے۔ نورِ آسمانی کی بجائے اب

اس کی کھڑکیوں کی راہ چھن چھن کر سورج کی شعاعیں آتی ہیں اور گنبد کی اندرونی سطح پر نفیس و نایاب گلکاری لاثانی خطاطی سے منعکس ہو کر چکا چوند پیدا کر کے تاریکی میں گم ہو جاتی ہیں۔

فنِ تعمیر کے مغربی محققین تا امروز اس تلاش میں ہیں کہ عربوں نے گنبد کو سہارا دینے کے لئے ہندسی محرابیں بنانے کا فن سیکھا کہاں سے تھا یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ اہلِ یورپ نے یہ راز مسجد قرطبہ کی محرابوں سے پایا ہے وہ یہ تسلیم کر کے مزید شرمندہ نہیں ہونا چاہتے کہ عربوں نے یہ فن سیکھا نہیں ایجاد کیا تھا۔

سٹیفن محراب کے سامنے مبہوت کھڑا اپنی سنہری داڑھی میں سفید انگلیوں سے ہل چلا رہا تھا دو بچے دوڑتے ہوئے آئے اور اس کی داڑھی کے زیرِ سایہ ایک دوسرے کو کچھ اشارے کرنے لگے۔ زائرین کی ٹولی بچوں کو گھورتے ہوئے گزر گئی۔ ایک بچے نے زور سے تالی بجائی، سٹیفن نے آنکھیں کھول دیں۔

شرارتی بچے قہقہے لگاتے ہوئے بھاگ گئے۔

زائرین کا دوسرا ریلہ آیا اور ہمارے اور محراب کے درمیان حائل ہو گیا۔ گائیڈ نے آموختہ اُگلنا شروع کیا تو سٹیفن نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ ''حسن کے نابینا سیلز مین'' وہ بڑبڑایا۔

آگے پیچھے دائیں بائیں مدفن سجود دُور تک پھیلا تھا۔ سوا پانچ صدی کے سجدوں کا مدفن اہل تقویٰ کے سجدے، اہلِ زُہد کے سجدے، اہل سوز کے سجدے، اہلِ علم کے سجدے، اہلِ حلم کے سجدے، اہلِ عشق کے سجدے، اہلِ اقتدار کے سجدے، اہلِ دل کے سجدے، اہل درد کے سجدے، سجدے جو اعزاز خاک تھے۔ ایک اور سجدے سے اس خاک کو کیا فرق پڑے گا۔ میں نے ارادہ بدل لیا۔ جیب سے رُومال نکال خاک آلودہ کیا آنکھوں سے لگایا تو اس سے پانی برسنے لگا۔ پھر اس پانی کا رنگ سُرخ ہو گیا۔ لہو رنگ پانی، یہ خون جگر ہے؟ آنکھ سے ٹپکا اور خاک فرش میں جذب ہو گیا یا خون مسلم جو تیغِ مسلم نے بہایا؟ وہ خون ہے جو حرم قرطبہ کی ایک ایک اینٹ کے چہرے کی سُرخی میں شامل ہے یا وہ خون مسلم جس کا یہ بدصورت گرجا شکر گزار ہے؟

چند بچے محراب کے سامنے رکوع و سجود کی ریہرسل کرنے لگے۔ سیاحوں نے تالیاں

بجائیں۔ بچے کھل اُٹھے، قطرہ آب آنکھ سے ٹپکا اور خاک گزیں ہوگیا۔ کسے معلوم صدیوں کی گرد میں کتنے ہزار لاکھ قطرہ ہائے آب دفن ہیں۔ وہ آنسو بھی اسی خاک کے پاس امانت ہیں جن سے قاضی محمد البلوطی کی ریش مبارک تر بتر ہوئی جنہیں دیکھ کر خلیفۂ نو نے مسجد پیوند خاک کر کے تعمیرِ نو کا منصوبہ واپس لے لیا تھا۔

بعض کو اعتراض تھا کہ سمتِ قبلہ درست نہیں الحکم نے علماء وزراء کو اندرون مسجد جمع کیا سمت قبلہ پر اعتراض دور کرنے کے تخریب وتعمیر مسجد کے باب میں مشورہ مانگا۔

''تمہارے اجداد اسی رُخ نمازیں پڑھتے رہے اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی دعائیں اور نمازیں قبول ہوئیں، وہ رحمتوں اور برکتوں سے نوازے گئے۔'' جامع قرطبہ کی سمت قبلہ آج بھی وہی ہے۔ قاضی البلوطی کے آنسوؤں سے ارادہ امیر بدل گیا۔ آنسوؤں سے شاہی ارادے بدل سکتے ہیں۔ خدائی اصول تبدیل نہیں ہوتے۔ فطرت اقوام کو ان کے عمل وعزم سے ناپتی ہے، ان کے افراد کے آنسوؤں سے نہیں۔

''اموی دمشق سے آئے تھے ان کے قلب وذہن پر شام اور دمشق کی محبت کا اتنا اثر تھا کہ انہوں نے محرابوں اور نمازوں کا رُخ مکہ کی بجائے دمشق کی طرف موڑ لیا۔'' ایک گائیڈ کہہ رہا تھا۔

''اس کا کوئی قصور نہیں محققین اندلس نے کتابوں میں یہی لکھا ہے۔'' سٹیفن نے میری طرف دیکھ کر سر جھکا لیا۔ شاید وہ یورپ کے معیارِ تحقیق پر شرمندہ تھا۔

دیوارِ قبلہ سے باہر نکلتے ہفت پہلو کمرۂ محراب کے دروازے سے پہلے لگی زنجیر کی دیوار گریہ سے آگے رشکِ دودھ روشن ضمیر سنگِ مرمر کا چہرہ خاک آلود ہو رہا تھا۔ ایک عاشقِ فن ہجومِ خلق سے بے نیاز فرش پر دراز گنبد محراب کی اندرونی گولائی پر کی گئی گلکاری اور سنگِ مرمر کے معجزوں کو کیمرے کی آنکھ میں مقید کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ محراب کے در داخلہ کی عظیم الشان محراب کا بوجھ نایاب نیلے اور سُرخ سنگِ مرمر کے چار ستون اپنے سروں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ مرمریں محراب کے گرد قیمتی لکڑی کا وسیع بارڈر تھا جس پر خطاطوں اور نقاشوں نے اپنے اپنے کمالِ فن کی مہریں ثبت کی تھیں۔ اٹھارہویں صدی کے ایک وائلن نواز نے لکڑی اتار کر اس کی جگہ ہندسی اشکال کا بارڈر بنا دیا۔ اس بارڈر میں شیشے کے ٹکڑے سجائے گئے اس کے گرد نیلی زمین پر سنہری

تحریریں اب بھی باقی ہیں۔ کمرۂ محراب کے اندر اور درِ داخلہ کی محراب کے گھیرے میں سُرخ اور نیلی زمین پر سنہری حروف میں لکھے اسمائے الٰہی اور آیات قرآنی اب بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ فلیش کی روشنی گنبد محراب کی قوسوں اور زاویوں سے ٹکرا کر نقش ونگار پر پڑتی تو رنگ رنگ کی پھلجھڑیاں پھوٹ پڑتیں۔ درِ داخلہ محراب کے حسن اور آرائش کے بیان میں فنِ تعمیر کی اصطلاحات اور فانی انسانوں پر نازل شدہ لافانی الفاظ کنگال ہو جاتے ہیں۔ اس مقام پر انسان کے بس میں صرف یہ ہے کہ وہ ان معجزہ ہائے فن کو دیکھے اور دنگ رہ جائے۔ تعمیر، تزئین، آرائش، زیبائش اور تحریر انسان اور اس کا قلم کسی ایک حسن کے بیان پر قادر نہیں ہیں۔

''اس کونے میں ایک بلند کرسی رکھی ہوتی تھی۔ مسلمانوں کا چیف پریسٹ جمعہ کے روز اس کرسی پر بیٹھ کر انہیں نیک کاموں کی تلقین کیا کرتا تھا۔''

''مسلمان اور نیکی؟'' ایک بوڑھے سیاح نے گائیڈ کے وعظ میں لقمہ دیا پھر وہ اپنے طنز پر خود ہی مسکرا دیا۔

گائیڈ نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ وہ جلد از جلد اس گروپ کو فارغ کرنا چاہتا تھا۔ دروازہ بند ہونے تک وہ ایک اور گروپ کو بھگتا سکتا تھا۔ ''اس کرسی کی دنیا میں کہیں مثال نہیں تھی آٹھ کاریگروں نے آبنوس، صندل اور بقم کے چھتیس ہزار ٹکڑے جوڑ کر پورے سات سال میں وہ کُرسی مکمل کی تھی، ٹکڑے جوڑنے کے لئے سونے چاندی کے تار میخیں استعمال کی گئیں، کُرسی پر ہیرے اور جواہر لگے تھے۔''

''کرسی نہیں مانبر، مانبر'' گروپ کے پیچھے سے ایک سفید سر بڑھیا اپنی گائیڈ بک اُوپر اٹھا کر چلائی،

''معلوم ہوتا ہے آپ لندن کے وکٹوریہ البرٹ میوزیم کی ڈائریکٹر رہ چکی ہیں'' گائیڈ نے بڑھیا پر فقرہ پھینکا۔ ''آپ وہاں رکھی کُرسی کو مانبر کہتی ہوں گی۔ مورا سے منبر کہتے تھے۔ الحکم نے اس منبر پر چھتیس ہزار سُرخ دینار خرچ کئے تھے۔''

''پھر تو آپ نے وہ بے مثال منبر ضرور محفوظ کر لیا ہوگا کس میوزیم میں رکھا ہے آپ نے وہ منبر؟'' بڑھیا نے بدلہ چکانے کے لئے پیچھے سے سوال کیا

''اس منبر کا کیا ہوا کسی کو کچھ معلوم نہیں''۔

''وکٹوریہ البرٹ میوزیم والوں سے پوچھ لیں انہیں ضرور پتہ ہوگا۔'' بڑھیا کی ہم سن سہیلی نے مشورہ دیا اور اپنی سہیلی کی جانب داد طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

''جانا کہاں تھا منبر نے پادریوں نے ہیرے جواہرات اتارنے کے بعد سونے چاندی کی میخیں نکال لی ہوں گی۔'' پہلی بڑھیا نے مزید وار کیا۔

ایک ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا۔

گائیڈ نے پھر سے آموختہ اگلنے ہی میں مصلحت جانی۔ ''اس منبر پر مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن کا ایک تاریخی نسخہ رکھا تھا جب مسلمانوں نے اپنے اولیں دارالخلافہ مدینہ میں اپنے ایک خلیفہ کو شہید کیا تو وہ اس نسخہ کی تلاوت کر رہا تھا۔ اس پر اس خلیفہ کے خون کے دھبے تھے'

''وہ یہ نسخہ اس لئے قرطبہ لائے ہوں گے کہ اس پر خون دیکھ کر ہی مسلمان یہاں ایک دوسرے کا خون نہ بہائیں''۔ ایک بوڑھے سیّاح نے اپنی پوری قوت صرف کرتے ہوئے کہا۔ اس کا سر کسی کمانی دار پتلی کے چھوٹے سے سر کی مانند مسلسل چکر میں دکھائی دیتا تھا۔

قہقہہ محراب کی قوسوں اور زاویوں سے ٹکرا کر مڑا اور مرمریں جنگل میں سے راستہ بناتا ہوا مسجد کے درِ داخلہ سے باہر نکل گیا۔

''اس قرآن کی جلد سونے کی تھی جس میں یاقوت جڑے تھے۔''

''پھر تو پادریوں کے مزے ہو گئے ہوں گے۔''

''قرآن کا وہ نسخہ آپ نے کس گرجا گھر میں محفوظ رکھا ہے۔'' بڑھیا گائیڈ پر اب بھی ناراض معلوم ہوتی تھی۔

''خواتین وحضرات آپ کے پاس وقت بھی ہے وسائل بھی ہیں، آئندہ موسمِ سرما میں آپ اس نسخہ کے بارے میں تحقیق کریں کہ وہ کہاں ہے اگر کچھ پتہ چل جائے تو مجھے آگاہ فرما دیں۔ میں آپ کا شکر گذار ہوں گا۔ یہ بھی ممکن ہے آپ کی اس عظیم خدمت سے خوش ہو کر قذافی آپ کو لیبیا کے دورہ کی دعوت دے ڈالے'' اس نے بڑھیا کو مخاطب کیا۔

''قذافی!'' دو تین مائیوں کی مشترکہ چیخ نکل گئی۔

''محراب کی چھت سے لٹکی سنہری زنجیر سے سینتیس فٹ محیط کا روپہلی فانوس لٹکتا تھا اس فانوس میں

ایک ہزار سے زائد شیشے کے لیمپ روشن ہوتے۔ رات کو جب سب لیمپ روشن کئے جاتے تو محراب کی دیواروں میں جڑے ہزاروں قیمتی پتھر جگنوؤں کی مانند چمکتے۔ محراب میں پریسٹ نور کا فرشتہ دکھائی دیتا تھا۔''

''خاکی خلیفہ نوری پریسٹ سے حسد تو کرتا ہوگا؟'' ایک سیّاح نے وضاحت چاہی۔

''حسد کا تو پتہ نہیں خلیفہ کو پریسٹ پر کبھی کبھی غصہ بہت آتا تھا جب وہ بادشاہ پر تنقید کرتا یا اسے کسی بات پر ٹوکتا تھا، مسلمانوں کے پریسٹ بہت طاقتور ہوتے ہیں اسی لیے تو المنصور انہیں خوش کرنے کے لیے اتنا پیسہ خرچ کیا کرتا تھا'' گائیڈ نے المنصور کے اضافہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ویسے بادشاہ کو حسد کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مسجد میں بادشاہ اور اس کے وزراء کے لئے الگ کمرہ بنایا گیا تھا جس کا فرش چاندی کا اور دروازہ سونے کا تھا اس کی دیواروں پر بلور کے ٹکڑوں اور رنگین نگینوں کا جڑاؤ کیا گیا تھا۔ ستونوں پر فیروزہ اور سونے کے بیل بوٹے تھے۔ بادشاہ کے محل سے اس کمرہ تک زیرِ زمین راستہ بنا ہوا تھا۔''

وہ اپنے گاہکوں کو مقصورہ کے بارے میں بتا رہا تھا اور مَیں سوچ رہا تھا سوکھی کھجور کے ستونوں پر تنی چٹائیوں کے چھپر کھٹ کے نیچے فرشِ خاک پر سجدہ ریز ہونے والوں کے سامنے زمین کی وسعتیں سمٹ گئیں اور بلوریں ستونوں پر کھڑی سنہری چھت کے زیرِ پناہ روپہلے فرش پر سجدہ کرنے والوں پر ان کے اپنے شہر اور دیس کی زمین تنگ ہو گئی۔ حضور و سرور سرفراز رسم و نمود بے ثباتِ، عظمتِ عمل فروغ پذیر کمالِ فن زوال نصیب، نگاہ شوق زمرد و یاسپر کے ستونوں پر سے پھسلتی خاکِ فرش میں پیوست ہوئی۔ مخروطی انگلیاں شکست نظر کے انتقام میں ناکام رہیں تو جسمانی قوسیں، ستون گیر ہونے لگیں۔

مقصورہ مرحوم کی فضا آہ اور واہ سے بوجھل ہو گئی۔

مَیں کسی مزید تاریک کونے کی تلاش میں ہجومِ واہ سے الگ ہو گیا۔ ریشمیں تاریکی نے بڑھ کر آغوشِ الم میں لے لیا۔ آنکھ کھولی تو وسیع و عریض گرجا کی پھانک کا نشان تک نہ تھا۔ رنگ رنگ کے مرمریں ستون روشنیوں کے متحرک سیلاب میں کانپتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ پھر مسجد

میں نمازیوں کی آمد شروع ہوگئی۔ اندر اور باہر کہیں تِل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ میرے دائیں طرف ایک باریش بزرگ آنکھیں بند کئے دانہ دانہ تسبیح گرا رہے تھے جیسے تسبیح ایام کا فریضہ انجام دینے پر مامور ہوں دانہ دانہ، زمانہ زمانہ، دیوار قبلہ ایک جگہ سے شق ہوئی، سفید قفقکان، سفید عبا، سفید پاجامہ، سُرخ وسفید رنگت، سیاہ تالاب آنکھیں، عقابی ناک، فولادی جسم، خلیفہ الحکم اس شگاف سے برآمد ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا روپہلی فرش پر قطار اوّل میں دوزانو بیٹھ گیا، نمازیوں میں سے کسی نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا کسی نے نگاہ بچا کر دیکھا، کسی نے لاپرواہی سے مُنہ موڑ لیا خطبہ وقیام وسجود کی منزلیں مکمل ہوئیں، پچیس ہزار افراد ایک دُعا، رحمت وبرکت باری، اتحاد مسلم اور استحکام سلطنت کی دُعا۔

خلیفہ جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے سپردِ سرنگ ہوا۔ امام ومقتدی ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔ مسجد ایک بار پھر خالی ہوگئی۔ باریش بزرگ اپنی جگہ بیٹھا اب بھی دانہ دانہ گرا رہا تھا۔ پھر سب روشنیاں گل ہوگئیں۔ تہہ در تہہ اندھیرے میں سفید چمکدار ستون میری طرف بڑھنے لگے۔ ان کے بڑھتے ہوئے بازوؤں سے بچنے کے لئے میں اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹتا گیا۔ اندھیرے میں قہقہے بلند ہونے لگے۔ خوفناک قہقہے ستونوں اور قہقہوں سے بچتا ہوا میں اسی در سے ٹکرایا جس سے خلیفہ اپنے محل کی طرف روانہ ہوا تھا۔ در کھل گیا لیکن سُرنگ میں اس سے بھی زیادہ اندھیرا تھا۔ شدید سردی کی وجہ سے میرے دانت بجنے لگے۔ اندھیرے میں کہیں دُور سے آوازیں آ رہی تھیں، دیواروں کو ٹٹولتا ہوا مَیں آوازوں کے سہارے آگے بڑھنے لگا۔

نیم تاریکی میں شب خوابی کے ریشمیں لباس میں ملبوس مجھ سے بھی زیادہ خوفزدہ ایک شخص معصوم بچے کو سینے سے لگائے کانپ رہا تھا۔ سردی سے بچے کا جسم نیلا ہو رہا تھا اسے گرم رکھنے کے لئے وہ بچے کو سینے سے چمٹاتا تو اس کے اپنے جسم کی سردی سے بچے کا رنگ اور نیلا پڑ جاتا۔ ننگے سر ننگے پاؤں چند سہمی ہوئی خواتین حرم ایک طرف کھڑی تھیں۔ اس اندھیرے میں چمکتی تلواریں اور نیزے ان کا محاصرہ کئے تھے۔ ''اس بچے پر ترس کھاؤ خدا کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا لا دو اسے ڈھانپنے کے لئے کپڑا دے دو مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہئے۔ ان سے کہہ دو میں خلافت سے دستبردار ہوتا ہوں۔''

نیزوں اور تلواروں والے خاموش رہے، چہرے تنے ہوئے، لب سلے ہوئے۔ وہ جلال اور یہ زوال، آلِ امیر خلافت کے سٹیج پر زوالِ مسلم کے ڈرامہ میں اپنا اپنا پاٹ ادا کر رہی تھی۔ قصر خلافت کی طرف سے قہقہوں اور چیخوں کی خوفناک آوازیں آ رہی تھیں۔ مسجد میں قہقہے، قصر میں قہقہے، سرنگ میں سردی بے بسی میں اس دیوار کے سہارے مسجد میں واپس آ گیا بزرگ نے تسبیح کا ایک چکر پورا کر لیا تھا گرجے کی سٹیج پر سکول کے بچے ڈرامہ زوال اسلام کی ریہرسل کر رہے تھے۔

''آکسیجن اور ہائیڈروجن کو الگ الگ کر دو۔+ وادی الکبیر خود بخود نابود ہو جائے گا''۔ چیتھڑوں میں ملبوس ایک کردار نے اپنا مکالمہ دہرایا، ریشمیں لباس اور اونچے مرتبہ والوں نے طنزیہ قہقہہ لگایا۔ ''آکسیجن اور ہائیڈروجن کو الگ الگ کر دو؟''

بدبختی کے لق ودق صحرا کے مرمریں نخلستان میں ملک ملک اور دیس دیس کے سیّاحوں کے مزید کارواں اتر چکے تھے۔ ان میں سے راستہ بناتا ہوا میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ درِ داخلہ پر اب بھی زائرین کا ہجوم تھا، صحن میں سکول کے بچے کھیل رہے تھے، مغربی دیواروں کا سایہ مشرقی دروازے تک پہنچنے کے لئے پتھریلے فرش پر پیٹ کے بل رینگ رہا تھا، ابن رشد کے پیچھے سنگ بردار علماء قرطبہ تھے میرے پیچھے نقشہ بردار سٹیفن۔ ''مَیں نے آج بہت کچھ دیکھ لیا ہے اتنا کچھ اور کہیں ایک ہفتے میں دیکھنے کو نہ ملتا۔ اس خوشی میں آج رات میں اپنے اعزاز میں ایک شاندار دعوت کا اہتمام کر رہا ہوں جو کچھ دیکھا ہے اسے رات دماغ میں محفوظ کروں گا۔ اتوار کو پھر مسجد دیکھوں گا، اس روز ٹکٹ نہیں لگتا۔ آموختہ دماغ کے تہہ خانوں میں بیٹھ چکا ہوگا''۔ سٹیفن نے آپ ہی اپنا کندھا تھپکتے ہوئے اپنے آپ کو شاباش دی۔ ''جب میں پی ایچ ڈی کر لوں گا تو رات کو مسجد کھلوا کر دیکھ سکوں گا۔ کئی راتیں اندر گزاروں تو کچھ سمجھ میں آئے گا۔''

معلوم نہیں کیوں مجھے سٹیفن کی خوشی پسند نہیں آئی۔ مسجد کی مغربی دیوار کے ساتھ درجنوں تانگے کھڑے تھے، کچھ سیّاحوں کو قرطبہ کی سیر کے لئے لے جا رہے تھے کچھ اپنے مقدر کے سیّاحوں کو واپس لائے تھے اور نئے شکار کے انتظار میں تھے۔ ایک تانگہ بان نے آگے بڑھ کر اپنی زبان میں کچھ کہا میں اس کی بات نہیں سننا چاہتا تھا۔ سٹیفن اس سے بھاؤ کرنے لگا۔

مسجد سے قصرِ خلافت تک کے زیرِ زمین راستہ کی لحد کو روند کر گزرتی سڑک سے ہوتا ہوا مَیں

وادی الکبیر کے پُل کی طرف نکل گیا۔ ''گہرے رواں دریاؤں کا بادشاہ'' بڑے پُرسکون انداز میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ یکجان آکسیجن اور ہائیڈروجن سے لبریز۔ ایک بربر جرنیل نے عرب فوجوں کے ساتھ اسی پُل سے گزر کر قرطبہ پر اسلامی پرچم لہرایا تھا پھر ایک روز اسی جگہ عرب تلوار بربر تلوار سے ٹکرائی اور ایک ہی دن میں پچیس ہزار مسلمان کافر کی موت مر گئے۔

آکسیجن اور ہائیڈروجن کی علیحدگی کے اس عمل کیمیا کے نتیجہ میں قرطبہ کی اسلامی سلطنت کا وادی الکبیر نابود ہو گیا تو عظمت کی بلندیوں کو چھونے والوں کی اولاد شہر و جامع عیسائیوں کے حوالہ کر کے اسی پُل سے گزر کر ذلّت اور رُسوائی کے سفر پر نکلی تھی۔ چارے کنیاں خالی لے کر جان کی امان اس شرط پر ملی تھی کہ کوئی مُسلمان کچھ بھی ساتھ نہ لے جائے گا۔ اپنے جسم کے علاوہ

دین گنوایا دُنی پہ دُنی نہ چلی ساتھ۔

جس گھر کو آگ لگ گئی.....

قرطبہ کے بلند میناروں کے سروں پر سنہری تاج چمکنے لگے تو المنصور کے قدم پیوستِ سنگ ہو گئے۔ الزاہرہ کے مرمریں بُرج شفق شعار تھے۔ اشجار کے سائے محلات کی طرف بڑھے آتے تھے۔ محل و مینار کی چوٹیوں پر قربان ہوتی شفق، ان کے جسموں سے لپٹے سائے، المنصور کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ ہمقدم جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ ''زوال نصیب زاہرہ کاش میں اسے جان سکتا جو تیری عظمت خاک در خاک کر لے گا''۔ خلافت مغرب کے ناقابلِ تسخیر وزیر اعظم کی آنکھ نمناک ہو گئی۔

''خدا ہم پر رحم کرے اندلس کی عظمت کبھی گہن آلود نہ ہو گی۔''

''تمہاری آنکھ بے مثل الزاہرہ کی تباہی کا تماشہ کرے گی وہ وقت دور نہیں جب اسے لوٹ کر برباد کر دیا جائے گا، میری آنکھ الزاہرہ کے کھنڈرات دیکھ رہی ہے۔'' دانائے اندلس المنصور کی آواز حلق میں پھنس گئی ''خانہ جنگی کی آگ میرے عظیم وطن کو راکھ کر دے گی مجھے اس آگ کے لپکتے شعلے نظر آ رہے ہیں''۔

اور پھر جلد ہی بے مثل الزاہرہ لوٹ کر برباد کر دیا گیا۔ خانہ جنگی کی آگ المنصور کے الزاہرہ سے شروع ہوئی اور عظیم اندلس کو جلا کر راکھ کر گئی۔

عظیم اندلس کے ایک سیاح نے لکھا تھا۔ ''اسلامی اندلس میں سینکڑے میل چلے جائیں کہیں کوئی ویرانہ نہیں۔ کسی راہ پر کوئی پیدل مسافر نہیں ملتا۔ ہر طرف ہرے بھرے کھیت اور سرسبز باغ ہیں۔ ہر مسافر کے پاس اپنا خچر ہے۔''

المنصور کی پیشین گوئی پوری ہونے کے بعد اسی مسلم اندلس سے گزرنے والے ایک مسافر نے لکھا ''سینکڑے میل چلتے جائیں کہیں کسی زندہ نفس سے ملاقات نہیں ہوتی۔ ویران بستیاں اُجڑے گھر ہی نظر آتے ہیں''۔

ایک سیّاح نے الزاہرہ کے کھنڈرات سے پوچھا۔ ''عظیم اندلس کے سوار اور شہوار اپنی بستیاں کیوں خالی کر گئے؟''

کھنڈرات خاموش رہے ہوا پکار اٹھی۔

اس گھر کو اگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

محققینِ فرنگ کا اتفاق ہے کہ المنصور کے الزاہرہ میں سوچی کوئی تدبیر کبھی ناکام نہ ہوئی تھی اس کے لشکر ہمیشہ کامیاب و کامران لوٹے۔ مرد تدبیر و شمشیر اپنے الزاہرہ اور اُندلس کی طرف لپکتے شعلے دیکھتا رہا۔ مگر کوئی تدبیر نہ کر سکا یورپ اور افریقہ المنصور کے نام سے کانپتے رہے وہ اپنے گھر میں اندلس کے مسلمانوں کی خانہ جنگی کے سایہ سے لرزاں رہا۔ لپکتے شعلے دیکھتا رہا اور خون کے آنسو بہاتا رہا۔

شام قرطبہ کی سیاہ زلفیں ابنِ حزم کے سفید مجسمہ کے شانوں پر دراز ہو رہی تھیں۔ القصر کے خونیں برجوں سے آگے شعلہ رو آفتاب وادی الکبیر میں غرقِ دریا ہوا تو شام کی سرد ہوا نے مہر بلب لہروں کو جھنجھوڑا وہ پہلو بدل محوِ رفتار ہو گئیں۔ ایک ٹولی رکی اور فاضل اندلس کی عظمت و فضیلت کو سیّاحانہ عقیدت کے پھول پیش کر کے آگے چل دی۔ وقت اذان مینارہ مسجد کی بلندیوں سے گرجے کی گھنٹیوں کی صدا اُٹھی اور فضا میں تحلیل ہو گئی وقت صلوٰۃ جامع قرطبہ کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ تو میں نے ابن حزم سے المنصور کی بے بسی کا سبب جاننے چل پڑا اس کی دستارِ فضیلت کے بل کھل کر بکھر گئے۔ پتھر آنکھ سے دو سُرخ قطرے پتھر کے پیڈسٹل پر گرے اور بے نشان ہو گئے۔

''اندلس کی دھرتی تو پتھر نہ تھی مسلمان تو کسی کے اشک ندامت نہ تھے ان کا انجام تیری آنکھ سے گرے قطرہ سرخ سا کیوں ہوا؟'' جس سوال پر الزاہرہ کے کھنڈرات خاموش تھے میں نے فاضل اندلس کو پیش کر دیا۔

الزاہرہ کی آگ میں قرطبہ کے ہزاروں گھر جلے ابنِ حزم کا گھر بھی ان ہزاروں گھروں میں شامل تھا اس کی اپنی بیگمات بھی ان ہزاروں مسلم خواتین میں شامل تھیں جنہیں دوسری نسل کے مسلمان اغوا کر کے لے گئے تھے۔ وہ کئی سال شہر شہر گھومتا رہا واپس آیا تو قرطبہ ابھی تک تعصب اور نفرت کی آگ میں جل رہا تھا پھر ایک اور انقلاب نے اسے وزارتِ عظمیٰ کی کُرسی تک پہنچا دیا اور سات ہفتہ کے تجربۂ وزارت نے اسے ہمیشہ کے لئے گوشہ نشین کر دیا۔ مسلم اندلس جلتا رہا وہ خونِ جگر میں قلم بھگو نقشہائے لازوال ثبت کرتا رہا۔ اب اس ناپید قوم کے دارالعروس قرطبہ میں ابنِ حزم کا مجسمہ رکھ دیا گیا ہے۔ ابن حزم کی قوم کی بدبختی کی یاد میں یا اس کی فضیلت کے اعتراف میں؟ پتھر کے سینے پر ایک تحریر اُبھری تھی۔ وہ اشعار جو اس نے اپنے قرطبہ کی محبت میں لکھے تھے۔

''المنصور کا قرطبہ قوت میں آج کا واشنگٹن تھا، تہذیب میں آج کا پیرس تھا، صنعت میں آج کا ٹوکیو تھا، ناموری میں صرف دو شہر اس کی برابری کا دعویٰ کر سکتے تھے بغداد اور قسطنطنیہ'' ایک صبح یہودی محلّہ کی نوکیلی گلیوں میں گھومتے سیّاحوں کو ایک گائیڈ بتا رہا تھا۔ مگر ''المنصور کی وفات کے چند ہی سال بعد اس دور کا واشنگٹن، پیرس اور ٹوکیو بیک وقت تباہ ہو گئے''۔

قرطبہ نے آگ جلائی اور اندلس سمیت اس میں کود گیا۔

دانائے اُندلس تیرے محبوب شہر نے خودسوزی کیوں کی؟

''عربی تلوار تہذیب و تعیش سے زنگ آلود ہوئی تو مدبر و منصور نے ملت و ملک کے دفاع کے لئے برادران طارق کو آواز دی۔ تہذیب و ثقافت میں برتری کے مریض عرب قوت و قربانی کی برتری پر حاسد ہوئے۔ اپنے شعر و سخن پر نازاں اہل قرطبہ فوج کے زبان و بیان کی بربریت کے شاکی رہنے لگے۔ اہل مدرسہ اختلافاتِ فقہی کے اسیر اہلِ ثروت سے نفور، متوسط طبقے اونچے طبقہ کے دشمن، فکری انتشار لسانی تعصب گروہی مفادات سے محبت اجتماعی مفاد سے بے نیازی اہلِ نظر ایسی قوم کے مقدر پر آنسو ہی بہا سکتے ہیں۔ اہلِ نظر اس قوم کے انجام پر آنسو بہاتے رہے۔ بے منزل علم بے جہت عالم بے درد تاجر بے حمیت امراء بے نیام تلوار، بے لگام گھوڑا میرے قرطبہ کے بازار میں سب کچھ تھا میرے اندلس کا انجام اور کیا ہوتا؟'' ابن حزم کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔

سیاہی اور دبیز ہوگئی تھی، سڑک پر قمقمے جاگ اُٹھے تھے۔ قرطبہ کے ہوٹلوں کے لاؤنج دیس دیس کے سیاحوں سے آباد ہونے لگے تھے۔ میں باقیاتِ فصیل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا جب تک موسیٰ اور طارق کی آل کی تلواریں ایک ساتھ تھیں قرطبہ میں کوئی فصیل نہ تھی وہ تلواریں آپس میں ٹکرائیں تو اہلِ قرطبہ نے اپنی فوج سے اپنے دفاع کے لئے شہر کے گرد فصیل بنالی۔ مسلمانانِ قرطبہ اور ان کی فوج مِٹ گئے مگر اینٹ پتھر کی اس فصیل کے نشان اب بھی باقی ہیں۔ فصیل کے دوسری طرف ویران قصرِ خلافت اور شاداب باغ ہیں۔ کمال و زوال کی ناقابلِ یقین داستانوں کے شاہد حجر و شجر۔

ان پتھروں نے خلیفہ ہشام کی عظمت و بے بسی بھی دیکھی اور اس کی قوم کی سطوت و بے کسی بھی دیکھی۔ یورپ کا سب سے طاقتور حکمران ہشام اسی قصر کے تہہ خانوں میں کہیں بے نام ہوگیا تھا۔ چونتیس سال کے عروج کے بعد دورِ زوال میں جو بھی کوئی تختِ قرطبہ پر قابض ہو جاتا تھا سب سے پہلے وہ ہشام کو ڈھونڈتا اس سے خلافت اپنے نام لکھواتا اور ایک بار پھر سے اسے کسی برج میں بند کر دیتا۔ ہشام کی خلافت کی بحالی کے نام پر شروع ہونے والی اس خانہ جنگی میں ہشام اور خلافت دونوں مِٹ گئے۔ خلافتِ اندلس کے انجام سے ایک عالم واقف ہے خلیفہ اندلس ہشام کے انجام سے کوئی آگاہ نہیں بعض کا خیال ہے سلطنت کی مانند وہ بھی اس قصر کے کسی نمناک برج میں جان ہار گیا ہوگا۔ ٹھنڈے فرش پر پڑی لاش تاریخ اور ظلم کی گرد کے نیچے دب گئی ہوگی۔ کچھ مؤرخ کہتے ہیں کہ قصر کے محافظوں کو ہشام کی حالت پر ترس آ گیا تھا انہوں نے اسے بھیس بدل کر فرار ہو جانے کی اجازت دے دی تھی پھر کسی اندھیری رات میں اس نے وادی الکبیر کا پُل عبور کیا اور اپنے دارالخلافت، وطن اور یورپ سے دور ارضِ شرق میں کہیں روپوش ہوگیا تھا۔ کسی اجنبی زمین پر زندگی کے بقیہ ایام پورے کرنے کے بعد انجانے لوگوں کے ہاتھوں نامعلوم مٹی میں دفن ہوا۔ عبدالرحمٰن الداخل جان بچانے کے لئے بھیس بدل ارض غرب کے سفر پر نکلا تھا ہشام جان لے کر ارضِ شرق کے گم گشتہ سفر پر روانہ ہوا۔

[illegible] ابڑھتا رہا۔ میں قصرِ خلافت اور جامع قرطبہ کو جدا کرنے والی سڑک پر مُڑا تو مسجد کی سیاہ پوش فصیل [illegible] آن کھڑی ہوئی۔ شبِ سیاہ میں سینۂ بحر پر لرزاں سیاہ پہاڑ۔ ہر طرف ویرانی

کا راج تھا، دن کے وقت یہ حصۂ شہر بہت آباد تھا۔ ملک ملک کے سیاہ قسم قسم کی گاڑیاں تانگے دکانیں بچے بوڑھے گائیڈ اور اب کچھ بھی نہ تھا۔ مسجد کے دروازوں پر تالے پڑنے کے ساتھ ہی دکانیں بھی بند ہو جاتی ہیں۔ سیاہی کے پہاڑ سے بچ کر مَیں بائیں ہاتھ مُڑ گیا۔ قصرِ خلافت کے سامنے احمقوں کا چبوترہ بھی ویران تھا میں اس پر بیٹھ گیا۔ پیچھے قصرِ خلافت کی سیاہی پوش فصیل سامنے جامع قرطبہ کی سیاہ دیوار، ہیبت ناک تنہائی، خوفناک سیاہی، بخت، عمل اور رات کی اس تہہ در تہہ سیاہی میں دمِ احساس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وادی الکبیر کے پانیوں کو چوم کر آنے والی ہوا بھی بوجھل محسوس ہوتی تھی۔

''دیکھئے حضرات یہ ہیں مقدس سانچو اس پر اور مجھ پر ہمیشہ خدا کی طرف سے لعنتیں نازل ہوں۔''
اندھیرے میں ایک آواز گونجی، سامنے میدان میں ایک سر بریدہ دھنی ہوئی برہنہ لاش سُولی پر لٹک رہی تھی۔ ذرہ بکتر کے جال میں بندھی ہوئی تاکہ جسم کا گوشت بکھر نہ جائے۔ اور پاس ہی سانچو کا کٹا ہوا سر چمکدار نیزے پر تنا تھا۔

''دیکھئے حضرات یہ ہیں مقدس سانچو ان پر اور مجھ پر ہمیشہ خدا کی طرف سے لعنتیں نازل ہوں''
پاس کھڑے مستعد نوجوان نے آواز لگائی۔

مَیں چلنے لگا اور خوف میں راستہ بھول کر پھر سے وادی الکبیر پر جا نکلا ''اس پر اور مجھ پر ہمیشہ خدا کی طرف سے لعنتیں نازل ہوں'' سکوتِ شب میں پکارنے والے کی آواز محل اور مسجد کی دیواروں سے ٹکرا کر فضا میں گونج رہی تھی۔ وادی الکبیر کے کنارے اونچے سٹینڈوں پر قطار اندر قطار انسانی کھوپڑیوں کے گلدان سجے تھے اور بنو عامر کا خاندانی قصیدہ گو قرطبہ کا نامور شاعر سعید خاندان بنو عامر کے ایک ایک امیر کی کھوپڑی کے پاس جاتا۔ اس کی ہجو مکمل ہوتی تو دوسری کی طرف چل دیتا تھا۔

المنصور کے بڑے بیٹے مظفر کی وفات پر اس کا دوسرا بیٹا عبدالرحمٰن وزارت کی مسند پر رونق افروز ہوا تو اس کے دل میں خلافت کی خواہش بیدار ہوئی۔ ہشام کی اولاد نہ تھی اپنے خاندانی جاہ و اختیار کی بدولت عبدالرحمٰن نے ہشام کے بعد خلافت اپنے نام منتقل ہونے کی وصیت پر مہرِ خلافت ثبت کروائی۔ بنو عامر کے طویل اقتدار کے حاسد و شاکی امرائے قرطبہ نے خلافت کے

خاندان امویہ سے انتقال کے خلاف رائے عامہ منظم کرنا شروع کر دی۔ ایک اموی شہزادے کو خلافت کے تحفظ کے نام پر بغاوت کی قیادت پر آمادہ کیا۔ عبدالرحمٰن سے نفرت کے اظہار کے طور پر اہلِ قرطبہ اسے اس کے عیسائی نانا سانچو کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ عبدالرحمٰن عیسائیوں کے خلاف ایک مہم پر تھا کہ قرطبہ میں دنیا کا پہلا عوامی انقلاب برپا ہوا۔ انقلاب کے قائد اموی شہزادہ نے المہدی کا لقب اختیار کر کے ہشام سے خلافت اپنے نام لکھوالی۔ اور اسے قصر کے ایک برج میں بند کر دیا اور شہر کے ایک جولاہے کو اپنا وزیراعظم مقرر کر کے عبدالرحمٰن کے مقابلہ کے لئے عوامی لشکر منظم کرنے لگا۔ قرطبہ کے بافندے، قصاب، لوہار، مزدور، کسان اس لشکر میں جوق در جوق شامل ہوئے۔ عوامی انقلاب کی خبر پا کر عبدالرحمٰن واپس لوٹا تو بربر افواج عبدالرحمٰن اور خون ریزی سے الگ ہو گئیں۔ عبدالرحمٰن نے اپنے آپ کو عوامی لشکر کے کمانڈر کے حوالے کر دیا۔ اس کی سواری کے سامنے زمین بوس ہوا تو حکم ملا گھوڑے کے سُم اپنے ہونٹوں سے صاف کرو۔ جان کے لالچ میں عظیم اندلس کے وزیراعظم اور کمانڈر انچیف نے عوامی لشکر کے کمانڈر کے حکم کی تعمیل کی جان پھر بھی نہ بچی۔ عبدالرحمٰن کا سر اور جسم المہدی کو پیش کئے گئے تو جوشِ انقلاب میں اس نے اس کا سر نیزے پر اُٹھوا دیا، جسم اپنے گھوڑے کے سُموں سے روندا اور پھر اسے زرہ بکتر کے جال میں باندھ کر قصر خلافت کے سامنے مصلوب کرا دیا۔ اور اس کے ذاتی گارڈز کے کپتان کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ ہمہ وقت پکار پکار کر اپنے مصلوب آقاء کے لئے اور اپنے لیے خدا کی لعنتوں کے نزول کی دُعا کرتا رہے۔ قرطبہ کے عوام اور عوامی لشکر نے پہلے بنو عامر کے الزاہرہ کو لوٹ کر نذرِ آتش کیا پھر بنو عامر کے دور کے امراء اور فوجی سرداروں کے گھر جلائے ان کے خاندان تباہ کئے۔ المہدی کے حکم پر بچے کھچے امراء کے سر گلدانوں کی صورت میں وادی الکبیر کے کنارے سجا دیئے گئے اور اُن کے قصیدے لکھ لکھ کر روزی کمانے والے شاعر سعید کو ان کی ہجو کہنے پر مامور کر دیا۔ بنی عامر کے دونوں خدام ان کے زوال کے بعد بھی ہمہ وقت ان کی خدمت میں حاضر رہتے۔

عسرت میں جسم کمزور اور عزم توانا ہوتے ہیں تو انگری میں جسمانی فربہی اور ایمانی غربت عام ہو جاتے ہیں۔ پہلی قسم کی غربت سے کبھی کوئی قوم تباہ نہیں ہوئی۔ دوسری قسم کی غربت میں بہت کم قومیں سلامت رہی ہیں۔ ہشام اور المنصور کا اندلس دوسری غربت کے ہاتھوں تباہ ہوا۔

المنصور نے اندلس کو یورپ کا عظیم ترین اور امیر ترین ملک بنا دیا تھا۔ اہل قرطبہ بنو عامر کی عظمت اور امارت کے حسد کی آگ میں ملک وملت سمیت جل بجھے۔ المنصور، مظفر اور اس کی وفات کے بعد عبدالرحمٰن، بنو عامر ہی کیوں؟ ہم کیوں نہیں؟ سوال اندلس کا تھا نہ قرطبہ کا سب سے اہم سوال ''میں'' اور ''تو'' کا تھا اس کے جواب میں من وتو کا جھگڑا ہی ختم ہو گیا۔

المنصور نے زندگی کا بیشتر حصہ میدان جہاد میں گزارا وہ سال میں دو دفعہ افواج لے کر نکلتا اور ہمیشہ کامیاب و کامران لوٹتا اس نے سپین کی تینوں عیسائی سلطنتوں کے دارالحکومت روند ڈالے۔ وہ اپنے جسم اور لباس پر سے زندگی بھر خاک جہاد کا ذرہ ذرہ اکٹھا کرتا رہا۔ اپنی بیٹیوں کے ہاتھ کے سوت سے بنا کفن ہمیشہ ساتھ رکھتا۔ ایک فوجی مہم کے دوران وفات پائی تو اسی کفن پر میدان جہاد کی خاک چھڑک کر دفن کیا گیا۔

مظفر اور عبدالرحمٰن نے اسی روایتِ دفاع کو زندہ رکھنا چاہا مگر ان میں اپنے باپ کی سی فراست اور جرأتِ عمل و کردار نہ تھی وہ سرحدوں کا دفاع تو کر سکتے تھے، حرص وحسد کے طوفانوں کے سامنے بند نہیں باندھ سکتے تھے۔ المنصور کے خاندان کے خاتمہ کے بعد کوئی بھی مسلم اُندلس کی وحدت اور وجود کا تحفظ کرنے والا پیدا نہ ہو سکا۔ المنصور کا سنگِ لوح لکھنے والے کو نہ معلوم کیسے القاء ہوا تھا ''خدا کی قسم اس جیسا ملک کی سرحدوں کا محافظ پھر پیدا نہ ہوگا''۔

وادیٔ الکبیر کی شب تاریک وکٹوریہ پارک میں رقصِ بہاراں میں مگن ملی۔ روشنیوں کا لباس نور کا تاج مسرت کے گھنگھرو چھن! چھن!۔ اہلِ قرطبہ شب کے ہمقدم ناچ رہے تھے۔ کشادہ دامن شاہراہ کی لمبائی چوڑائی پر قمقموں کا روشن جال تنا تھا۔ سڑک پر ہر طرف کھیل تماشے، رقص وسرود، معلوم ہوتا تھا پورے شہر کے پیر و جوان وکٹوریہ پارک میں جمع ہو گئے ہیں۔ گزرے دنوں کا قرض چکانے آئے ہیں۔ میں راتوں کا رمز شناس نہیں شب قرطبہ پر صبح پیرس کا گماں ہوتا تھا، نا قابل اعتماد سنگ دل وسنگ خو اور دولتِ احساس سے تہی دامن۔

اشرف نے ہجوم رقص وسرود میں بھی پہچان لیا۔ صبح جامع قرطبہ کے سامنے بھی وطن کی خوشبو اسی نے محسوس کی تھی۔ اس ہجومِ مسرت میں وہ کچھ افسردہ تھا۔ ملنے کی خوشی کی تہوں کے نیچے کہیں کوئی دُکھ موجود تھا۔ میں نے ان تہوں کو اُلٹنا پلٹنا شروع کیا تو معلوم ہوا اس کا دُکھ میرے رنج سے

بالکل مختلف ہے۔ میں مسلم قوم کے نقصان کے احساس سے بوجھل تھا اور وہ ایک مسلم نوجوان کے نقصان پر غمگین ہو رہا تھا۔ جس نے میلہ کمانے کے لئے فٹ پاتھ پر دکان سجائی تو پولیس اس کی چادر مندریوں زنجیروں اور کھلونوں سمیت لپیٹ لے گئی تھی۔ کیونکہ اس نوجوان کے پاس میلہ کمانے اور فٹ پاتھ پر چھابڑی لگانے کا پرمٹ نہیں تھا۔

سپین میں حکومت کے اہم فرائض میں شہر شہر اور قریہ قریہ میلوں کا اہتمام کرنا بھی ہے۔ میلہ دیکھنے اور لوٹنے والوں کی آسانی کے لئے ہر سال ملک بھر کے میلوں کی ڈائریکٹری تیار کی جاتی ہے۔ ہر شہر اور قصبہ کی بلدیہ دوسروں سے بہتر طور پر میلہ سجانے کی کوشش کرتی ہے۔ بعض کمپنیوں کا کام ہی میلے کمانا اور سجانا ہے۔ موسم بہار میں پورے ملک میں سات دن اور آٹھ میلے والی کیفیت ہوتی ہے۔

سمیع کی کل کائنات زنجیریں، مندریاں، کھلونے چھابڑی اور یہ دعوئ تھے کہ ساڑھے سات سو سال پہلے اس کے اجداد کا اس شہر میں اپنا محل ہوتا تھا۔ پولیس کے اس کی دکان اٹھا لے جانے کے بعد اس کے پاس صرف دعوئ ہی رہ گیا تھا۔ ایک غریب الدیار مسلم بھائی کے اس عظیم نقصان پر اشرف کو افسردہ ہونا ہی چاہئے تھا۔ سمیع کے اجداد اندلس میں اپنے محلوں سے جدا ہوئے تو مراکش کے صحراؤں میں جا بسے تھے۔ وہ اپنے اجداد کے متروکہ دیس میں میلہ میلہ گھوم کر چھابڑی لگاتا ہے اور بہن بھائیوں کے لئے روزی کماتا تھا۔ جو لوگ اپنے محلوں اور شہروں کی حفاظت نہ کر سکیں ان کی اولاد اور کیا کر سکتی ہے؟

اشرف اسے تسلی دے رہا تھا پولیس والوں سے اپنے تعلقات کی تفصیل بتا کر یقین دلا رہا تھا کہ صبح وہ اس کی پوری دکان واپس دلا دے گا۔ سمیع گم سم کھڑا تھا جیسے چھابڑی نہیں آج اس کا پورا قرطبہ چھن گیا تھا۔

پولیس مقابلے کا پروگرام طے کر کے ہم میلہ میں کھو گئے۔ سمیع ابھی تک خاموش تھا۔ اشرف اسے میلہ انجوائے کرنے کی ترغیبات دیتا آ رہا تھا۔ کندھے پر بازو کا وزن محسوس کر کے مَیں رُک گیا۔ ''ذرا ادھر دیکھنا'' اس نے ہجوم میں ایک خاتون کی طرف اشارہ کیا۔

جوانی اور بڑھاپے کی نومینز لینڈ پر رواں مشکی رنگت کی ایک خاتون جس طرف منہ اٹھاتی

تھی میلہ والے راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ نسوانیت، کہتری اور برتری ہر قسم کے احساس کے بوجھ سے بے نیاز وہ ہجومِ خلق میں ایسے گھسی جاتی تھی جیسے بچوں میں استانی گھوم رہی ہو پھر اچانک ایک چیخ بلند ہوئی چلتے پھرتے سب اہل میلہ اپنی اپنی جگہ رُک گئے۔ مشکی خاتون اور ایک فیشن زدہ لڑکی آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ لڑکی سہمی سہمی اور خاتون دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے نہایت خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ لڑکی معذرت خواہانہ انداز میں اپنے اردگرد کھڑے قرطبیوں کو بتا رہی تھی کہ اس خاتون نے اس کا پرس چھیننے کی کوشش کی ہے۔ جو لوگ چلتے چلتے رُک گئے تھے اپنی اپنی راہ تلاش کرنے لگے۔ کسی نے نہ لڑکی سے کوئی ہمدردی دکھائی نہ مشکی خاتون سے اس کی جرأت پر باز پرس کی۔ لڑکی رونی صورت بنائے ہجوم میں گُم ہو گئی۔ خاتون فاتحانہ انداز میں مُسکراتی ہماری طرف آ گئی۔ اشرف اور سمیع سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی پھر اچانک جیب سے سگریٹوں کا پیکٹ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ ''پاکستان؟'' شاید اشرف نے اس کی اپنی زبان میں اسے کچھ بتایا تھا۔

''ہاں پاکستان''۔

''بہت خوب پاکستان بہت خوب پاکستان'' وہ انگریزی کو بھی منہ مارتی تھی۔

چند منٹ قہقہے لگانے اور ایک پورا سگریٹ دھوئیں میں اڑانے کے بعد وہ پھر سے انسانی سمندر میں کود گئی۔

''یہ کون تھی؟''

''چوراں دی نانی'' اشرف مسکرایا۔

''آپ کو کیا بتانے آئی تھی''۔

''یہی کہ وار خالی گیا مگر کوئی بات نہیں''۔

''یہ تو چوروں کی بہت ہی بیباک نانی معلوم ہوتی ہے نہ خوفِ خلق نہ خوفِ پولیس۔''

اشرف نے اردگرد کھڑے اس کے ہم رنگ اور ہم نسل افراد کی طرف اشارہ کیا جو اس کی موومنٹ پر نگاہ رکھے ہوئے تھے اسی انداز میں جیسے کسی سربراہِ مملکت کے حفاظتی دستہ کے سفید پوش ارکان اردگرد کے لوگوں کا آنکھوں ہی آنکھوں میں وزن کر رہے ہوں۔ ''یہ سب اس کے

دو ہتر ے ہیں اس کی حفاظت کا فرض انجام دے رہے ہیں۔''

''چوراں دی نانی اور پولیس کے باہمی تعلقات اتنے اعلیٰ ہیں کہ کوئی کسی کو نہیں ٹوکتا کسی سے نہیں ڈرتا؟''

''ایک دو ہی نہیں تین چار پولیس والے بھی ان کو ہاتھ نہیں ڈالتے بلکہ پولیس پوری کوشش کرتی ہے کہ ان میں سے کسی سے مقابلہ نہ ہو جائے چند ماہ پہلے ان کا قرطبہ کی پولیس سے مقابلہ ہو گیا تو یہ پولیس کے سربراہ کی بیٹی کو اٹھا لے گئے تھے اور اس وقت تک واپس نہیں کی جب تک پولیس نے آئندہ نیک چلنی کی ضمانت نہیں دی۔'' اس نانی کو کیا خوف جس کے نواسوں سے پولیس خوفزدہ ہو۔

قرطبہ میں دو قسم کے خواتین وحضرات دیکھنے کو ملتے ہیں ایک تو وہی جو یورپ میں وافر ہوتے ہیں پلے پیالے کی سی رنگت، بلی کی سی آنکھیں، بھورے بال۔ دوسری قسم کے بندے بندیاں اپنے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ بالکل اپنے آزاد کشمیر کے لوگوں کے ہم رنگ سیاہ بال سیاہ آنکھیں بس سائز اور صحت میں وہ ذرا آگے ہیں انہیں دیکھ کر یہ نظریہ ٹھیک ٹھاک معلوم ہونے لگتا ہے کہ عرب اپنے محل ماڑیوں کے ساتھ اندلس میں اپنا خون بھی چھوڑ گئے تھے مگر ''نانی'' کے نواسے دونوں سے مختلف تھے۔ کھردرے نقوش اپنا سا دیسی رنگ ڈھنگ ناتراشیدہ لباس تہذیب و شائستگی سے بے نیاز۔ یہ سپین کے پکھیواس ہیں اور اپنے ہاں کے پکھیواسوں کے چاچے تائے معلوم ہوتے ہیں ان کی اگر پینٹ تار دی جائے تو اندازہ کرنا مشکل ہو جائے کہ دیسی ہیں یا سپینی پکھیواس۔ اسی لئے اشرف انہیں اپنے ہی آدمی سمجھتا تھا جو کسی منزل پر ہم سے بچھڑ گئے تھے۔ اپنی دھرتی کے بچھڑے قرطبہ میں مل جائیں تو فریقین کا خوش ہونا قدرتی امر ہے دادا جی کے دیس سے روز روز تھوڑا کوئی ملنے آتا ہے۔

''یورپ میں رہتے ہوئے علم سے بیر تہذیب سے ناچاقی؟'' میں نے جاننا چاہا۔

''اس کا جواب تو سمیع ہی دے سکتا ہے ان کی پرانی رعایا ہیں'' اشرف نے سمیع کو چھیڑا۔

''مجسم جواب تو میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔''

مجھے سمیع کی پہیلی سمجھ نہ آئی۔

''یہ کہتے ہیں تم علم اور تہذیب کی بلندیوں پر تھے تم سب مٹ گئے ہم علم اور تہذیب سے دُور رہے عیسائی ہمارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔'' سمیع نے وضاحت کی۔

سمیع کا جواب سُن کر میں سوچنے لگا FITTEST کون ہے؟ جامع قرطبہ اور مدینۃ الزہرا تعمیر کرنے والے یا قرطبہ کے باہر پہاڑوں کے غاروں میں بسنے والے۔ آج تک جہاں بھی تباہ ہوئے تہذیب وثقافت والے ہی ہوئے غار نشیں اور غار گزین کبھی کہیں برباد کیوں نہ ہوئے؟

جب عرب گھوڑے کی پیٹھ پر تھے اندلس کے فاتح اور حکمران تھے۔ زر وزر یاب کے مالک ہوئے سب کچھ گنوا دیا۔ کھلے میدان میں خیمہ زن ہوتے تو سو میل پر دشمن خوفزدہ رہتا۔ محلوں اور محافظوں میں رہنے لگے تو ہزار میل دور دُشمن سے خوفزدہ رہنے لگے۔ زرنا آشنا تھے سب ایک تھے جواہر آشنا ہوئے ایک بھی نہ رہا۔

گھوڑے کی پیٹھ اور خیمہ۔

مغلوں نے چھوڑے مِٹ گئے عربوں نے چھوڑے نہ رہے۔

تاج محل، لال قلعہ، شیش محل، الحمراء، القصر، مدینۃ الزہرا۔

اور پھر رنگوں کی تنگ کوٹھڑی اور افریقہ کے تپتے صحراؤں میں ایک جھونپڑی۔

علم فن اور تہذیب بامِ عروج پر اہل علم اور اہل فن وتہذیب شاہراہ زوال پر۔

ذلت اور بربادی کس مقام سے دامن گیر ہوتی ہے؟

جنہوں نے مدینۃ الزہرا اور الحمراء تعمیر کئے انہیں اپنے ہی شہر میں فٹ پاتھ پر چھابڑی لگانے کو جگہ نہیں ملتی جو غاروں سے چمٹے رہے وہ سلامت رہے سلامت ہیں۔

''FITTEST کون ہے؟ اصولِ بقاء کیا ہے؟''

سمیع ہجوم رقصاں میں ملول چوراں دی نانی ہجوم میلہ میں شادکام۔

ہم قرطبہ کے ایک اور پارک میں کھڑے تھے رقص اور روشنیوں سے دور۔ گھنے درختوں پر تنے سیاہ تنبو کے نیچے ایک چھوٹی سی خوبصورت عمارت کی دیوار پر چسپاں بورڈ پر لکھا تھا ''اس مسجد کو نقصان پہنچانا جرم ہے''۔ اہلِ قرطبہ نے پولیس کے اس حکم کے احترام میں عمارت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا صرف اس کے چاروں طرف مشروب کے خالی ڈبے شراب کی بوتلیں پلاسٹک کے

پرانے لفافے ڈھیر کر رکھے تھے۔ پولیس نے اس سے تو کسی کو پرہیز کرنے کو نہیں کہا تھا رات کے اندھیرے میں کتنا ہی فاصلہ طے کر کے ہم صاف ستھرے پارک کی یہ مسجد دیکھنے آئے تھے۔ جامع قرطبہ کی سی عظمتِ تعمیر نہ قوتِ تسخیر۔ جس شہر میں ہزاروں مساجد گرجا بن گئیں۔ اس ایک مسجد کی پولیس کی طرف سے حفاظت کی وجہ اس کے ترک بانیوں کا جذبہ صادق تھا جنہوں نے ماضی قریب میں قیام قرطبہ کے دوران یہ مسجد تعمیر کروائی تھی۔ فوجی واپس ترکی چلے گئے مسجد اُٹھا نہیں سکتے تھے پیچھے چھوڑ گئے جانے سے پہلے اس کی حفاظت کا اہتمام کر گئے۔

مسلمانانِ اندلس کو جب کسی شہر کی چابیاں عیسائیوں کے حوالہ کرنا پڑتیں تو معاہدہ میں وہ ایک شرط ضرور درج کرواتے۔ ''مساجدِ شہر کا تقدس بحال رہے گا'' شکست خوردہ اقوام سے کئے گئے وعدے اور معاہدے کبھی پورے نہیں کئے جاتے۔ مسلمانانِ اندلس سے کئے گئے وعدے اور معاہدے کہیں پورے نہ کئے گئے۔ ترک شکست خوردہ نہ تھے ان سے کیا گیا وعدہ پورا کرنا پڑا۔ ترکوں کے جانے کے بعد کتنے ہی سال یہ مسجد بے اذان رہی۔ قرطبہ برائے روزگار آنے والے مسلمانوں کی کئی سال کی جہدِ مسلسل سے اذنِ اذان ملا۔ ڈیڑھ دو درجن مزدور پیشہ مسلمان اس زمین کو پھر سے سجود آشنا کرنے لگے۔ اس اذان کی آواز ہمارے آزاد کشمیر کے ایک مولوی صاحب کے کان میں پڑ گئی۔ اسے کسی نے خبر کر دی کہ قرطبہ میں ملک ملک اور مسلک مسلک کے مسلمان ایک ہی مسجد میں ایک ساتھ نماز پڑھنے لگے ہیں۔ محافظِ دین گھر وطن سب چھوڑ قرطبہ پہنچ گئے۔ مسجد و منبر سے مسلمانوں کو مزید مسلمان بنانے لگے۔ اس تبلیغ کا اس قدر شدید اثر ہوا کہ ڈیڑھ درجن نمازی درجن بھر گروہوں میں بٹ گئے۔ مولوی حاضر نمازی غائب۔ ان دِنوں مولوی صاحب بھی غائب رہتے تھے۔ تبلیغ دین کے نام پر گھر بیٹھے چندہ کھاتے تھے اور مسلمان اپنے اپنے ٹھکانوں پر نمازیں پڑھتے تھے۔ ''جب تک مسجد سے کشمیری جن نہیں نکلتا کوئی اور داخل نہیں ہو سکتا''۔ قرطبہ کی واحد مسجد بند تھی قرطبہ میں واحد مولوی کھلا تھا۔ ترک فوجی کو معلوم ہوتا تو شاید یہ بھی لکھوا جاتا کہ اس مسجد میں پاکستانی مولوی کا داخلہ بند ہے۔ شہر کی قدیم مساجد پادریوں نے بند کروائیں۔ نئی مسجد میں تالہ بندی خود مسلمانوں نے کرائی۔ جس شہر کی بادِ سحر میں خاموش اذانیں رچی بسی ہوں وہاں اذان کی کیا ضرورت؟

شب قرطبہ مزید ٹھنڈی اور گہری ہو چکی تھی۔ ہم قرطبہ کی مزید گلیاں اور بازار ناپتے پھر رہے تھے۔ اشرف کی رننگ کمنٹری پر بھی سمیع خاموش تھا۔ شبابِ شب نے منزلِ زوال کی طرف قدم بڑھایا تو اشرف کو ایک بار پھر ہمارا وعدہ یاد آ گیا رننگ کمنٹری روک کر اس نے اعلان کیا کہ اس کے ڈیرے پر ایک عدد اُندلسی مُرغ ہمارے انتظار میں پڑا ہے۔ دوپہر جامع قرطبہ کے سامنے اس نے آج کی شب میرے نام کا وعدہ لیا تھا اس شب اور وعدے میں کھانا بھی شامل تھا۔ اس نے اپنے محنت آشنا ہاتھوں سے ہمارے لئے مُرغ کو مسلم کیا تھا اس کے خلوص اور محبت کا تقاضا تھا کہ ہم اپنا وعدہ پورا کریں۔ سیاحتِ شب کا تقاضا تھا کہ وعدہ اور کھانا ٹال جائیں۔ سکوتِ شب میں متروک گلیوں اور بازاروں کا نغمۂ ہجر سنیں۔ میں کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا کہ سمیع نے مشکل آسان کر دی ''چلیں آج آپ کو عیسائیوں کا ذبیحہ کھلاتے ہیں'' میں نے اشرف کی طرف دیکھا وہ مسکرا دیا ''اس دیس اور شہر میں ذبیحہ؟ ہم تو مجبوری کو شکریہ کے ساتھ قبول کر چکے ہیں''۔

''مجھے اجازت دیں کہ مَیں آپ کی مجبوری شکریہ کے ساتھ نا قبول کر دُوں۔''

اشرف کے دلائل کا وزن تو کم ہو گیا مگر خلوص کا وزن مزید بڑھ گیا۔ اس شدید دباؤ کے تحت ہم اس کے خرچ پر کسی ہوٹل سے کھانا کھانے پر آمادہ تو ہو گئے مگر دوہرے خرچ پر اندر سے دُکھ بھی محسوس ہو رہا تھا۔ ہوٹل میں رات ابھی جوان تھی۔ اس کے مختلف حصّوں میں مختلف قسم کے مشاغل بامِ عروج پر تھے۔ روشن، نیم تاریک اور تاریک حصّے روشن، نیم تاریک اور تاریک مشاغل۔ ہم ایک روشن کونے میں بیٹھ گئے۔ قہقہوں خوشبوؤں اور خوشیوں کے بازار میں ہم زیرِ لب باتیں کر رہے تھے، کھانے کا آرڈر بھی رپٹ لکھوانے کے انداز میں لکھوایا۔ بیرے نے آرڈر لکھ کر ہمیں خاصی مخصوص نظروں سے گھورا۔ سمیع کو اس کا اندازِ نظر کافی ناگوار گزرا۔ اس نے اشرف کو آنکھوں آنکھوں میں کچھ سمجھانے کی کوشش کی مگر اشرف ٹال گیا۔ شاید وہ ہوٹل والوں سے اپنے تعلقات خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ماحول کو ہوٹل کا ہم مزاج بنانے کے لئے اپنے تجربات یورپ اور سیاحت یورپ کی کتاب کھول لی۔ مختلف ممالک کے مختلف شہروں کے مختلف ہوٹلوں کے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اشرف اکثر پاکستانیوں کی مانند جب وطن سے روانہ ہوا تو اس کے پاس بھی سب سے بڑا سرمایہ سیاحت کا ویزا

ہی تھا۔ تعلیم، تجربہ، ہُنر کہیں کا ورک پرمٹ کسی سے آشنائی کچھ بھی تو پاس نہ تھا۔ مَیں اس کے کہنہ مشاہدات اور تازہ واردات سُن سُن کر پریشان وحیران ہوتا رہا۔ وہ اپنے مبلغ سرمایہ اور عزمِ صمیم کی بدولت یورپ فتح کرتے ہوئے سپین پہنچے تو وہاں عام انتخابات کی مہم زوروں پر تھی۔ حکمران پارٹی حکومت میں ہونے کے باوجود اپنے تشہیری پوسٹر لگوانے میں مشکلات سے دوچار تھی۔ اشرف اینڈ کمپنی پورے خلوص کے ساتھ اس کی مدد کو جا پہنچے۔ رات بھر دیواروں کو پوسٹروں سے مزین کرتے دن کو پارٹی کے دفتر میں بستر جما لیتے۔ پارٹی انتخاب کیا جیتی یہی سب کچھ جیت گئے وہ دن اور ہماری قرطبہ سیاحت تک کا دن سپین کے جملہ قوانین ان کے سامنے مسلسل پسپا ہو رہے تھے۔ ہم جہاں بھی گئے برادرانِ وطن کی اس صلاحیت پر سرفخر سے بلند لے کر لوٹے۔ کہیں ایک دفعہ پہنچ جائیں سہی پھر اپنی دُنیا آپ پیدا کر لیتے ہیں۔ اس وقت حال یہ تھا کہ قرطبہ کے پکھیواس، پولیس، دکاندار ہوٹل والے اشرف کی اپنوں سے زیادہ عزت کرتے تھے۔ سب اس کی صلاحیتوں اور میل ملاپ سے مرعوب تھے مگر سمیع کو اہلِ قرطبہ کم اور قرطبہ کی پولیس زیادہ پہچانتی تھی۔ اشرف کا خیال تھا کہ اس کی وجہ سمیع کے دل کا میل ہے۔ قرطبہ کی گلیوں، محلوں اور بازاروں کے بارے میں بُری نیت کا میل، اپنا دل صاف ہو تو آگے سے بھی صاف دل لوگ ملتے ہیں۔ دل میں کسی قسم کا میل ہو تو میل اور میلے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ''تم اپنا دل ہی صاف کیوں نہیں کر لیتے؟ اشرف نے سمیع سے چھیڑ خانی شروع کی۔''

''ہماری مائیں صدیوں سے ہمیں قرطبہ کی لوریاں سناتی آئی ہیں۔ ان لوریوں میں اُندلس اور اس کے شہروں گلیوں محلوں اور باغوں کا ذکر ہوتا ہے۔ ہمارے ان آباء کا ذکر آتا ہے جن سے اہلِ سپین خوفزدہ تھے جن پر اہلِ سپین فخر کرتے ہیں۔ ہمارے اجداد کی بہادری اور خوش بختی کے قصے ہوتے ہیں ان کی بے نشاں قبروں کا ذکر ہوتا ہے اس طرح یہ ''میل'' ہمارے خون میں شامل ہو جاتا ہے اس کا صاف کرنا آسان نہیں۔''

''پھر تو دِل میں نہیں تمہارے خون میں خرابی ہے۔''

''عربوں کے خون میں ہمیشہ سے خرابی رہی ہے۔ قبائلی تعصب تفاخر، گیت اور لوریاں ان کے خون میں بہت سا میل شامل ہوتا ہے۔''

بنی اسرائیل کی مائیں کتنی ہی صدیاں اپنے اپنے بچوں کو ارض مقدس کی لوریاں سناتی رہیں۔ ہر سال کے پہلے روز دنیا کا ہر یہودی ''اگلا سال یروشلم میں'' کا عہد کرتا رہا۔ صدیوں لاکھوں کروڑ ماؤں کی لوریاں لاکھوں کروڑ یہودیوں کے عہد بے ثمر رہے۔ دُنیا ان پر ہنستی رہی اور وہ عہد کرتے رہے اور لوریاں سناتے رہے۔ صبح جامع قرطبہ کی راہ میں ایک نوجوان نے ابن میمون کے گھر کی راہ پوچھی تو مجھے موسیٰ ابن میمون کی صدیوں پرانی دُعا یاد آ گئی تھی جو اس نے یروشلم کے کھنڈرات میں کی تھی ''میرے خدا ہر اس کام میں جو مَیں کرتا ہوں مجھے طاقت دے۔ مجھے اپنا وعدہ پورا کرنے کی توفیق دے۔ ان کھنڈروں میں جو مَیں نے دُعا مانگی ہے اسے قبول فرما۔ خدا کرے اسرائیل پھر سے ارضِ مقدس کو حاصل کر لے اور اسے ''تباہی'' سے بچائے''۔

جب قرطبہ کا ابن میمون یروشلم کے کھنڈرات میں اس زمین پر اسرائیل کے قبضہ کی دُعا کر رہا تھا تو وہاں یہودیوں کے صرف چار گھر تھے۔ صلاح الدین ایوبی کے ذاتی معالج ابن میمون نے دم مرگ وصیت کی تھی ''میرا جسم بنی اسرائیل کی متروکہ ارض مقدس کی مٹی میں دفن کیا جائے''۔ طبریہ میں موسیٰ ابن میمون کو سپردِ خاک کرنے والوں کو یقین تھا کہ ایک روز اس کی دُعا پوری ہوگی۔ اسرائیل پھر سے اس زمین کو حاصل کر لے گا۔

کبھی ان دیوانوں کا خواب بھی پورا ہوگا؟ مَیں نے سمیع کی آنکھوں میں اُترنے کی کوشش کی، یاس میں لبریز بحر کی سطح پر عزم کی کوئی لہر دکھائی نہ دی۔

''آپ نے بھی کبھی قرطبہ کے کھنڈرات میں کوئی دُعا مانگی ہے؟''

''جہاں کوئی کھنڈر ملے یہ ہاتھ اُٹھا لیتا ہے کہ فٹ پاتھ پر چھابڑی لگانے کا پرمٹ مل جائے۔'' سمیع کی بجائے اشرف نے جواب دیا۔

''جب تک ہمارے پاس سب کچھ تھا ہم ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے جب کچھ بھی نہ رہا سب ایک ہو گئے۔ میں ان کھنڈرات کے پاس سے گزرتا ہوا اکثر سوچتا ہوں اس کی وجہ کیا تھی''۔

''رج کھان دیاں مستیاں پکھ مرن دیاں رحمتاں۔''

سمیع کو اشرف کی پنجابی پلے نا پڑی۔

''تمہاری رگوں میں عربی خون ہے یا بربری حدّت؟''

''یہ امتیاز اندلس کی زرخیزی نے دیا تھا اسی نے واپس لے لیا جو لوگ مسلمان کی حیثیت سے اس زمین میں آئے تھے نکالے گئے تو پھر مسلمان ہو گئے تھے۔ اس وقت سے ہم کچھ بھی نہیں مگر ہوں بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔''

''اندلس واقتدار سے نکلے تو سبھی ایک ہوئے۔''

اشرف کی شاعری رقص پلیٹ کے شور میں دب گئی۔

نیم روشن حصہ سے ایک مخمور جوڑا برآمد ہوا۔ نوجوان کی آنکھیں اور بال سیاہ سنوریا کے بال اور آنکھیں بھوری۔

''ملک اور حکومت کھو دینے کے بعد بھی ان کے انداز نہیں بدلے''۔ اشرف نے جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔

''سمیع کا ان سے کیا تعلق؟''

''مستانے ماہی کے نقوش تو کہتے ہیں کہ وہ انہی کے پسماندگان میں سے ہے۔''

سمیع نے گردن گھما کر دیکھا اور مسکرا دیا۔

ہوٹل سے باہر آئے تو بازاروں میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے استقبال کیا۔ لوگ وکٹوریہ پارک کے میلہ سے واپس آ رہے تھے۔ ایک ٹولی ہمارے پاس آ کر رُک گئی۔ ایک حسینہ آگے بڑھی اور اشرف کا ماتھا چُوم کر جھومنے لگی۔ اس کے ساتھی لڑکے لڑکیوں نے قہقہہ لگایا۔ اشرف شرمندہ ہو گیا۔ ''اسے روز ایسے حادثات پیش آتے ہیں آپ کی وجہ سے شرمندہ ہو رہا۔'' سمیع نے وار کیا۔

''میری گندمی رنگت میرے لئے مصیبت بنی ہوئی ہے۔'' اشرف نے خفت مٹانے کے لئے کہا۔

''کسی کے لئے گندم مصیبت بنی کسی کے لئے گندمی رنگت''۔ سمیع اشرف کا قرض چکانا چاہتا تھا۔

''تم دنیا کی واحد قوم ہو جس کے لئے امارت اور حکومت مصیبت بنی رہی۔'' اشرف نے وار پلٹ دیا۔

''میں نے کب اس سے انکار کیا ہے۔''

میں سمیع کی باتوں میں پوشیدہ درد کو محسوس کر رہا تھا لیکن اشرف مسلسل اس سے دوستانہ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ ہم ہوٹل والی گلی کے موڑ پر پہنچ گئے تھے تنہا کھمبے پر ٹمٹماتا بلب اچانک بُجھ گیا۔ اشرف چلتا

چلتا رُک گیا ''دیکھو روشنیاں اب تک تم سے خوفزدہ ہیں۔''

''ہم تو روشنی والے تھے۔''

''اس میں سے اپنے لئے بھی کچھ رکھ لیتے۔''

''اس کا آپ کو نقصان ہوتا میں آج کی شام آپ کے ساتھ نہ گزار سکتا۔''

''ہاں تم تو عبدالرحمٰن ثالث کے کمانڈر ہوتے۔''

''کچھ تو ہوتا ہی اسی طرح بے در اور بے گھر تو نہ ہوتا۔''

''اچھا چلو چھوڑو یہ بتاؤ صبح پولیس سٹیشن کب چلنا ہے۔'' ہوٹل کے دروازے پر اشرف نے سمیع سے پوچھا۔

بڑی بی اب تک ہماری منتظر تھی، اشرف نے ''مادرے'' کہہ کر اس کی زبان میں مذاکرات شروع کر دیئے۔ وہ دعائیں دیتے ہوئے اُٹھی اور کی بورڈ سے چابی تلاش کرنے لگی۔

اندلس کی خودکشی

غیر مرئی قدموں کی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی، خنک ہوا کے دوش پر بھینی بھینی خوشبو قافلہ در قافلہ وارد ہوئی آتی تھی میں فلک قرطبہ پر ستاروں کی گردش دیکھتا دیکھتا سو گیا تھا کھڑکی کے سامنے کی دیوار میں پیوست بیل میں جڑے پھول مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ اس شہر میں راتوں کو کھڑکیاں کھلی رکھنے کی روایت کمزور ہے۔ ایک شام قرطبہ کی گلیوں میں ایک خچر گھمایا جا رہا تھا۔ اس کی پیٹھ پر بھوسے کے بورے لدے تھے۔ بوروں کے درمیان بھاری زنجیروں میں بندھا ایک شخص سر جھکائے بے حس بیٹھا تھا۔ زنجیروں کا وزن، احساس کا بوجھ، قرطبہ کی کھلی کھڑکیاں اور دیکھنے والوں کا ہجوم معتمد کا معتمد ترین دوست، محبوب شاعر، وزیر اعظم اور کمانڈر انچیف بے حس تھا اور معتمد کے حکم سے اس پر طنز و تضحیک کے تیر چلائے جا رہے تھے اسے قرطبہ کی گلی گلی گھمانے کا منظر دیکھنے والوں کا ہجوم تھا۔

ایک غیر معروف گاؤں کا غیر معروف شاعر جب زندگی کے سفر پر روانہ ہوا تو اس کے پاس سواری کے لئے خچر اور سرفرازی کے لئے شاعری کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ وہ غرباء کو شعر سُناتا اور امراء کو شعر بیچتا، گاؤں گاؤں اور شہر شہر گھومتا تھا۔ شہزادہ معتمد نے شعر سُنا تو داد میں دوستی اور مشاورت نذر کر دی۔ اسے سفر اور حجر میں ہر وقت ساتھ رکھنا شروع کر دیا۔ بادشاہ بنا تو بادشاہت اس کے حوالے کر دی۔ ابن عمار نے پچیس سال دوستی نبھائی۔ شطرنج کی مات دے کر حملہ آور عیسائی بادشاہ کو اشبیلیہ کا محاصرہ اُٹھانے پر مجبور کر دیا اور پھر وہی شاعری جو ابن عمار کے عروج کا سبب بنی تھی اسے زوال کی راہ پر لے گئی۔ معتمد کے قصیدے لکھتے لکھتے شاعرانہ انا پرستی کے ایک لمحہ

میں ہجو کہہ دی۔ دشمنوں نے ہجو بادشاہ تک پہنچا دی۔ مسلمان اور عیسائی کسی بھی حکمران کو ابن عمار کو پناہ دینے کی جرأت نہ ہُوئی۔ گرفتار ہو کر اسی شہر میں بادشاہ کے روبرو پیش ہُوا تو انہی گلیوں میں اس کا جلوس گھومتا رہا تھا۔ انہی کھڑکیوں سے لوگ ابن عمار کا نظارہ کرتے رہے تھے۔ جس روز اشبیلیہ کے محل میں معتمد نے اپنے ہاتھ سے ابن عمار کو قتل کیا اس رات قرطبہ کی کھلی کھڑکیوں میں اس کے نغمے گونجتے رہے تھے اور پھر لوگوں نے دُکھ اور خوف سے کھڑکیاں بند کر لی تھیں۔ اب وہ تھوڑا سا پردہ سرکا کر سامنے پھیلی بیلوں اور پھولوں کا نظارہ کر لیتے ہیں مگر کھڑکی پُوری نہیں کھولتے۔

دیوار سے بغلگیر پھول ایک اجنبی کی بھول پر مسکرا رہے تھے۔ خوشبو کی ہنسی سے بچنے کے لئے کھڑکی بند کرنے اُٹھا تو آسمان، مکانوں کی چھتوں اور صحنوں میں چاندنی چھڑک رہا تھا۔ فلک پر ستارے مدھم ہونے لگے تھے۔ مَیں نے کھڑکی کے پٹ پورے کھول دیئے خوشبو نے بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔ چاندنی پھولوں اور منڈھیروں پر صدقے قربان ہونے لگی۔ یہودی محلّہ سے اُس پار قصر خلافت کے بُرج اور جامع قرطبہ کا مینار چاندنی کے سمندر کی سطح پر روشنی کی کرن کی مانند تیرتے ڈوبتے دکھائی دیئے۔ کمرے میں سردی کا احساس ختم ہو گیا۔ بادل کا ایک ٹکڑا تیرتا ہُوا آیا اور مینار کی چوٹی سے لپٹ گیا۔ بادل کی سیاہ زلفیں پھسلتے پھسلتے زمین تک پہنچ گئیں۔ بادلوں نے جامع قرطبہ اور اس کے مینار کو آغوش محبت میں چھپا لیا۔ بجلی کوندتی تو معلوم ہوتا چاند اپنی گم گشتہ کرنوں کی جدائی میں بیتاب ہوا جاتا ہے پھر مینار مسجد اور قصر خلافت سب معدوم ہو گئے۔ تہہ در تہہ اندھیرے سے شمشیر بکف سرفروشوں کا ایک دستہ نمودار ہُوا۔ گھوڑوں کی پیٹھ سے پیوست نیزہ بردار۔ تلواریں اُن کے جسموں کا حصّہ معلوم ہوتی تھیں۔ گھوڑوں سے اُتر وہ زمین پر صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک نوجوان قطار سے آگے نکلا۔ فرشِ خاک پر مشترکہ سجدہ کیا فلک کا سینہ چیر کر گزرنے والی دُعا کی اور گھوڑوں کا رُخ میری طرف موڑ دیا۔

مغیث رومی کا لشکر قرطبہ میں داخل ہو رہا تھا۔ گلیوں میں شور بپا تھا۔ لوگ کھلی کھڑکیوں سے نیچی نظروں والے شہسواروں کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں ''تاروں کی طرح چمکتی تھیں جن کی ثنائیں'' طارق بن زیاد اپنے لشکر سمیت نمودار ہُوا تو مغیث نے اپنے لشکر سمیت اس کا استقبال کیا۔ قرطبہ کے مکانوں کی کھڑکیاں ایک دفعہ پھر کھل گئیں۔ بوڑھے موسیٰ بن نصیر کو دیکھ کر سب نگاہیں ایک

دوسری میں الجھ گئیں۔ تیز نقوش والا عرب نوجوان نمودار ہُوا تو پھولوں نے جھک کر سلام کیا۔ چہرے پر ہمت کا نور پیشانی پر عزم کی شکنیں آنکھوں میں ہیرے کی چمک عبدالرحمٰن نے تلوار لہرائی تو چلتی ہوائیں رُک گئیں۔ فضا میں ہلکے ہلکے نغمے بلند ہونے لگے۔ پھولوں نے جھک جھک کر اظہارِ شادمانی کیا۔ سیاہ گھٹائیں چھٹنے لگیں۔

وادی الکبیر کی لہروں نے سر اٹھا کر دیکھا اندھیروں میں جامع قرطبہ کا ہیولا نمودار ہوا۔ سورج وادی الکبیر کے پل کی طرف سے طلوع ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے جیسے روشنی بڑھ رہی تھی۔ مسجد کے نقوش نکھرتے جا رہے تھے۔ مینارۂ مسجد منزل منزل اُوپر اُٹھ رہا تھا پھر نعرہ تکبیر لگاتا ہوا ایک عظیم الشان لشکر قصرِ خلافت کے سامنے نمودار ہُوا۔ اس کے سامنے سینکڑے غلام اپنی پشتوں پر گرجوں کے وزنی گھڑیال اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ ان گھڑیالوں کو پگھلا کر قندیلیں بنائیں اور جامع مسجد میں لٹکا دی گئیں۔ قرطبہ کی گلیوں اور بازاروں میں مسرت و شادانی کے قافلے اُتر آئے۔ مکانوں کی کھلی کھڑکیوں سے زریاب کے نغمے بلند ہونے لگے۔ وادی الکبیر کی موجیں ناچنے لگیں۔ موٹی موٹی کتب بغلوں میں دبائے کچھ اہل فکر بڑے بازاروں سے ہٹ کر تنگ گلیوں کی طرف ہو لئے۔ وہ کبھی کھلی کھڑکیوں کو دیکھتے۔ پُر جوش ہجوم کی طرف نظر اٹھاتے۔ مینارہ مسجد پر جھولتے سنہری لٹوؤں سے ہوا کا رُخ پہچاننے کی کوشش کرتے۔ قصرِ خلافت کے برجوں کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیتے اور دبے قدموں مسجد کی وسعتوں میں گم ہو گئے۔

الارم نے مرگ شب کا اعلان کیا تو کھڑکی اب بھی کھلی تھی۔ قرطبہ کا نیلگوں آسمان فکر کے بحرِ بے کراں کے کناروں تک پھیلا ہوا تھا۔ سامنے کی دیوار سے بغلگیر بیل پر تر و تازہ پھول جھوم جھوم کر نغمۂ صبح گاہی پیش کر رہے تھے۔ وعدہ جلد اُٹھنے کا تھا۔ نرم و نازک بستر نے اس انس سے سینے سے لگائے رکھا کہ جُدائی کی قوت رہی نہ خواہش۔ کمبل عہدِ رفتہ کی یادیں بن کر چمٹ گیا تھا۔ چھڑانا بھی چاہتا تو وہ لپٹ لپٹ جاتا۔

جملہ ہمّتِ انتظار استقبالیہ پر ہار کر اشرف دستک بدست آوارد ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات پوچھ لے ''سمیع؟'' مَیں نے حفاظتی اقدام کے طور پر پوچھا۔

''وہ اپنے اجداد کے محل کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے تھانے گیا ہے ابھی آ جائے گا۔''

''تم بھی کبھی تھانے گئے ہو؟''

''یہ تو ہمارے روزمرّہ میں شامل ہے۔''

''تم نے بھی کبھی کوئی رپٹ لکھوائی ہے؟''

''آپ کی صحبت دو چار روز اور نصیب رہی تو پھر شاید مجھے بھی کوئی رپٹ لکھوانا پڑ ہی جائے ویسے فی الحال تو رات کو بے خبر سوتا ہوں۔'' اُس نے قہقہہ لگایا۔

''دن میں لٹنے کا کچھ تو فائدہ ہوا۔''

''دیکھئے کسی نے کچھ لوٹا و وٹا نہیں جو اپنا گھر آپ لٹانا چاہے اسے کون روک سکتا ہے۔ قرطبہ کو پہلے اپنوں نے لوٹا پھر باہر والوں نے یہ فرض ادا کیا۔ خود کردہ را علاجے نیست، کوئی کیا کرتا؟ جب مسلمان خود ہی مسلمان کو مارنے پر کمر بستہ تھے۔''

انسان خواہ کتنی احتیاط کرے۔ تیشۂ احساس سے شیشہ دل کو کب تک بچائے گا۔

اشرف نے ''مادرے'' کے نامعلوم ماضی کے کسی تار پر انجانے میں ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کا سدا بہار چہرہ مرجھایا مرجھایا سا تھا۔ میز پر تصاویر پھیلائے وہ مسلسل انہیں دیکھ رہی تھی۔ ''یہ میرا اولین منگیتر ہے۔'' مائی نے ایک تصویر اشرف کی طرف بڑھا دی۔ ایک بانکا سجیلا نوجوان سیاہ بال چمکیلی آنکھیں تیز نقوش اپنے قافلے سے بچھڑا کوئی عرب شہسوار ہلکا ہلکا مسکرا رہا تھا۔ ''اس کی موت پر مَیں کئی روز تک روتی رہی تھی۔''

''موت کیسے آئی؟ موت ہمیشہ ایک ہی طرح آتی ہے۔ آسمان سے برق رفتار گھوڑوں والی رتھ پر بیٹھ کر اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے شکار کو آسمانی گاڑی میں بٹھا کر ساتھ لے جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے بخار سے مر گیا، کوئی کہتا ہے حادثہ میں ہلاک ہو گیا۔ اس سے کیا ہوتا ہے بس اس نے جانا ہوتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ پیچھے والے یاد کرتے رہ جاتے ہیں۔ شاید وہ بھی کبھی یاد کرتا ہو مگر اس کے پاس تو میری کوئی تصویر بھی نہیں تھی۔'' مائی دُوسری تصویر غور سے دیکھی۔ جب یادوں کے بادل برس چکے تو قوس وقزح کے رنگوں میں مجھے پھر ایک ساتھی نظر آیا۔ معلوم ہوتا تھا قدرت نے اسے میرے دُکھ بانٹنے کے لئے بھیجا ہے۔ غم کا بوجھ ہلکا تو نہیں ہوا۔ قابل برداشت ہونے لگا۔ ہم نے منگنی کر لی''۔ اُس نے دوسری تصویر میری طرف بڑھا دی۔ ''شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ وہ

بھی آسمانی گاڑی پر بیٹھ کر فلک کی سیر کو نکل گیا۔ اب تک واپس نہیں آیا۔ آسمانوں پر ہی ہے۔''

''ویری سیڈ'' اشرف نے لمبی آہ کھینچتے ہوئے کہا ''اسے کیا ہوا؟''

''بس چلا گیا اور کیا ہونا تھا۔ آسمانی گاڑی میں بیٹھ کر بس یہ ایک تصویر میرے پاس چھوڑ گیا۔ شاید وہ آیا ہی تصویر چھوڑنے تھا۔ مَیں نے دونوں تصاویر ایک ہی فریم میں لگا کر میز پر سجا دیں۔ مگر زندگی تصویروں کے سہارے کب گزرتی تھی۔ کانٹوں بھری راہ میں ایک اور ہمدرد مل گیا اس نے مجھے تسلی دی، سہارا دیا۔ میری گٹھڑی اپنے سر پر رکھ لی۔ ہم ساتھ ساتھ چلتے رہے اور پھر ہمیشہ ساتھ رہنے کے لئے انگوٹھیوں کا تبادلہ کیا''۔ مائی نے ایک اور تصویر ہمارے سامنے رکھ دی۔ ''یہ فوج میں تھا۔ بڑا بہادر تھا مگر موت کے سامنے وہ بھی ہار گیا۔''

ہمیں مائی سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔ وہ تینوں تصویریں پھیلا کر انہیں غور سے تکتی رہی۔

''اس کے بعد میں نے کسی اور کی جان لینا پسند نہیں کیا۔ سوچا تین موتیں ہی کافی ہیں''۔ مائی اور بھی افسردہ ہوگئی۔ ''زندگی گزارنے کے لئے تو ایک ہی تصویر کافی ہوتی ہے۔ میرے پاس تو تین تصویریں ہیں''۔ پھر اس نے میرے کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ بھی تو تصویریں اکٹھی کرتے پھر رہے ہیں۔ جامع قرطبہ کی تصویریں مجھے معلوم ہے۔ آپ مسلمان اب بھی اسے جامع مسجد ہی کہتے ہیں۔ یہ آپ کا حق ہے لیکن اس سے عیسائیوں کو کیا فرق پڑتا ہے اگر یہ تصویریں دیکھ کر آپ کو کچھ سکون مل جائے تو کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ ایک ہی تصویر کو آپ جامع مسجد کہہ لیں عیسائی گرجا کی تصویر کہہ لیں۔ اپنا اپنا احساس ہے۔''

''آپ ہوٹل اکیلی چلاتی ہیں؟'' اشرف نے شاید بات کا رُخ تبدیل کرنے کے لئے پوچھا۔

''نہیں یہ تین تصویریں بھی میری مدد کرتی ہیں جب مَیں تھک جاتی ہُوں تو مجھے حوصلہ دیتی ہیں اپنے بیڈ رُوم کی تین دیواروں پر مَیں نے یہی تین تصاویر لگا رکھی ہیں۔ سامنے، دائیں، بائیں جس طرف منہ ہوتا ہے ایک تصویر سامنے رہتی ہے۔''

''آپ کا کوئی اور عزیز؟''

''تین بہنیں ہیں۔ اُن کے بچے ہیں۔ مَیں جو کماتی ہُوں انہیں دے دیتی ہوں۔ بہنوں کی بیٹیاں روزانہ صبح آ جاتی ہیں کمروں کی صفائی کر دیتی ہیں بستروں کی چادریں بدل جاتی ہیں۔ بس گزر ہو

رہی ہے۔''

مَیں نے مائی کی تصویر بنانے کے لئے کیمرہ کھولا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ ''کیا کرو گے؟''

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا بتاؤں؟

''یہ اخبار میں کام کرتے ہیں اس میں شائع کریں گے۔'' اشرف نے میری بجائے جواب دیا۔

''اخبار بند کروانا ہے میری منحوس تصویر شائع کر کے۔ مَیں نے تیسرے منگیتر کی موت کے بعد کبھی تصویر نہیں بنوائی۔'' اس نے تینوں تصویریں لفافے میں بند کر کے میز کی دراز میں رکھ لیں۔

''یہ پاکستان میں آپ کے بارے میں لوگوں کو بتائیں گے۔'' اشرف نے کہا۔

''انہیں کسی اچھی چیز کے بارے میں بتاؤ..... مُسلمانوں کی دلچسپی کی قرطبہ میں بہت چیزیں ہیں۔ مسجد ہے مدینۃ الزہرا ہے۔ القصر ہے اور بہت کچھ ہے۔ آپ خواہ مخواہ ایک سنیپ ضائع کریں گے۔''

''آپ کبھی پاکستان آئیں۔ ہمارے ملک کے پہاڑ اور وادیاں دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔ مَیں نے پاکستان کی پبلک ریلیشنگ شروع کر دی۔

''پوں پوں پاکستان'' مائی نے عجیب انداز میں کہا۔

اشرف نے قہقہہ لگایا۔

''پوں پوں کا کیا مطلب ہے؟'' مَیں بھی اس کے قہقہہ میں شامل ہونا چاہتا تھا۔

''کہتی ہیں پاکستان میں گولے چلتے رہتے ہیں۔''

مجھ سے پہلے اس گلی میں میرے افسانے گئے۔

سمیع کے دخل در دکھ سکھ سے محفلِ صبح ختم ہُوئی۔ وہ مجھے قرطبہ کا ایک اور حصہ دکھانا چاہتے تھے۔ بڑے بڑے سٹوروں، بینکوں، کاروباری اداروں اور جدید عمارات والا حصہ۔

مگر ایک قدامت پسند کو اہل قرطبہ کی ترقی پسندی سے کیا دلچسپی؟

''اُس کے بغیر آپ قدیم قرطبہ کو بھی نہیں سمجھ سکتے؟''..... سمیع چونکہ کم ہی رائے دیتا تھا۔ اسی لئے اس کی رائے سے اشرف اختلاف کر لیتا تھا مَیں خاموش رہتا۔ اِس تجویز کو اشرف نے

بھی ویسے نہیں کیا۔ دل نے کہا چلو کسی بات پر تو دونوں متفق ہیں۔ ان کی خوشی کی خاطر جدید قرطبہ بھی ہو جائے ورنہ پیرس اور لندن کی جدت سے جدتِ قرطبہ کا کیا موازنہ؟ قرطبہ کو اپنی قدامت پر فخر ہے۔ اہلِ سپین بھی اس کی قدامت پر ہی فخر کرتے ہیں۔ قرطبہ کی جدت کی بجائے قدامت کی تشہیر کرتے ہیں۔ امریکن بینک کی وسیع شیشے کی دیوار کے پیچھے بھی تین مخروطی محرابیں ایستادہ تھیں۔

''مسجد کو زرگری سے کیا نسبت؟''

''مسجد تو ہمارے آپ کے لیے ہے۔ زرگروں کے لئے تو یہ فنِ تعمیر کا شاہپارہ ہے۔''

مَیں اور سمیع خاموش رہے۔ بعض جدید سٹوروں اور عمارتوں کی بیرونی دیواریں بھی انہی محرابوں سے مزین تھیں۔ مرسیہ اور ویلنسیہ میں کھجور شجر آرائش تھا۔ قرطبہ میں محرابِ جامع کمالِ آرائش ملی جامع اور محرابِ جامع اہلِ قرطبہ کے اعصاب پر سوار ہیں دُور دیس کے مسافر کے اعصاب کیسے محفوظ رہتے جو چند دن عروس البلاد قرطبہ کا مہمان تھا۔ دمِ واپسیں وہ مجھے ایک عجائب گھر میں لے گئے۔ بُل فائیٹنگ کے عجائب گھر میں۔ قرطبہ کی گلی خویسماریہ کے مانولو بُل فائیٹر کے مجسمہ کے نیچے اُس کے مقتول بُلز کی تفصیل درج تھی۔ مجسمہ کی کشش بڑھ گئی۔ بالکل جانا پہچانا مجسمہ تھا۔ کسی کو غلطی تو نہیں لگی؟

''آپ تو اس سے بھی واقف معلوم ہوتے ہیں۔''

سمیع نے قریب آ کر آہستہ سے کہا جیسے ڈر رہا ہو کہ اشرف نہ سُن لے۔

''بہت اچھی طرح۔''

وہ حیران ہوا۔

''اِن دنوں یہ ہمارے ملک کے وزیرِ خارجہ ہیں۔''

اشرف کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ ''بُل فائیٹنگ اور خارجہ تعلقات کی لڑائی میں بہت فرق ہوتا ہے۔''

''بُل فائیٹر مانولو (MONOLO) اور اپنے خارجہ تعلقات کے صاحبزادہ یعقوب علی کی شکل و صورت میں تو ڈھونڈے سے بھی کوئی فرق نہیں ملتا تھا'' اشرف نے اور بھی قریب سے مجسمہ کو دیکھا ''اس طرف تو کبھی دھیان ہی نہیں گیا تھا۔''

انسان کا دھیان اکثر بہت سی باتوں کی طرف نہیں جاتا۔ جب جاتا ہے تو انسان دھیان کی رو میں بہہ جاتا ہے۔ اشرف بُل فائٹنگ سے نکل کر پاکستان کے خارجہ امور میں بہنے لگا۔

''یہ بحث تو ہم ہوٹل میں بھی کر سکتے تھے۔'' سمیع نے ٹوکا۔

''معلوم ہوتا ہے تمہیں کچھ کچھ ہوش آنے لگا ہے۔ بُل فائیٹر کی قربت کا اثر تو نہیں؟''

''مَیں آپ کی مانند بے ہوش تو کبھی نہ تھا۔''

''سب کچھ لُٹا کے ہوش میں آئے تو کیا ہوا؟'' اشرف اُونچی آواز میں گنگنانے لگا۔ سمیع نے میری طرف دیکھا۔ اشرف نے خود ہی اپنی باہمی گفتگو کی زبان میں ترجمہ کر دیا۔

''اس میں کچھ ترمیم کر لو۔ سب کچھ لٹانے کے صدیوں بعد ہوش میں آئے تو کیا ہوا؟''

سمیع کی تجویز پر اشرف مسکرایا''۔ صدیوں کی بے ہوشی اور پھر صدیوں بعد ہوش درمیانی صدیاں کیا ہوئیں؟''

قوموں کا سب کچھ لٹتا ہے تو اس کے ساتھ ان کے ماضی اور مستقبل کی کئی صدیاں بھی لُٹ جاتی ہیں۔ ہم انہی لٹی صدیوں کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ جن کے ماہ و سال اندلس کے قریہ قریہ میں بکھرے پڑے ہیں۔ راہ چلتے سیاح کا دامنِ احساس پکڑ کر پکارتے ہیں۔ ''دیکھو ہمیں جو دیدہ عبرت نگاہ ہو۔''

سنجوکو کے ایک آرائش خانہ میں ایک نوجوان چمڑے پر جامع قرطبہ کے خطوط ثبت کر رہا تھا۔ ''آپ کہاں سے آئے ہیں؟'' اس نے فریم سے نظریں اُٹھا کر پُوچھا۔

''پاکستان سے۔''

''تشریف رکھیں۔'' فریم ایک طرف رکھ کر اس نے اپنی گدی پیش کر دی۔

اس تپاک پر حیرانی ہُوئی۔

''مَیں بھی مسلمان ہوں۔''

حیرانی کی جگہ خوشی نے لے لی۔

''مَیں مراکش کا رہنے والا ہُوں۔ اس دکان پر کام کرتا ہُوں۔ میرا چچا اندلس کے مسلمانوں کی تنظیم کا صدر ہے۔ وہ ابھی آنے والا ہے۔ آپ اس سے ضرور ملیں۔''

''آپ کے اجداد کا تعلق بھی اس شہر اور ملک سے رہا ہے؟''

''میرا تعلق اس دکان سے ہے مَیں چمڑے پر مسلمانوں کے اجداد کی عمارات کے نقوش بناتا ہوں اور روزی کماتا ہوں۔ یہ میرا حال ہے۔ اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ماضی کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں۔ ہاں مسلمانوں کے اجداد کا اس شہر سے تعلق رہا ہے۔''

''مسلمانوں کے اجداد کی بنائی ہوئی عمارات کی بدولت آپ کو روزی مل رہی ہے۔ آپ کو تو اُن کا شکر گزار ہونا چاہئے۔'' سمیع کے اندازِ تکلم میں تلخی تھی۔

''یہ سب دکانداران کے شکر گزار ہیں۔'' اشرف نے لقمہ دیا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن ان کے کارناموں کی وجہ سے نہیں ان کی بداعمالیوں پر ان کے شکر گزار ہیں۔'' نوجوان نے سمیع کے تلخی کے اظہار کو نظر انداز کر دیا۔

سمیع کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے ابھرنے لگے تھے۔ تلخی و تکرار کے خدشہ سے مَیں نے مصنوعات کی قیمتوں کی بات شروع کر دی۔ دو آدمی دکان میں داخل ہُوئے۔ نوجوان نے عربی میں کچھ کہا۔ چھوٹے قد کے موٹے آدمی نے دایاں ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ لمبے قد کے خستہ حال نے اس کی تقلید کی۔ موٹا نوجوان کا چچا تھا۔ لمبا اندلسی مسلمان تھا۔ دونوں ہم سے اس انداز میں ملے جیسے ۱۲۳۵ کے بچھڑے اچانک درِ مسجد پر آمنے سامنے آ جائیں۔

چائے کی پیالی ختم ہوئی تو وہ ہمیں جامع قرطبہ کے سامنے کے محلّہ کی سیاحت کو لے گئے۔ آہنی جنگلوں اور کھڑکیوں کے پیچھے لٹکتے گملوں اور گھروں کے صحنوں میں کھلے پھول جھومنے لگے۔ تنگ گلیوں اور کشادہ حویلیوں میں گھومتے وقت موٹے کی رننگ کمنٹری جاری رہی۔ ایک ایک گلی ایک ایک مکان کا اس کا تاریخ و جغرافیہ کافی قابلِ داد تھا۔ وہ ایک گرجا گھر کے سامنے رُک گئے۔ آہنی سلاخوں کے بنے بیرونی دروازے میں پڑے موٹے زنگ آلود تالے میں کوئی حرکت پیدا نا ہوئی۔ صحن میں کھجور کا ایک اداس درخت اور درخت کے پاس پول پر ابن مریم صلیب سوار تھا۔ ''یہ مسجد منصور ہے۔ جامع مسجد میں توسیع و اضافہ کے علاوہ المنصور نے اپنے محل میں بھی مسجد بنوائی تھی۔ راتوں کو چپکے چپکے خدا سے فتح و کامرانی کی دعائیں کرنے کے لئے قرطبہ کی چار ہزار تین صد مساجد صلیب آشنا ہوئیں تو مسجد منصور سینٹ بارتولمی کے حصّہ میں آئی۔ قصر منصور جلا دیا گیا تھا اور

مسجد منصور بچالی گئی تھی۔'' قصر مسلمانوں نے جلا دیا اور مسجد دوسروں کے لئے بچالی احسان کا بدلہ احسان مسجد کی دیواروں پر اب بھی آیاتِ قرآنی باقی ہیں۔

اندلس میں مسجد کا رُخ قبلہ اور طرزِ عمارت سمجھ لیں تو دور ہی سے معلوم ہو جائے گا کہ کون سا گرجا کبھی خانہ خدا تھا۔ جنوب مشرقی رُخ میں محراب، مسجد کا زیادہ حصّہ مسقف، سامنے چھوٹا سا صحن اور صحن میں داخلہ کی بیرونی ڈیوڑھی کے اُوپر مینارۂ مسجد۔ گرجا بنانے کے لئے انہیں عمارت میں زیادہ تبدیلی نہیں کرنا پڑی۔ مینارہ توحید کی چوٹی کو بپتسمہ دے کر گھنٹی لٹکا دی۔ صحن میں ماں بچے کا مجسمہ سجا دیا۔ اندرونِ مسجد قربان گاہ جما دی۔ گرجا تیار ہے ٹرین میں سفر کے دوران دیہات و قصبات کے اکثر و بیشتر گرجوں کو دیکھ کر صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کبھی کعبہ کی بیٹیاں تھیں۔

''اندلس کے بت کدے میں پُرانے وہ گھر خدا کے۔''

وہ گیٹ کی موٹی سلاخوں کو پکڑے کتنی ہی دیر مقفل مسجد کے در و دیوار کو گھورتے رہے جیسے کشتی ڈوب جانے پر ملاح پُرسکون سطحِ سمندر دیکھ رہا ہو اس کے نیچے ہمیشہ کے لئے دفن ہونے والی کشتی اور اسبابِ زندگی کی یاد میں ایک زندگی کی خاموشی اختیار کئے کھڑا ہو۔

ہوا کا ہلکا جھونکا آیا کھجور کی شاخوں نے مرثیۂ اُمّت مرحومہ شروع کر دیا۔ مَیں نے مسجد کی تصویر بنائی وہ دونوں جنگلہ تھام کر کیمرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

کتنے ہی خواتین و حضرات اس راہ سے گزر گئے کسی نے ہماری طرف دھیان نہ دیا۔ جامع قرطبہ کے اندر کے درجنوں گرجا گھروں کی دیکھ بھال سے فرصت ہو تو کسی اور گرجا کی طرف دھیان دیں۔

''قرطبہ میں مسلمانوں کی تعداد کیا ہو گی؟''

''بیس''

''مقامی یا مزدور؟''

''یہ ایک مقامی ہے باقی انیس محنت مزدوری والے ہیں۔'' موٹے نے اپنے لمبے ساتھی کی طرف فاتحانہ انداز میں اشارہ کیا۔

''اسے قرطبہ کے دس لاکھ مسلمانوں کا نشان مٹ جانے کا دکھ نہیں ایک مقامی کے مسلمان ہو جانے

کی خوشی ہے۔'' سمیع نے آہستہ سے کہا۔

''اس لئے کہ دس لاکھ کو مٹانے میں آپ کے اجداد کا ہاتھ تھا۔ اس ایک کو مسلمان بنانے میں اس کا اپنا ہاتھ ہوگا۔'' اشرف نے وار کیا۔

''یہ وہ گھر ہیں جن میں حسن رچ گیا تھا۔ یہ وہ گلیاں ہیں جن میں علم بس گیا تھا۔'' عرب محلّہ سے گزرتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

''یہ وہ چوک ہیں جن میں فتنے خیمہ زن رہے۔'' سمیع کو صدر مسلماناں کی بات شاید پسند نہیں آئی۔ شکستِ حُسن و علم فتحِ ہوس۔ فتنیٰ ہوس کے کندھوں پر سوار ہوا اور مسلم اندلس کے طول و عرض میں پھیل گیا۔

''اسلامیان اندلس کا اصل مجرم قرطبہ ہے۔'' سمیع نے سب کو خاموش پا کر کہا۔

''اور آج تک قرطبہ اس جُرم کی سزا بھگت رہا ہے۔ دنیا ختم ہو جائے گی۔ اس کی سزا پھر بھی ختم نہیں ہوگی۔ سرما کی طویل راتوں میں ان در و دیوار کو اپنا منہ نوچتے مَیں نے خود دیکھا ہے۔'' اندلسی مسلمان نے پہلی بار لب کھولے ہیں۔

ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں
اُداسی میں ڈوبی ہُوئی ہیں فضائیں

سُن رکھا تھا سیاحوں کا شوقِ گل دیکھ کر قرطبہ کی مائیاں اپنے در وا کر دیتی ہیں۔ ہم آہنی سلاخوں والے پھاٹکوں اور کھڑکیوں میں سے جھانکتے پھرے مگر کسی مائی نے نظارۂ گل کی دعوت نہ دی کسی نے اپنے صحن اور باغیچے ہم پر منکشف نہ کئے۔ موسم گل میں پھُول دور ہی سے بیتابیِ دل کا نظارہ کرتے رہے۔ اونچی چار دیواریوں میں مقید زندگی پھول پھول تھی۔ ہماری تانک جھانک پر بھی کسی نے ڈانٹ کر نہ کہا ''شرم نہیں آتی گھروں میں جھانکتے پھرتے ہو۔''

جو سر پہلے ہی شرم سے جھکے ہوئے ہوں انہیں یاددہانی سے فائدہ؟

ایک گلی گھوم کر دریائے کبیر پر جا نکلی ہم دریا سے ہم آغوش سڑک پر چلتے رہے۔ پُرانی حویلیوں کی خستہ حال دیواروں کے ساتھ ساتھ ٹریفک خال خال ملی کافی دُور تک لہروں کے ہم قدم چلتے رہے انہی کی مانند لب بستہ، کروٹ کروٹ بے چین، ٹانگیں جواب دیتیں تو شوق ہمت

بڑھاتا۔ لہریں چُوم چُوم آنے والی بادِ جنوب آہستہ سے کان میں کہہ جاتی۔ ''یہ مدفن عظمت ہے محتاط تر''۔

کبیر کے اس پار ہنگام زندگی اور بھی معدوم تر معلوم دیا۔

زندگی توانا ہو تو کنارے لہروں پر غالب ہوتے ہیں۔ اس پر بڑھاپا آ جائے تو دریا کی لہریں کناروں میں دُوری کا سبب بنتی ہیں۔

''جرم میں کروں مجرم اینٹ پتھر ٹھہریں؟'' معلوم نہیں اشرف کو کیا سوجھی۔

''قرطبہ اینٹ پتھر تو نہیں تھا۔ میرا مجرم وہ عظیم اور حسین قرطبہ ہے شاعروں نے جس کے قصیدے لکھے اور مؤرخوں نے جس پر آنسو بہائے۔'' اشرف سوال اٹھائے اور سمیع خاموش رہے؟

بے حس پتھروں کو زندہ قومیں دھڑکنیں عطا کرتی ہیں۔ اینٹ پتھر کے محلوں میں زندہ و جواں انسان بس جائیں تو اینٹ پتھر بھی زندہ ہو جاتے ہیں، بے حمیت اور بے بس باسیوں کے لئے وہی اینٹ پتھر لوحِ مزار بن جاتے ہیں۔ جامع قرطبہ، مدینۃ الزہرا، القصر، کنارۂ روان کبیر مسلمانانِ اندلس کے لوحِ مزار ہیں۔ جامع قرطبہ اہل علم و حکمت کا لوحِ مزار ہے۔ مدینۃ الزہرا تیغ و تدبیر کا لوحِ مزار ہے۔ کنارِ کبیر قرطبہ کے اہلِ حرفہ و اہلِ زر کا لوحِ مزار ہے۔ مزار تو اہل مزار کی مانند نابود ہو گئے۔ لوحِ مزار باقی ہیں۔ جن سے سیاح ان کی عظمت و حکمت کا اندازہ کرتے ہیں۔ گائیڈ ان پتھروں کے سرہانے کھڑے ہو کر سیاحوں کو ان لوگوں کی کہانیاں سُناتے ہیں جنہیں پتھر اُٹھا کر بھی خدا یاد نہ آیا۔ اینٹ پتھر کی صحبت نے انہیں اینٹ پتھر بنا دیا تھا۔

''آپ کس سوچ میں گم ہیں؟'' موٹے نے خاموش پا کر پُوچھا۔

''اینٹ اور انسان کا رشتہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''آج قرطبہ دیکھ لیں پھر سوچتے رہنا اس کے لئے صدیاں پڑی ہیں۔'' لمبے نے مشورہ دیا۔

''صدیاں گزر گئیں تمہارا طرزِ فکر نہ بدلا۔'' سمیع نے اس پر بھی وار کیا۔

اس اچانک حملہ سے لمبا پھر بحرِ خاموشی میں غوطہ زن ہو گیا۔ موٹے کا چہرہ محروم تاثر رہا ایسے سپاٹ جیسے پیشہ ور گورکن اپنے والد محترم کی قبر کے پاس سے گزر جائے۔

گلی گلی گھوم کر ہم جامع قرطبہ کی راہ چلنے لگے سٹیفن سے قصر خلافت کے سامنے ملنے کا وعدہ

تھاالمنصور کی بنائی دیوارِ جامع کے بیرونی سنگ وخشت پریشان حال ملےان کاصدیوں پُرانا باہمی رشتہ کمزور ہو چکا تھا کھڑکیوں اور دروازوں کے خوبصورت نقش ونگار جان کنی کی منزل میں تھے کسی دستِ شفا کے فوری طالب ورنہ وہ مرحلہ آنے والا ہے جب ماہرین نقل کی بھی اصل تک رسائی محال ہوگی۔مرمت اور بحالی کا سارا زور القصر کی سمت ہے۔جدھر سیاح پڑاؤ کرتے ہیں۔ہم اینٹ اور پتھر کے حضرت انسان سے رشتہ کے بعد پتھروں کے باہمی رشتہ کی کمزوری اور زوال پذیری کا منظر کتنی ہی دیر تک دیکھتے رہے۔

نارنجیوں کے صحن میں آج بھی ہجوم خلق بلکہ خلقِ ہجوم تھا۔قلبِ جامع میں پیوست سٹیج پر زوال قرطبہ کا ڈرامہ کھیلا جارہا تھا اصل ڈرامہ کے سارے کردار مسلمان تھے نقل ڈرامہ کے سارے کردار عیسائی تھے۔سکول کے بچے زوال پذیر عُمّال وامراء کے لباس میں لوگ بڑی تعداد میں ڈرامہ دیکھنے آئے تھے۔

اور مینارہ توحید پر پرفشاں محافظ قرطبہ کی ناک پر سے سُورج کی شعائیں منعکس ہورہی تھیں۔

باقی دن مجھے سٹیفن کے ساتھ کھنڈرات گردی کرنا تھی۔ان میں سے کسی کو اس سے دلچسپی نہیں تھی اپنے قافلہ کو سپرد کام کیا اور القصر کے سامنے چبوترے کی طرف چل دیا۔سامنے میدان میں بھی کم سن بچوں اور عمر رسیدہ سیاحوں کا ہجوم تھا گلے میں کیمرہ ہاتھ، میں رہنما کتاب، وہ ایک ہی دن میں سارا قرطبہ دیکھنے آئے تھے۔مدینۃ الزہرا سے جامع قرطبہ تک کے بارے میں گائیڈوں کی جگالیوں سے سیر ہوکر ان کی سب سے زیادہ دلچسپی بگھیوں کی سیر میں تھی۔ہر طرف بگھیاں ہی بگھیاں تھیں۔سیاحوں کو لے جاتی سیاحوں کو لاتی اور سیاحوں کی منتظر۔

سٹیفن گھٹنوں پر اخبار پھیلائے مراقبہ کی حالت میں تھا۔ہجوم میں بھی ہجوم سے الگ کیمرے کی کلک پر بیدار ہُوا۔اپنے دائیں ہاتھ میں بیف برگر کو غور سے دیکھا اور اُٹھ کر چل دیا۔

''کہاں؟''

''اسے دفن کر آؤں۔''

''کیوں؟''

چیونٹیاں چڑھ گئی ہیں۔''

چند بائٹ لے کر وہ مراقبہ میں چلا گیا تھا۔کیڑیاں حال پوچھنے آئیں اور دعوت اڑانے لگیں۔

''احمقوں کے چبوترے پر میں بھی احمق بن گیا تھا۔''اس نے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا:

قصر خلافت کے سامنے ایک وسیع چبوترہ ہے جس کے اُوپر سے گزر کر قصر کے اندر جاتے ہیں۔اس چبوترے سے تھوڑے فاصلے پر اسلامی دور میں اکادمی ادبیات کی شاندار عمارت ہوتی تھی۔ادیب، شاعر، اہل فن جس کا جی چاہتا جتنا عرصہ چاہتا کسی بھی شہر اور حصّہ اندلس سے آکر وہاں ٹھہر سکتا تھا۔قیام، طعام، لباس، لوازمات سب اکادمی فراہم کرتی تھی اب اس جگہ لاٹ پادری کا محل ہے اس کے تھوڑے فاصلے پر انتظامی دفاتر ہوتے تھے اور قصر خلافت کے سامنے اس چبوترے پر لوگ جمع رہتے تھے مسافر، فریادی، علماء، ادیب، شاعر، سیاح اور قصر خلافت اور دارالخلافت کے زائر۔''عیسائی مؤرخوں اور داستان طراز گائیڈوں نے اس کے بارے میں بھی کوئی داستان ایجاد کر لی ہے''

''افسوس تو یہی ہے کہ ابھی تک کسی مؤرخ اور گائیڈ کا اس داستان کی طرف خیال نہیں گیا۔لوگ آثار دیکھ کر چلے جاتے ہیں جامع مسجد مدینۃ الزہرا دیکھ کر سمجھتے ہیں قرطبہ دیکھ لیا حالانکہ اس چبوترے اور اس کے احمقوں کے بغیر نہ سیاحت مکمل ہوتی ہے نہ مسلمانوں کے زوال کی کہانی سمجھ میں آتی ہے۔''سٹیفن نے لیکچر شروع کیا۔

''لیکن یہ اسے احمقوں کا چبوترہ کہے بغیر بھی تو ہوسکتا ہے۔''

''قرطبہ کو قرطبہ کہے بغیر اسے سمجھا جاسکتا ہے؟ جامع مسجد کو آپ گرجا کہہ کر جان سکتے ہیں؟''اس نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

''وہ احمق تھے کون؟''

''جن کی حماقت سے یورپ کی سب سے طاقتور سلطنت تباہ ہوئی دُنیا کا سب سے خوشحال اور حسین شہر قرطبہ برباد ہوا۔تم ان احمقوں کو نہیں جانتے؟''

''تاریخ میں اس شہر کی دانائی اور داناؤں کا ذکر تو ملتا ہے کسی احمق کا نام نہیں پڑھا۔''

''احمق نام کے نہیں کام کے احمق۔اگر آپ غور کریں تو دنیا کا یہ سب سے بڑا مرکز علم وفکر سب سے بڑا احمق نگر بن گیا تھا۔اللہ تعالیٰ جب کسی خاندان کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو اس میں ایک

احمق پیدا کر دیتے ہیں۔قرطبہ بڑا شہر تھا اندلس بڑی سلطنت تھی ایک احمق اسے تباہ نہیں کر سکتا تھا اس کے لئے سینکڑے احمقوں کی ضرورت تھی۔ایک پاگل نے ان میں سے تیس کا انتخاب کیا اور چند ہی ماہ میں قرطبہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔اندلس کی عظمت اور خوشحالی کا جنازہ نکال دیا۔وہ احمق اسی چبوترے پر اکٹھے ہُوئے تھے۔'' وہ چبوترے پر ٹہلنے لگا ''یہیں کہیں اپنے عماموں میں ہتھیار چھپائے کھڑے رہے ہوں گے۔لوگ اس شام بھی قصرِ خلافت اور اس سے آگے وادی الکبیر تک پھیلے باغات کا نظارہ کرتے رہے۔بے فکر بے پرواہ یہی طریق تھا یہی روایت رہی۔ایک پاگل نے ان احمقوں کی مدد سے محافظوں پر حملہ کر دیا۔اس حماقت کے بعد صرف چھ ہی ماہ کی مدت میں عیسائیوں نے دو مرتبہ ناقابلِ تسخیر مسلم اندلس کا دارالخلافہ قرطبہ لوٹا۔اگر یہ احمق نہ ہوتے اہلِ قرطبہ میں احمقوں کی اکثریت نہ ہوتی تو یہ کیسے ممکن ہوتا؟'' مسلم اندلس کا زوال ایک غیر مُسلم کا تجزیہ۔

قرطبہ کے محافظ سنت کی ناک پر سُورج کی کرنوں کا زاویہ بدل چکا تھا۔قصر خلافت کے برجوں کے سائے احمقوں کے چبوترے پر دراز ہونے لگے تھے۔سٹیفن نے میرے انتظار میں القصر کے داخلہ کے ٹکٹ خرید لئے تھے اس نے احمقوں کی داستان چھیڑ دی تو احمقوں کا چبوترہ ناقابلِ تسخیر ہوگیا۔

تعصب کا بیج تنگ ذہنوں میں جڑ پکڑتا ہے۔تعصب کا پودا ہمیشہ بارانِ رحمت سے محروم رہا ہے۔ہمیشہ انسانی خون پر پلا ہے۔مسلم اندلس کی سلطنت ابرِ رحمت سے محروم ہُوئی تو مسلمانانِ اندلس اپنے خُون سے اس پودے کی پرورش کرنے لگے۔وہ اس وقت تک اسے خون سے سینچتے رہے جب تک اس ملک میں آخری مسلمان باقی تھا۔علماء وحکماء، دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، تاجروں، پیشہ وروں، فوجیوں، حاکموں، عربوں، بربروں سب نے اپنے بچوں اور خاندانوں کا خون اس پودے کی جڑوں میں انڈیل دیا۔زمین اندلس اب بھی اس خون سے سُرخ ہے۔اندلس کی ملت مسلمہ تعصب کی جلائی اپنی ہی آگ میں جل کر خاکستر ہوگئی تھی۔

ڈھلتے سُورج کی شعاعیں لاٹ پادری کی کوٹھی پر منعکس ہونے لگیں تو مقتل خلافت کے برجوں کے زمین بوس سائے ہوس جاہ کی مانند ہمارے قدموں سے چمٹ گئے۔سیاحت میں

وقت کا دامن پکڑنا پڑتا ہے جس طرح سیاست میں وقت کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔مَیں رُک بھی جاتا تو سٹیفن میری خاطر زیادہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔فکرِ حماقت ذہن سے جھٹک ہم قصر کی طرف چل دیئے۔آہستہ آہستہ جیسے کوئی مجرم پھانسی کے تختہ کی طرف جائے۔انجانی راہ میں جانے واقعات و حادثات کے پتھروں پر چلتے ہوئے نہ خستہ حال دربانوں نے روکا نہ ہمیں ان سے دست بدست ہونے کا موقع نصیب ہوا۔

سٹیفن نے ٹکٹ دکھایا ان کی زبان میں کچھ کہا وہ ایک طرف ہٹ گئے۔میرے آنے کی بجائے اس قصر سے میرے جانے کی کہانی ان کے تاریخ زدہ ذہنوں میں تازہ ہوگئی ہوگی۔چھوٹے کمرے موٹی دیواریں قرطبہ کا القصر مسلمان خلفاء سے منسوب ہونے کی بناء پر ہی مرجع خلائق ہے ورنہ اس کے در و دیوار مسلم طرزِ تعمیر کی نفاست کی گواہی نہیں دیتے۔مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی عیسائی حکمران اسی یا اسی مقام پر موجود محل میں رہتے تھے۔دورِ عروج میں مسلمانوں نے شہر سے باہر شہر خلافت بسایا مدینۃ الزہرا۔طرز حکومت اور طرز معاشرت خلیفہ کو منبر و محراب اور عام مسلمانوں سے الگ رہنے کی زیادہ دیر تک اجازت نہ دے سکتے تھے۔مدینۃ الزہرا فوجی اور انتظامی شہر بن گیا۔خلیفہ پھر سے جامع قرطبہ کے پڑوسی میں آن بسا۔آخری دَور میں کوئی خلیفہ بھی قرطبہ والوں سے دُور رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا آخری دَور کے خلفاء اور امراء اسی محل میں جئے مرے۔ان کا عشرت قدح، قید خانہ اور مقتل یہی قصر بنا۔

قصر خلافت کے زائرین میں کم عمر افراد کی کثرت تھی شاید اس لئے کہ یورپ اور امریکہ کے استعمال شدہ بوڑھے، بوڑھیاں سیڑھیاں چڑھنے اُترنے کی مشقت کے قابل نہ تھے۔سٹیفن دیواریں دیکھتا رہا۔مَیں نوشتہ دیوار پڑھتا پھرا۔''تو ہے اگر کم عیار میں ہُوں اگر کم عیار تیرا مقدر فنا میرا مقدر فنا۔''

''تمہیں معلوم ہے المہدی کا سر کس برج پر سے باہر پھینکا گیا تھا؟'' سٹیفن نے ایک برج سے وادی الکبیر کا جائزہ لیتے ہُوئے اچانک سوال کیا۔

المہدی کی دس ماہ کی حکومت کے دوران لاکھوں سر تن سے جُدا کئے گئے تھے۔درجنوں سر قرطبہ کے بازاروں میں گھمائے گئے تھے۔مَیں کس کس سر کے بارے میں جواب دیتا۔جس کے

دربار میں سر اُٹھا کر چلنا جُرم عظیم ہو اس کا اپنا سر کیسے سلامت رہتا؟ المہدی نے ہشام سے خلافت اپنے نام لکھوائی اور اسے کسی برج کے سپرد کر دیا۔ اسے خدشہ ہوا کوئی پھر سے ہشام کے نام پر انقلاب نہ برپا کر دے تو ہشام کو نہلا کر کفن دیا اور سپرد خاک کر دیا۔ قاضیٔ قرطبہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اہل قرطبہ کا نشہ انقلاب مدھم پڑا تو غلطیٔ انقلاب کا احساس ہُوا۔ خام فکر کبھی توانا قیادت تلاش نہیں کر سکتی۔ بربر سردار اپنی رسوائی سے ناراض علماء المہدی کی عیاشی پر نالاں اہلِ حرفہ اس کی جوہر نہ شناسی کے شاکی۔ المہدی کے والد کے ایک چچازاد بھائی نے نیا علمِ انقلاب بلند کر دیا۔ قرطبہ کی پیپلز آرمی اس کے ساتھ ہوگئی۔ باقاعدہ فوج نے پیپلز آرمی کو پچھاڑ دیا۔ داعیٔ انقلاب اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ بربروں نے مقتول کے بھتیجے سلیمان پر اتفاق خلافت کر لیا۔ ایک ملک دو خلیفے۔ سلیمان کے قاصد قشتالیہ کے عیسائی حکمران سے مدد کا سودا کرنے پہنچے تو خلیفہ کے ایلچی پہلے سے وہاں موجود تھے۔ شانجہ شاہِ قشتالیہ چند ماہ پہلے جس سلطنت کے نام سے کانپتا تھا آج اس کے دونوں خلیفوں کے ایلچی اس کے دربار میں طالب امداد کھڑے تھے۔ شانجہ نے بولی لگائی سلیمان جیت گیا مدد کے عوض مسلم اندلس کے زیادہ زیادہ شہر اور قلعے دینے کی بولی۔

المہدی کے ایلچی بولی ہار کر واپس چلے گئے۔ سلیمان اور شانجہ کی فوجیں قرطبہ کی طرف بڑھیں۔ المہدی اپنی عوامی فوج لے کر ان کے مقابلہ پر نکلا۔ دریائے کبیر کے کنارے صرف تیس بربروں نے اس کی پیپلز آرمی کو شکستِ فاش دے دی۔ شکست خوردہ پیپلز آرمی کے دس ہزار جنگجو صرف وادی الکبیر کے حصہ میں آئے۔ قلعہ بند المہدی نے سلیمان کو پیغام بھیجا ''ہم دونوں ہشام کو خلیفہ مان لیتے ہیں''۔ جس قاضی شہر نے خلیفہ ہشام کی نمازِ جنازہ کی امامت کی تھی وہی اس کی زندگی اور خلافت کا پیغام لے کر گیا۔ ''ہم نے ہشام کو نہیں اس کے ہم شکل عیسائی کو قبرستان شاہی میں دفنایا تھا'' بربر صرف ہنس دیئے۔ ''ہمارا خلیفہ سلیمان ہے ہشام المویدکو آپ پاس رکھیں''۔

المہدی ہشام کو قلعہ کی سب سے اونچی دیوار پر بٹھا کرتا کہ سب دیکھ سکیں خود خفیہ راہوں سے طلیطلہ بھاگ گیا۔ عیسائی اور بربر فوجوں نے مل کر اہل قرطبہ کو جُرمِ انقلاب کی سنگین سزا دی۔ سلیمان نے ہشام سے خلافت اپنے نام لکھوائی اور اسے پھر سے کسی بُرج میں قید کر دیا۔ اب المہدی دُوسرے عیسائی حکمرانوں کی مدد سے حملہ آور ہُوا۔ اسے بھی کامیابی ہُوئی۔ فاتح فوجوں

نے ایک بار پھر اہلِ قرطبہ کو ان کی غلطیوں کی دل کھول کر سزا دی۔ شکست خوردہ بربر فوجوں نے پلٹ کر حملہ کیا۔ المہدی اور اس کی فوج ایک بار پھر شکست آشنا ہُوئی۔ وادی الکبیر نے پھر اپنا حصّہ بٹایا۔ سلیمان کی افواج پھر محاصرہ زن ہوئیں۔ المہدی کی حامی عیسائی فوجیں قرطبہ کو ایک بار پھر لُوٹ کر روانہ ہوگئیں۔ اہل شہر کو اپنا سب کچھ لٹنے کا اتنا دکھ نہ تھا جتنا لٹیروں کے جانے کا۔ وہ گلیوں میں ایسے چلتے جیسے مُردے چلیں۔ انہیں اپنے گناہ ستا رہے تھے وہ جانتے تھے کہ انہوں نے جوش انقلاب میں بربر سرداروں کے اہل خاندان کا کیا حشر کیا تھا۔ پھر ایک روز قرطبہ کے بازاروں میں سوار ہشام المویدزندہ باد کے نعرے لگاتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے ہشام کو قید سے نکال ہم جہاں کھڑے تھے اسی جگہ دربار ہال میں ایک بار پھر مسند خلافت پر بٹھا دیا۔ المہدی غسلخانہ سے بھاگتے ہوئے آئے۔ ہشام کے پہلو میں بیٹھنا چاہا اور اپنے ہی سرداروں کے ہاتھوں قتل ہُوئے۔ القصر کا دربار ہال خون آشنا اہل قرطبہ کی آنکھیں خون فشاں۔ وہ بنی عامر کا زمانہ یاد کر کے روتے تھے جب سلطنت خوشحال اور نظم عروج پر تھے۔ اپنی غلطیٔ انقلاب کا ماتم کرتے مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ جس انقلاب کی بنیاد انسانی فکر کی بجائے ہوس کی گہرائی پر ہو جس میں نفرت اور اشتعال مقصد اور منزل پر غالب ہوں جس کی قیادت توانا اور منظم جماعت کے ہاتھ نہ ہو اُس بے لگام انقلاب کا انجام وہی ہونا تھا جو اہلِ قرطبہ کا ہوا۔ طویل محاصرہ کے بعد جب سلیمان کی فوج قرطبہ میں داخل ہوئی تو در و دیوار خُون میں نہا گئے۔ مقتولین میں جامع قرطبہ کے امام سعید بن منذر اور ان کے ہم پایہ عالم فقیہہ اور محدث سب ہی شامل تھے۔ انقلاب نے سلطنت ہی ختم نہ کی اہلِ انقلاب کو بھی چاٹ لیا۔ کئی روز تک قرطبہ جلتا رہا۔ بچے کھچے اہلِ قرطبہ سلیمان کے حضور قصیدہ خواں ہُوئے۔

سلطنت، دولت، عزت، آبرو، گھر، آن بان، سب لُٹ چکے تھے

سلیمان نے قصر خلافت میں داخل ہوتے ہی ہشام کو بلوایا اور اس کے خلاف وہی فرد جرم عائد کی جو بہادر شاہ ظفر کے خلاف ساڑھے آٹھ سو سال بعد دہلی کے لال قلعہ میں عائد کی گئی تھی۔ ساڑھے آٹھ صدیاں پہلے قرطبہ کے القصر میں ہشام نے بھی وہی جواب دیا تھا جو بہادر شاہ ظفر نے فوجی عدالت کے روبرو دیا تھا ''میرا کچھ قصور نہیں۔ مَیں نے جو کچھ کیا اپنی مرضی سے نہیں کیا تھا۔ وہ مجھ سے کرواتے رہے مَیں کرتا رہا۔ مَیں مجبور تھا'' بہادر شاہ ظفر کو جرم ضعیفی میں رنگون بھجوا دیا

گیا جہاں سے وہ کبھی واپس نہ آیا۔ سلیمان نے ہشام کو پھر سے القصر کے کسی برج میں مقید کر دیا پھر اس کا کیا بنا تاریخ کو بھی معلوم نہیں۔ بہادر شاہ ظفر، ہشام المویدؔ ''دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں'' دو حکمران اک انجام۔

فلپ طرز تعمیر کی باریکیاں بیان کرنے لگا۔ مَیں نے ہشام کو آواز دی تو بہادر شاہ ظفر سامنے آ کھڑا ہوا۔ ہشام عبدالرحمٰن الداخل اور عبدالرحمٰن الناصر کا وارث، بہادر شاہ ظفر، بابر اور اکبر کا وارث، ہشام علم دوست ظفر شاعر دوست ہشام عروج سے زوال کے مرحلوں سے خود گزرا۔ بہادر شاہ ظفر کو زوال زدہ سلطنت ملی۔ مرکزِ دہلی کمزور ہُوا۔ مغلیہ سلطنت صوبائی گورنروں، علاقائی نوابوں میں بٹ گئی۔ مرکز قرطبہ کمزور پڑا سلطنتِ اندلس علاقائی سرداروں اور جرنیلوں نے آپس میں تقسیم کر لی۔ پھر نہ نوابیاں رہیں نہ سرداریاں بچیں۔ حکمرانوں کی کمزوریوں اور کوتاہیوں، سرداروں اور جرنیلوں کی ہوسِ اقتدار کی سزا مسلمان قوم کو ملی۔ دہلی کے کوچہ و بازار خونِ مسلم سے سُرخ ہوئے قرطبہ کی ہر اینٹ خونِ مسلم کی امین ہے۔ قرطبہ کے قصرِ خلافت نے آٹھ صدیاں پہلے جو حشر دیکھا تھا دہلی نے آٹھ صدیاں بعد اس کا نظارہ کیا۔ آٹھ صدیاں گزر گئیں اہلِ حرم نے پھر بھی کوئی سبق نہ سیکھا؟ اندلس میں سلطنت زوال پذیر ہوئی۔ افریقہ سے یوسف بن تاشفین آیا اس کے جانشین آئے۔ دہلی کی سلطنت بچانے کے لئے احمد شاہ ابدالی نے زحمت گوارا کی مگر کسی کی مدد کسی سلطنت کو نہ بچا سکی۔ حکمران ہوں یا اقوام ہر میدانِ حشر میں اپنے ہاتھ اپنا ہی نامہ اعمال رہا۔ قصرِ خلافت کے برج کی بلندی فکر و عمل کی پستی میں بدلنے لگی۔

دیکھو یہاں سے وادی الکبیر کا مناظر کتنا حسین ہے'' سٹیفن اب بھی وہیں کھڑا تھا۔ آسمان کا نیل پانی کی سطح پر تیرتا معلوم ہوتا تھا۔ پل پر سے مسافروں اور سیاحوں کی ٹولیاں جا رہی تھیں۔ کنارِ دریا، محفلِ حسن اور اندلس کی دھوپ، پارک میں اہلِ یورپ کی ٹولیاں سیاحت کی تھکاوٹ دُور کرنے آ بیٹھیں سٹیفن نے پہلی دفعہ کسی غیر عمارت میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔ اصولاً مجھے اس کی دل جوئی کرنا چاہئے تھی مگر جہاں خلفاء حکماء اور امراء اصول چھوڑ گئے تھے مَیں کیسے پابندی کرتا؟

ہم نیم تاریک پر پیچ راہوں سے ہوتے ہوئے کھُلے ایک میدان میں پہنچ گئے۔ اتنے خوفناک القصر کے دامن میں اتنا وسیع و عریض باغ بھی ہے، معلوم نہ تھا۔ سٹیفن کو بھی ٹاٹ میں

کمخواب کے پیوند کا علم نہ ہوگا، ورنہ ذکر تو کیا ہوتا۔ لوگ چلتے گئے ہم چلتے رہے اور باغ میں آ گئے اہلِ اندلس نے زمین کو جنت زاد بنانے میں جو جتن کئے یہ باغ ان میں سے ایک ہوگا۔ شفاف نہریں مرمریں کنارے خوشگوار پھوارے اور دونوں طرف سرو قد درخت۔ خطہ زمین کو تختہ در تختہ بانٹ کر شاید جنت کے سات تخت بنائے ہوں گے۔ ہم تھے تو جنت سے نکالے ہوئے پر دل جنت میں بھی خوش نہ ہُوا۔ حور و غلمانِ ارضی کے درمیان گھوم پھر کر ایک بار پھر احمقوں کے چبوترے پر نکل آئے۔ اس سفر حماقت میں اہلِ قرطبہ نے ایمان تک کھو دیا تھا ہم خوش رہے کہ ایمان بچ گیا۔

ساونتِ عرب کا پرتَو

سبز پوش سرامورینا کی دامن میں تہ خاک ایک شہر ابدی نیند سو رہا ہے، یہ زندہ رہا تو اس کی قوت اور دانائی کا دنیا بھر میں چرچا رہا۔ اس کے حسن اور رعنائی کی کہانیاں آفتاب کی کرنوں پر سفر کرتیں تھیں پھر اس شہر نے عنفوانِ شباب میں خودکشی کر لی۔ تاریخ روتی رہی اور مدینۃ الزہرا اپنے گلے میں نسلی تعصب کی رسی کا پھندا ڈال کر زوال کی سولی سے لٹک گیا۔

زندگی میں یہ شہر سلطنتیں بانٹتا تھا۔ رسمِ سخاوت بعد از مرگ بھی جاری ہے۔ اس آستانہ سے کبھی کوئی خالی ہاتھ نہیں گیا کسی کو ہیرے جواہر ملے کسی کو سونا چاندی عطا ہوئے کسی کے حصہ میں نوادرات آئے اور کسی کی جھولی دولت عبرت سے بھر دی۔ پونے دس صدیاں گزر گئیں یہ ''فیض'' آج بھی جاری ہے۔ روزانہ سینکڑے لوگ آتے ہیں اور اپنی اپنی وسعتِ دامن کے مطابق فیض یاب ہو کر جاتے ہیں۔ مَیں نے اس آستانہ پر حاضری کا ارادہ ظاہر کیا تو اشرف نے بڑے غور سے مجھے گھورا ''وہاں کیا ہے؟ پتھروں کے ڈھیر؟ چلیں آج اندلسی میلہ دیکھتے ہیں۔''

چہرے پر ہزاروں میل کی دھول دل پر صدیوں کا بوجھ۔ جز اشک ندامت یہ دھول نہیں دھلتی جز سنگ یہ بوجھ نہیں اٹھتا۔

''سارا دن کھنڈروں میں ضائع نہ کر دینا'' اس نے ٹیکسی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اسے کیسے بتاتا کہ مجھے تو اتنی دور کھینچ ہی کھنڈر لائے ہیں یہی تو دن ہیں جو ضائع نہیں ہوئے یہی تو دن ہے جو ضائع نہیں ہوگا اس منزل میں سٹیفن نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ''مجھے موروں کے تعمیری شاہکاروں سے دلچسپی ہے ان کے تخریبی کارناموں سے کوئی غرض نہیں''۔

یہ فنِ تعمیر کی تاریخ سمجھنے آیا ہے۔ مَیں فنِ تخریب کا مطالعہ کرتا پھر رہا ہوں۔ یہ سچ ہی تو کہتا ہے۔

ایک طرف سرسبز سرامورینا دوسری طرف میلوں تک پھیلی نوکیلے ناتراشیدہ پتھروں کی سیاہ دیوار۔ بھدے پھاٹک کے شاہی مخبر کے ہونٹوں کی مانند سختی سے بند کواڑ۔ جس کے پیچھے مدینۃ الزہرا کے کھنڈرات تھے اور دونوں کے درمیان میں ایک اکیلا زائر آدابِ زیارت سے ناآشنا، اوقاتِ زیارت سے بےخبر کھڑا تھا۔

ثباتِ سلطنت کی منزل پر خلیفہ عبدالرحمان نے اپنے لئے الناصر باللہ کا لقب اور شہر خلافت کے لئے سرامورینا کا دامن پسند کیا۔ موسم کی سرد اور قرطبہ کی گرم ہواؤں سے محفوظ۔ مگر خلیفہ کو سرامورینا کی سیاہی اور برہنگی سخت ناگوار تھی۔ اس نے پہاڑ پر اس قدر درخت لگوائے کہ ''سیاہ حبشی'' جبل العروس بن گیا۔ دامنِ کوہ کی سطحوں کو کاٹ کر چالیس سال کی طویل مدت میں جو شہر مکمل ہوا تھا تیس سال کی قلیل مدت آباد رہا۔ جب یہ شہر اٹھایا جا رہا تھا، شاہانِ عالم اس کے لئے نذرانے پیش کر رہے تھے۔ عظیم بازنطینی سلطنت کے حکمران خلیفہ اندلس کے شہر کے لئے اپنا حصہ ڈال رہے تھے بحریہ کے جہاز قسطنطنیہ، رومتہ الکبریٰ، فرانس، قرطاجنہ، تیونس، ملک ملک سے ستون، سنگ مرمر، حوض اور کیا کیا لانے میں لگے ہوئے تھے، اندلس کے پہاڑوں سے کھود کھود کر سُرخ و سفید سنگ نایاب قرطبہ لایا جا رہا تھا۔ سالوں سے دس ہزار افراد مسلسل خواہش خلافت کی تکمیل میں مصروف تھے منبر سے آواز آئی۔ ''اے بانی زہرا تو تعمیر شہر میں اتنا زیادہ مستغرق رہتا ہے کہ تھوڑا بھی توقف نہیں کرتا۔ بخدا یہ شہر تباہ ہونے والا نہ ہوتا تو بہت حسین ہوتا۔''

نمازیوں نے سانس روک لی۔ کچھ نے سر گھٹنوں میں دے لئے۔ خلیفہ کی پیشانی پر شکنیں گہری ہو گئیں۔ شکن شناس ولی عہد نے قرآن پڑھ کر مزاج خلافت کو ٹھنڈا کیا پھر بھی الناصر خاموش نہ رہ سکا۔ ''انشاءاللہ یہ شہر کبھی کھنڈر نہیں بنے گا۔''

خلیفہ کی آواز میں ناراضگی تھی۔ خلیفہ اِدھر کی اینٹ اُدھر کے پتھر سے شہر بناتا رہا۔ اِدھر کے عرب اُدھر کے بربر سے قوم بنانے پر کسی نے دھیان نہ دیا۔ عبدالرحمان الناصر کی عمر پوری ہونے کے ساتھ ہی قاضی منذر کی پیشگوئی بھی پوری ہو گئی۔ مدینۃ الزہرا کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ شہر اور عمارتیں اینٹ پتھر کی مضبوطی سے نہیں قوموں کی مضبوطی سے لازوال بنتے ہیں۔ منبر نے جواب

دیا تھا۔ ''میں نے اپنا فرق پورا کر دیا''۔

فلک نے وہ جواب بھی سنا اور مدینتہ الزہرا کی تباہی بھی دیکھ لی۔ قاضی منذر کا اپنا فرض تھا۔ وقت کا اپنا فرض اور فلک کا اپنا فرض۔ مقدر کے ساتھ مٹی کا رویہ بھی بدل جاتا ہے۔ اس شہر کا مقدر بلند تھا تو اس کو آنے والی راہیں چلنے والوں کے پاؤں چومتی تھیں۔ خلیفہ اس کی راہ پر چلتا تو قرطبہ سے مدینتہ الزہرا تک سڑک سُرخ شامیانوں کے پاؤں چوم لیتی۔ خلیفہ اس کی راہ پر چلتا تو قرطبہ سے مدینتہ الزہرا تک سڑک سُرخ شامیانوں سے ڈھانپ دی جاتی۔ ملکہ عالیہ کو گزرنا ہوتا تو اس پر زرد تنبوتان دیئے جاتے تھے اور میری راہ ماضی کی گرد اور تاریخ کے غبار سے اٹی پڑی تھی۔

اس روز مدینتہ الزہرا پہنچنے والا میں پہلا زائر تھا۔ جوشِ عقیدت میں یہ بھی نہ خیال کیا کہ کھنڈرات کی زیارت کے بھی اوقات مقرر ہیں۔ ٹکٹ والے کی کھڑکی ابھی تک بند تھی۔ پھاٹک کے سوراخ پر آنکھ رکھی تو شکستہ محرابوں کے جنگل نے سینہ چاک کر لیا۔ قصرِ خلافت کی محرابوں نے بازو پھیلا دیئے۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جو میرے اور تاریخ کے درمیان حائل تھی۔ جس کے سر پر کانٹے دار تار لپٹی تھی۔ زندگی میں حفاظت ہوتی تھی مردے کی نگرانی کیوں نہ ہو؟ ایک بڑے سے پتھر کے سر پر پاؤں رکھ کر ذرا اونچا ہو گیا۔ دنیا میں اونچا ہونے کے لیے کسی کے سر پر تو پاؤں رکھنا ہی پڑتا ہے۔ کھنڈرات میں رنگ رنگ خودرو پھول کھلے تھے۔ جنگلی پودوں سے آگے دُور تک گائے گھوڑے چرتے پھر رہے تھے۔ شہر کے آخری میدانی حصّہ میں

اس شہر میں خلیفہ کے ملاقاتی حکمرانوں اور سفیروں کو گھنٹوں مشقت انتظار برداشت کرنا ہوتی تھی۔ حکمران نہ سہی خواستگار دیدار تو تھا۔ شہر خلافت نہ سہی کھنڈرات شہر تو ہیں انتظار لازم تھا۔ کھڑکی کھلنے کے انتظار میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک عیسائی حکمران کی ملاقات کی کہانی شروع کر دی۔ اندلس کی ایک ریاست کے حزیمت خوردہ حکمران آرڈونو کی کہانی جو الحکم سے اپنی سلطنت کی بھیک مانگنے آیا تھا۔ ازن باریابی پر آرڈونو نے وہی لباس زیب تن کیا جو اموی خلفاء پہنتے تھے۔ یہ بھی خراجِ محبت کا ایک انداز تھا۔ سفید ریشمی لبادہ، سر پر پگڑی میں چمکتے ہوئے ہیرے جواہر آداب باریابی سکھانے کے لئے تولیدو کا گورنر اور قرطبہ کا ایک عیسائی جج ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ راستہ کے دونوں طرف قطار در قطار کھڑے مسلح سپاہیوں کے درمیان سے گزرتے

وقت سابق حاکم اور اس کے بیس نائٹ اتنے مرعوب ہوئے کہ قصرِ خلافت کے دروازے تک انہوں نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا مبادا آنکھ دل کا حال کہہ دے۔ اس سے آگے صرف جنرل ابن تملوس اور آرڈونو سوار رہے۔ باقی سب پیدل ہو گئے اگلے دروازے سے آگے ڈیوڑھی تک وہ بھی پیدل چل کر گئے جہاں اپنی اپنی باری کا انتظار کرنا تھا۔ باری آئی تو آرڈونو نے احتراماً ہیروں والی پگڑی اور سنہری چوغہ اتار دیئے پھر وہ آہستہ چلتا ہوا مسندِ خلافت کی طرف چلا۔ ہر چند قدم بعد وہ دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک کر آداب بجالاتا ہوا۔ خلیفہ نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ آرڈونو نے خلیفہ کا ہاتھ چوما اور اُلٹے پاؤں چلتا ہوا پندرہ فٹ دور مخصوص نشست پر جا بیٹھا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی باری باری اسی انداز میں اظہارِ عقیدت کیا اور اُلٹے پاؤں چلتے چلتے آرڈونو کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر خلیفہ خاموش رہا جب مہمانوں کے اوسان بحال ہو چکے تو معزز مہمان سے کہا۔ ''اس اعزاز باریابی کے لئے اپنے بخت پر خوش ہو جائیں ہمارے خزینۂ نوازشات سے انعام واکرام کی امید رکھیں ہم تم پر اس سے بھی زیادہ کرم کریں گے جتنی تم ہم سے توقع کر سکتے ہو۔''

آرڈونو کا چہرہ خوشی سے سُرخ ہو گیا وہ اپنی جگہ سے اُٹھا تخت کے پائیدان پر پڑے قالین کو بوسہ دیا۔ ''میں امیر المومنین کا ادنیٰ غلام ہوں مجھے آپ کے جاہ وحشم پر اعتماد ہے میں اپنے جسم اور رعایا کو آپ کے حوالے کرتا ہوں جو حکم ہو گا بجالاؤں گا جہاں جانے کا حکم ہو گا چلا جاؤں گا پوری دیانت اور خلوص سے امیر المومنین کی خدمت بجالاؤں گا۔''

''ہم تمہیں اپنے لُطف وکرم کا اہل سمجھتے ہیں ہمارے تخت کے سایہ اور ہماری پناہ میں آنے کے فیصلے پر آپ بے حد خوشی محسوس کریں گے۔''

خلیفہ کی بات ختم ہوتے ہی آرڈونو ایک دفعہ پھر گھٹنوں کے بل گر گیا خلیفہ کے لئے رحمتوں کے نزول کی دُعا کرتے ہوئے کہا۔ ''کچھ عرصہ پہلے میرے چچا زاد بھائی نے مرحوم خلیفہ سے میرے خلاف مدد کی استدعا کی تھی اس کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا گیا تھا، دربار خلافت میں وہ مجبور ہو کر آیا تھا میری استدعا کا پس منظر مختلف ہے۔ اس کی رعایا کو اس کے کردار پر اعتراض تھا لوگ اس سے نفرت کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنا حکمران چن لیا تھا۔ خدا گواہ ہے میں نے کبھی

حکمرانی کی خواہش نہیں کی تھی لوگوں نے مجھے چُن لیا۔ میں نے اسے تخت سے بے دخل کر کے اپنی مملکت سے نکال دیا تھا۔ مرحوم خلیفہ کی مدد سے اس نے اپنا کھویا ہوا مقام تو حاصل کر لیا لیکن خلیفہ کا اس لطف و کرم کے لئے شکریہ تک ادا نہ کیا۔ میرے آقا اس نے نہ ہی اپنے کرم فرما سے کیا کوئی وعدہ پورا کیا نہ ہی اس وعدے کی شرائط پوری کیں۔ میں نے اپنی مرضی سے ملک چھوڑا ہے۔ میں اپنی ذات اپنی فوج اور اپنے قلعے امیر المومنین کی کمان میں دینے خود حاضر ہوا ہوں۔ کیا میں یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ مجھ میں اور میرے چچازاد بھائی میں بہت فرق ہے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ میں سانچو سے زیادہ قابل اعتماد اور فراخدل ہوں۔''

''تم نے جو کچھ کہا ہم نے سُن لیا ہمیں تمہارے جذبات کا احساس ہے جلد تم دیکھ لو گے کہ ہم اس جذبہ کا کس طرح جواب دیتے ہیں۔ جو لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں ہم تمہیں ان کا حکمران بنائیں گے۔ تمہاری سلطنت کی حدود کا تعین کر کے سانچو سے اس کا احترام کرائیں گے۔''

آرڈونو نے گھٹنوں کے بل گر کر کئی بار شکریہ ادا کیا اور پچھلے پاؤں چلتا ہوا دربار سے نکل گیا۔ ایک ہال میں خالی کُرسی پڑی تھی وہ اس کے سامنے بھی سجدہ ریز ہو گیا۔ اس خیال سے کہ اس پر بھی کبھی کبھی امیر المومنین بیٹھتے ہوں گے۔

کیتھائل کی عیسائی مملکت کے سفیر عبدالرحمان الناصر کے لئے خراج لے کر حاضر ہوئے تو ہر ہال میں سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔ بشپ آف قرطبہ کو بار بار بتانا پڑتا تھا کہ یہ خلیفہ نہیں خدام و حکام خلیفہ ہیں وہ یہ سنتے اور اگلے ہال میں پھر دھوکا کھا جاتے۔

شہر خلافت! وہ زمانہ اور یہ دن؟ اب نہ یہاں کوئی بات کرنے والا ہے اور نہ سننے والا، نہ ادب نہ داد نہ فریاد، تیرے دامن میں اینٹوں کے ڈھیر ہیں، شکستہ دیواریں ہیں، ماتم کناں محرابیں ہیں، خودرو جھاڑیاں ہیں، بے لگام گھوڑے ہیں اور آوارہ گائے ہیں۔

سنہری دھوپ میں سرامورینا کی بلندی پر ایک خوبصورت خانقاہ ابھرنے لگی۔ اس شہر کے کھنڈرات سے مانگے کے سنگ مرمر اور پتھروں سے بنی عبادت گاہ۔ مدینۃ الزہرا کا ملبہ ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں گیا تو اہل کلیسا نے بھی اپنا حصہ وصول کیا۔

امارت خلافت بنی تو یہ شہر بسایا گیا اس کی خاک اُڑی تو نہ خلافت رہی نہ امارت، جو آگ

یہاں سے لگی وہ صدیوں جلتی رہی، مسلم اندلس کو راکھ کر کے بجھی۔ تعصب کی آگ انسانوں کے سینوں سے شروع ہوتی ہے ان کے عقل و فکر، علم و دانش کو راکھ کر کے جسموں کو کھنڈر بناتی ہے اس کے شعلے ہنستی بستی بستیوں پر لپکتے ہیں۔ ملک اور قومیں جل کر خاک ہو جاتے ہیں اور ہوائیں راکھ جنگلوں اور ویرانوں میں بکھیر دیتی ہیں، صدیوں حکمرانی کرنے والی قوم کی سرزمین اندلس میں تو اس کی راکھ بھی باقی نہ رہی۔

چالیس کروڑ دینار کی لاگت سے مکمل ہونے والا شہر پیوندِ خاک ہوا تو کوڑی کوڑی کے محتاج حکمران ان در و دیوار سے سونا اور چاندی اتارا تارا خانہ جنگی کے اخراجات پورے کرتے رہے۔ ہر نئے حکمران نے اس کے اینٹ پتھر سے نئی بستی بسائی۔ تباہی کے سو سال بعد بھی تہ خاک اتنا کچھ تھا کہ مواحدین نے اشبیلیہ کا قصر شاہی مکمل کر لیا۔ مراکش کے قصر شاہی کے لئے ستون مدینۃ الزہرا نے دیئے شہتیر یہیں سے گئے، خانہ جنگی جاری رہی، کھنڈرات لٹتے گئے۔ آپس میں لڑنے والے دشمن سے کیوں لڑتے؟ خالی کُرسی کے سامنے سجدہ ریز ہونے والے آرڈونو کے جانشین نے الحکم کے جانشینوں سے قرطبہ چھین لیا، تخت رہا نہ تاج رہا، قصر رہے نہ مسلمان رہے صرف خانہ جنگی بچی، وہ جہاں بھی گئے خانہ جنگی پیچھے رہی آخری آدمی تک تعاقب کیا، فتنی قتل سے شدید تر ہے قتل میں مقتول فرد ہوتا ہے اور فتنی میں قوم، الحمرا کے وارث ابوعبداللہ نے جبل افسوس سے لوٹ کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اپنی حماقتوں پر۔ اس کی قوم کی حماقتوں پر مدینۃ الزہرا کے کھنڈرات آج بھی روتے ہیں۔ پتھر روئیں تو دھرتی ہچکیاں لیتی ہے، سرامورینا کی بلندیوں سے نازل ہوئی زیرزمین نہروں کا پانی، تانبے کے تہ خاک پائپوں سے سر پھوڑتا اور آہیں بھرتا محسوس ہوتا ہے، عظمت خلافت، کمال فن، عروج علم، عدل منذر، نغمات زریاب، ان پتھروں کے نیچے کیا کیا دفن نہیں؟ وہ کس کس کو روئیں کس کس کا ماتم کریں؟

قہقہوں بھری بسوں سے درجنوں طلباء برآمد ہوئے، شوخ و شریر تنگ تنگ بھڑکیلے لباس، آنکھوں میں چمک چہروں پر خوشی، ہاتھوں میں کاپیاں، ٹکٹ کی کھڑکی بند رہی پھاٹک کھل گیا۔ یہ پھاٹک قہقہوں سے کھلتا ہے؟ میرے قہقہے مجھ سے اندلس کی بین الاقوامی سرحد پر جُدا ہو گئے تھے پھاٹک کیسے کھلتا؟ یہ اندلس کے مستقبل کے وارث ہیں۔ میں اس کے ماضی کا زائر اس شہر خاموش

کے بانیوں اور باسیوں کی عظمتوں اور ذلتوں کا وارث۔ ٹکٹ خرید کر قہقہوں کے پیچھے چلنا شروع کیا تو محرابوں نے راستہ روک لیا۔

استاد بول رہا تھا شاگرد قہقہے لگا رہے تھے۔ درمیان میں وہ ایک دو باتیں نوٹ بکوں میں بھی محفوظ کر لیتے۔ قہقہوں کی اپنی الگ زبان ہوتی ہے۔ وہ مدینۃ الزہرا کے عروج وزوال پر قہقہے لگا رہے تھے۔ اندھے غاروں، شکستہ دیواروں پر پھول ہی پھول تھے۔ قہقہے دیواروں اور محرابوں سے ٹکرا کر جنگل میں روپوش ہو جاتے، کبھی میں پیچھے رہ گیا کبھی وہ کسی کھنڈر کو زیادہ غور سے دیکھتے رہ گئے۔ میلوں تک پھیلے آثار میں ہر کہیں جانے کی اجازت نہیں، زائرین کے لئے تھوڑا سا حصّہ مخصوص ہے۔ کانٹے دار تار نا قابل زائرین حصّہ کی حفاظت کرتی ہے۔ مسلمان مدینۃ الزہرا نہ بچا سکے عیسائی اس کے کھنڈروں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ یہ ان کی بھی تاریخ ہے ان کے بچے استادوں کی رہنمائی میں تاریخ کے اس باب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ سونے کی کان ہے حفاظت لازم ہے۔ کھدائی اب بھی جاری ہے محکمہ آثار قدیمہ کے ماہرین جو کچھ بھی ملے چوم کر رکھتے ہیں۔ اینٹ، پتھر، پرانے انداز میں جوڑ جوڑ قدیم طرز کی نئی محرابیں، دیواریں اور دروازے بنا رہے ہیں۔ پلستر کے ٹکڑے جوڑ نقش ونگار کا اصل رنگ واپس لانے میں مصروف ہیں۔

قصرِ خلافت، دربار خلافت، وزیر اعظم، سپہ سالار اور امراء کے محل سب سے اونچی سطح پر تھے۔ بارش اور طوفان میں سرامورینا سے بہہ آنے والی مٹی صدیوں ان آثار میں جمتی رہی اس مٹی نے بہت سی دیواریں، محرابیں اور عمارتوں کی بنیادیں لوٹنے والوں سے بچالیں، اب ماہرین بڑی احتیاط سے یہ مٹی صاف کر رہے ہیں۔ ٹکڑا ٹکڑا اور ٹھیکری ٹھیکری جوڑ کر مدینۃ الزہرا کو سمجھنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ پلان کیا تھا؟ نقشہ کیسا تھا؟ سڑکیں کتنی تھیں؟ آرائش کیسی تھی؟ اس کے باسی کیسے تھے؟ وہ جو جہانگیر و جہاندار و بان و جہاں آراء ہوئے اور پھر خاک در خاک ہو گئے ان کے شہر خاک ہوئے بستیاں اُجڑ گئیں زمین و آسمان کی وسعتیں ان پر تنگ ہو گئیں، بادل جن کی آہ وفغاں اور فلک کے درمیان حائل ہو گئے تھے۔ وہ جنہوں نے پتھروں سے پیار کیا وہ جن کی نشانیاں صرف پتھر رہ گئے ہیں۔

میں دیکھنا چاہتا تھا وہ محل کیسے ہوتے ہیں جن میں غیرت وحمیت دم توڑ جاتی ہیں وہ گلیاں

اور بازار کیسے ہوتے ہیں جن کے اینٹ پتھر کے نیچے سازشوں کے سپولئے پرورش پاتے ہیں وہ شہر کیسے ہوتے ہیں جن کے محافظ انہیں اپنے ہاتھ سے آگ لگاتے ہیں۔

شہر وسلطنت کی محافظ فوج نے مدینۃ الزہرا لوٹا، اہل مدینہ کو قتل کیا، عورتیں، بچے اور بوڑھے جامع مدینہ میں جا چھپے ان کے خون سے وہ محراب ومنبر سُرخ ہو گئے جن سے قاضی منذر نے خبر دار کیا تھا۔ ''مدینۃ الزہرا مٹنے والا نہ ہوتا تو کتنا حسین ہوتا''۔ مدینۃ الزہرا اور اس کا حسن مٹا تو مسجد بھی باقی نہ رہی الناصر کے وارثوں کی مانند منذر کے وارث بھی اپنا فرض بھول گئے؟ میں مسجد کے آثار کے گرد کانٹے دار تار لگا دی گئی تھی۔ سیاحوں کے لئے متعین راستہ سے آثار جامع بہت دور ہیں۔ اس بستی میں سب سے پہلے مسجد مکمل ہوئی تھی۔ شہر چالیس سال میں مکمل ہوا، مسجد پینتالیس روز میں مکمل ہوئی۔ طارق بن زیاد کے ہم نسل موسیٰ بن نصیر کے ہم نسل کے خلاف میدان میں نکلے تو محل ومسجد ایک ہی روز میں مِٹ گئے۔

کوئی قوم کبھی غربت میں نہیں مٹی جو قوم بھی تباہ ہوئی امارت میں ہوئی۔ فتنی ہمیشہ اوپر سے شروع ہوا نیچے والے فتنہ گروں کے مفادات کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ گروہوں اور قبیلوں کے اوپر والوں کے مفادات مجروح ہوں تو وہ پورے گروہ اور قبیلہ کے مفاد کو خطرہ ہے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ علاقائی اور نسلی مفادات کے تحفظ کے نام پر ذاتی مفاد کے تحفظ اور حصول کی اس لڑائی میں نیچے والے ہمیشہ سے دھوکہ میں آتے رہے ہیں تباہی اور بربادی کی راہ پر چلنے لگتے ہیں۔

فوج کی افسر شاہی بربر، سول افسر شاہی عرب، دونوں شاہیوں نے بربر اور عرب کے مفاد کی جنگ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے شروع کی سول حکام نے عرب عوام کے نسلی تعصّب کو ہوا دی۔ فوج میں بربر سپاہ کو ''بیدار'' کیا گیا پھر وہ اس جوانمردی سے ایک دوسرے سے لڑے کہ دشمن سے بھی نہ لڑے ہوں گے۔ اس لڑائی میں ایسے مٹے کہ خدا دشمن کو بھی اس طرح نہ مٹائے، نہ عرب بچا نہ بربر، فوج رہی نہ سول شاہی، نہ خلافت رہی نہ سلطنت، مسجد بچی نہ منبر، یہی پتھروں کے ڈھیر، اینٹ کی شکستہ دیواریں ان کی نشانیاں ہیں۔

''قاضی منذر نے خلیفہ کو اس مسجد کے منبر سے ڈانٹا تھا'' ہسپانوی ترجمان ایک امریکی جوڑے کو مدینۃ الزہرا کے کھنڈرات کی سیر کرا رہا تھا ''یہ تھا ماربل ہاؤس جب خلیفہ کی فوجیں پریڈ

کرتیں تو وہ وزیراعظم اور کمانڈر کے ساتھ یہاں بیٹھ کر پریڈ دیکھتا تھا۔ایک روز خلیفہ الحکم پریڈ دیکھ رہا تھا میدان میں شاہسوار جنگی مہارت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ایک نوجوان کا گھوڑا جدھر جاتا سب نگاہیں اس طرف لگ جاتیں۔''یہ کون ہے؟''''ایک بربر شاہسوار'' کمانڈر نے خلیفہ کو بتایا۔ شاہسوار کو فوری طور پر خلیفہ کے حضور پیش کیا گیا۔خلیفہ نے اس کے گھوڑے کا ساز سپرد آگ کروا کر اسے فوری طور پر فوج سے نکال دیا۔''اس قبیلے کے سب افراد کو فوج سے نکال دیا جائے'' خلیفہ نے حکم دیا۔''ہم نے خواب دیکھا ہے کہ اس جیسے شاہسوار ہماری سلطنت، ملک اور تہذیب کو برباد کریں گے''۔ان سب کو فوج سے نکال دیا گیا۔پھر اسی قبیلے کے افراد نے خلیفہ کا خواب اور قاضی منذر کی پیشگوئی پوری کی۔

مدینۃ الزہرا کے باب القبہ پر وینس کا سنگ مرمر کا خوبصورت مجسمہ ہوتا تھا۔شہر کی تباہی کے سینکڑے سال بعد تک یہ مجسمہ وہاں موجود رہا۔لوگ اسے کھنڈرات کا پہریدار سمجھتے تھے ایک روز سلطان ابو یعقوب اِدھر سے گزرے تو اس شہر کی عظمت رفتہ پر دل گرفتہ ہوئے۔انہوں نے مجسمہ وہاں سے ہٹوا دیا۔لوگوں کو وہم تھا کہ جس روز وینس کا مجسمہ باب القبہ پر سے اتار دیا گیا۔ اندلس میں مسلمانوں کا زوال شروع ہو جائے گا یہ وہم بھی پورا ہو گیا۔ہسپانوی لڑکے لڑکیاں اپنی تاریخ سمیت آگے نکل گئے تھے میں اپنی تاریخ سمیت پیچھے رہ گیا۔باب القبہ سے مدینۃ الزہرا کے گورنر کی رہائش گاہ تک باغ پھیلا تھا۔اس سے آگے دربار خلافت تک صرف خواص جا سکتے تھے۔گورنر ان کے ہمراہ ہوتا۔دارالملک اور اہم ترین ملاقاتیوں کی انتظارگاہ دارالرجام کے درمیان وسیع حوض تھا ان عظیم الشان عمارتوں کے عکس اس حوض کی سطح پر تیرتے تو پورا ماحول متحرک محسوس ہوتا۔

نوجوان طلباء اور طالبات دارالملک کے ستون سے لپٹ لپٹ کر قہقہے لگا رہے تھے ہسپانوی ماہرین نے نقشوں کی مدد سے کھنڈرات سے برآمد ہوئے اینٹ پتھر کا بے مثال ڈھانچہ کھڑا کر دیا ہے۔اصل دارالملک کی آرائش وزیبائش کی ناقابل یقین کہانیوں کے قاری اس مقام پر سر جھکا دیتے ہیں۔

کہانیوں کے سفر میں تھک کر میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔محافظ کچھ دیر کھڑا تاڑتا رہا پھر قریب

آ گیا وہ کھڑا رہا میں کھویا رہا ماحول کی ویرانی اور اداسی میرے خون میں سرایت کر گئی تھی خالی حوض کے گرد خودرو جھاڑیاں پاس سے گزرتے سیاح کا دامن تھام لیتی ہیں۔نوکیلے بازو اس کے سامنے پھیلا دیتی ہیں۔صدیوں کا پیاسا چشم حیراں کی مانند حوض پھیلنا شروع ہو جاتا ہے اور ٹوٹے پھوٹے شہر خلافت کے در و دیوار اس چشم حیراں میں ڈوب جاتے ہیں۔میں نے دامن چھڑانا چاہا تو پھولوں سے لدی شاخ ٹوٹ کر حوض میں گر گئی جیسے خوبصورت خوشبودار کارناموں کے پھولوں سے لدی کوئی قوم نخلِ عروج سے کٹ کر ذلت کے کنوئیں میں جا گرے۔کھنڈرات میں آوارہ ہوا کی سسکیاں نوجوانوں کے قہقہوں میں ڈوب گئیں۔

ہسپانوی ترجمان نے ایک اور قصہ شروع کر دیا۔''تخت سلیمان کی راہ میں ایک شفاف چبوترہ پڑتا تھا حسن وعقل کی ملکہ صباء دھوکہ کھا گئیں، اس سے گزرتے ہوئے شفاف سطح کو پانی سمجھ کر زمین سے چھوتا اپنا چوغا اوپر اٹھا لیا۔چبوترے پر پاؤں رکھا تو بہت پریشان ہوئیں، اس جگہ بھی اسی قسم کا ایک شفاف چبوترہ تھا جس سے آگے تین بڑے ہال تھے''۔اس نے اینٹ پتھر کے بڑے بڑے ڈھیروں کی طرف اشارہ کیا۔''ان تینوں کا رُخ قبلہ کی طرف تھا، ان تک آنے والے راستوں کے دونوں طرف دیواروں کے ساتھ سنہری وردیوں میں محافظ قطار در قطار کھڑے ہوتے تھے۔''

درمیانی ہال میں تختِ خلافت تھا۔مجالس الغربی کی کھدائی مکمل ہو چکی ہے۔ماہرین آثار قدیمہ اسے ایمبیسیڈرز روم کہتے ہیں۔زوال قرطبہ کے بعد جس جگہ بھی مسلمانوں نے محل بنایا اس کے ساتھ اسی نمونے پر ایمبیسڈرز روم تعمیر کیا۔خلیفہ خود کبھی کبھار ہی اس ہال میں بیٹھتا۔یہ اہم ترین ملاقاتیوں کی انتظارگاہ ہوتا تھا۔خلیفہ کی نشست گاہ پر تکیے پڑے رہتے۔ملاقاتیوں پر لازم تھا کہ وہ اس خالی نشست گاہ کے سامنے بھی اسی انداز میں آداب بجا لائیں جس طرح تخت نشین خلیفہ کے سامنے آداب بجالانا لازم ہوتا تھا۔امریکی مائی نے جھک کر فرشی سلام کیا اس کے بابا جی اور ترجمان نے مشترکہ قہقہہ لگایا۔

تخت گاہ خلافت کا ملبہ اس سے آگے ہے۔مدینۃ الزہرا کی سب سے حسین عمارت سنہری ہال، جس کی مہاگنی اور ہاتھی دانت کی محرابیں سونے اور قیمتی پتھروں سے مزین تھیں۔سنگ یشپ

کی شفاف دیواروں کے آر پار دکھائی دیتا تھا۔ گنبد نما چھت سونے چاندی کی اینٹیں سنہری پتھروں سے جوڑ کر بنائی تھی۔ تخت گاہ کے روبرو نشیب میں سنگِ مرمر کا حوض پارہ سے بھرا رہتا تھا اس کی سطح سے منعکس ہو کر شعاعیں تخت گاہ پر پڑتیں تو ساری عمارت گھومتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

خلیفہ الحکم بیشتر وقت مجالس شرقی میں چار لاکھ قلمی نسخوں والی لائبریری میں گزارتے تھے اور لائبریری کی دیکھ بھال خلیفہ کا بھائی کرتا تھا۔

فراہمیٔ آب اور سیوریج کا نظام شاید سب سے پہلے اسی شہر میں قائم ہوا۔ جبل قرطبہ کے دامن میں شفاف پانی کے چشموں سے شہر کو سیراب کرنے کے لئے پچیس کلومیٹر مسقف نہر بنائی گئی۔ پہاڑوں کو چھید کر اور ندیوں کو باندھ کر بنائی گئی نہر سطح زمین سے سوا میٹر بلند تھی۔ جو پانی شہر کی ضروریات سے بچ گیا وہ جست کے زمین دوز پائپوں میں مقید کر کے قرطبہ روانہ کر دیا گیا تھا، ان پائپوں کے باقیات اب بھی تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ زمین کے سینہ میں ملبہ کے ڈھیروں میں، قرطبہ کے پہاڑوں میں اور اندلس کے عجائب گھروں میں، اس شہر کے نشانات کئی جگہ محفوظ ہیں لیکن اس شہر کو آباد اور برباد کرنے والی قوم کا اس ملک میں کوئی ایک بھی فرد موجود نہیں۔ صدیوں تک حکمرانی اور برادر کشی کرنے والوں کی کسی ایک قبر کا بھی کوئی نشان نہیں۔

''یہ در و بام یہ ساونت عرب کا پرتو
ہے ستونوں کی نفاست سے عیاں سنگینی
اونچی محرابوں کے گھیرے میں
کشادہ ایوان
جس نے بے باک ارادوں سے
بلندی چھینی
اب وہ رُوحیں نہیں مٹی کے
گھروندوں کی اسیر
جن سے یہ ساحل دریا یہ زمین گل خیز
ہر ترقی کی شرف گاہ تھی تہذیب کا گہوارہ تھی

آج ٹیلوں کی کھلی گود میں یہ دیواریں
اپنے معدوم در و بام پہ ہیں نوحہ کناں
اپنے معدوم شرف کی ہیں حدیث خاموش''

امریکی سیّاح اور ہسپانوی ترجمان وسعت کھنڈرات میں روپوش ہو گئے۔ شکستہ دیواروں کے خوفزدہ سائے نشیبوں اور غاروں میں لنگر انداز ہونے لگے۔ کھنڈرات کے نگران سیٹیاں بجا رہے تھے۔ سوئے زوال رواں دواں سُورج کی سنہری دھوپ سیاہ پتھروں پر ایسے بہہ رہی جیسے سیاہ حبشی کے سر پر شہد انڈیل دیا جائے۔ دُور تک خودرو جنگل تھا۔ کہیں کھنڈرات جنگل پر غالب تھے کہیں جنگل کا غلبہ تھا۔ فرلانگوں دور مدینۃ الزہرا کے زمینی حصہ میں اب بھی گائے گھوڑوں کے ریوڑ چر رہے تھے میں نے دور تک پھیلے کھنڈرات میں سرگرداں لاکھوں مغموم روحوں کو سلام کیا۔ خلیفہ عبدالرحمان الناصر باللہ کے شوق تعمیر، اس کی قوم کے حسن تخریب کی داد دیتا حیران و پشیمان آہستہ آہستہ واپس چل دیا۔ رنگ رنگ پھولوں نے سر ہلا ہلا کر کچھ کہا۔ بوڑھے محافظ نے غصہ سے میری طرف دیکھا اور بھاری پھاٹک کو دھکیلنا شروع کر دیا۔

مدینۃ الزہرا کی تباہی کے صدیوں بعد ایک عرب شاعر اس طرف سے گزرا تو اس نے کھنڈرات سے پوچھا۔ ''تمہارے باسی جو میرے قدردان تھے کہاں گئے؟'' تو کھنڈرات نے جواب دیا تھا۔ ''وہ تھوڑی دیر یہاں رکے اور پھر کہیں چلے گئے کہاں گئے کچھ معلوم نہیں''۔

میں ایک دفعہ پھر کھنڈرات پر تنہا رہ گیا تھا۔ جبل عروس پر گھنے درختوں کی رنگت گہری ہو گئی تھی اجنبی دیس کی ویران سڑک پر دُور تک کوئی نہ تھا۔ دل چاہتا تھا اوپر کی طرف سڑک پر چلتا جاؤں۔ اس جگہ تک جہاں سڑک بھی نہیں جا سکتی دیواروں کے سائے ہم رنگ زمین سے بغلگیر ہو کر نابود ہو گئے تھے۔ اشرف نے مجھے خبردار کیا تھا۔ مگر مجھے محسوس ہوتا تھا اپنے ہی گھر میں ہوں خطرہ کیسا؟ میں ایک بار پھر پتھر کے سر پر پاؤں رکھ کر رنگ بدلتے کھنڈرات کو دیکھنے لگا۔ محرابوں کے بازو اسی اپنائیت سے میری طرف پھیلے تھے۔ عجائب گھر اور ٹکٹ کھڑکی بند ہو گئی تھی۔ قرطبہ کی سڑک پر ایک گاڑی نمودار ہوئی ہو گا کوئی خانقاہ کا زائر۔ کھنڈرات کے زائر میری طرح اوقات کار سے بے خبر تو نہیں ہو سکتے۔ پھر اس اندھیرے میں ادھر کون آئے گا۔ دل بھی چاہتا تھا اب کوئی نہ

آئے۔دل اور کھنڈرات اکیلے رہ جائیں۔گاڑی میری طرف آ رہی تھی پھر وہ مجھ سے آگے نکل گئی اور بند پھاٹک کے سامنے زور زور سے ہارن بجانا شروع کر دیا۔درِ محافظ پھر بھی وا نہ ہوا تو گاڑی کا دروازہ کھل گیا۔نوجوان خاتون وحضرت نے میری تقلید میں سنگِ گراں پر پاؤں رکھا۔ کھنڈرات پر تعجب کی نگاہ ڈالی اور بے نیازی سے گاڑی موڑ لی۔نہیں تو نہ سہی یہ مرقد شہر ہی تو ہے۔ نوجوان نے میرے قریب گاڑی روکی شاید انہیں بھی خبردار کیا گیا تھا کہ سپین میں اکیلے گھومنا خطرناک ہے اس دیس میں ہی نہیں اپنی شکل سے میں اس پورے براعظم میں اکیلا تھا۔نوجوان نے پچھلی نشست پر تشریف فرما سامان سمیٹا اور ''پلیز'' کہہ کر گاڑی کا دروازہ اپنے ہاتھ سے بند کر دیا۔میاں بیوی نے میری دلجوئی کے لئے انگریزی بولنا شروع کیا لیکن ان کی انگریزی بھی مجھ پر کوئی اثر نہ کر سکی میرا جسم ان کی گاڑی میں تھا اور روح مدینتہ الزہرا کے کھنڈرات میں رہ گئی تھی ہوا میں ہلکی ہلکی سسکیاں تھیں۔جبل عروس کی بلندیوں کی طرف سے نغموں کی آواز آ رہی تھی۔یہ جوڑا بھی سورج اور ساحل کی تلاش میں پیرس سے سپین آیا تھا۔مدینتہ الزہرا کے کھنڈرات ان کی منزل نہیں تھے بس ذرا دیکھنے آئے تھے کہ قدیم پیرس کیسا ہوتا ہوگا۔مجھے ان پر رشک آنے لگا۔کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کا ان پتھروں سے کوئی رشتہ نہیں۔

''آپ کو کہاں جانا ہے؟ خاتون نے اپنی گود میں پھیلائے نقشہ کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا کس مقام کا نام لوں؟ مجھے تو ایک ہی مقام کا نام ازبر تھا۔''دریائے کبیر کے پل پر اتار دیں''۔

خاتون نے ڈرائیور کو راستہ سمجھایا قرطبہ کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے ہم ایک بار پھر جامع قرطبہ کے قریب آ گئے۔میں نہیں چاہتا تھا کہ مسجد میں سوار جاؤں۔پل سے پہلے گاڑی چھوڑ ان کا شکریہ ادا کیا وہ ملاگہ کی طرف چل دیئے میں آہستہ آہستہ مسجد کی طرف چلنے لگا۔دریائے کبیر پر سیاہی اُتر آئی تھی۔القصر کے دروازے بند ہو چکے تھے اور میں شام کے اندھیرے میں گم گشتہ متاع تلاش کرنے جا رہا تھا۔

آبِ روانِ کبیر

تنگ اور ٹیڑھی میڑھی گلی ابنِ رشد میں گول پتھروں کے فرش پر چلتے ہوئے میں قدیم قرطبہ میں پہنچ گیا۔المنصور اور ابنِ رشد کے قرطبہ میں گلی کے دو طرف حویلیوں کی سربلند دیواریں ان کے درمیان تہہ در تہہ خاموشی، معلوم ہوتا ابھی ابنِ رشد اس راہ سے گزرا ہے۔بغل میں قرآن فکر میں فلسفہ، دستار کی پریشاں گرہیں لئے، سارا محلہ اس کے احترام میں دم سادھ گیا ہے۔

قرطبہ والے گلی کو گلی ہی کہتے ہیں مگر ابنِ رشد کو ایوارو ز پڑھتے ہیں۔مَیں نے ایوارو ز کے نیچے ابنِ رشد لکھ دیا اور ابن رشد کے قدم آشنا پتھروں پر چلنے لگا۔ایک موڑ پر سیاحوں کی ٹولی راستہ کاٹ کر نکل گئی۔گائیڈ انہیں المنصور نا بود محل دکھانے ہانکے لئے جا رہا تھا جو اسی گلی کے موڑ پر ہوتا تھا یہ ''قرطبہ کی سب سے خاموش گلی ہے اتنی خاموش کہ آپ ابن رشد کے پاؤں کی آہٹ بھی سُن سکتے ہیں''۔اس نے داستان کی کچی لسی میں تخیل کا مزید پانی ڈالتے ہوئے کہا۔

''اور المنصور کی سسکیاں بھی'' اس کے گاہکوں میں سے ایک قہقہہ اونچی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ گیا اور مقید پاتھیوز میں پھولوں نے سر جھٹک کر اظہارِ ناپسندیدگی کیا۔ہر منزل اور ہر مقام کے اپنے آداب سے ہوتے ہیں۔فکر و گریہ کے مقام پر قہقہہ شرک ہے۔مَیں نے تو سنت بار تولمی کی مقبوضہ مسجد کے سنگ و آہن سے لپٹ کر اعلانِ توحید کیا تھا۔منزلِ گریہ میں شرکِ قہقہہ میں کیونکر شرکت کرتا۔بغل میں قرآن نہ گلے میں دستارِ پریشان فکر و فن کے عروج و زوال کی گرہوں کا اسیر تھا میں سر جھکائے خاموش چلتا رہا۔

اک قوم نے اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ ترتیب دے کر اتنی بلند دیواریں اٹھائیں ان پر اتنا موٹا

پلستر چڑھایا کہ صدیوں بعد بھی کہیں کوئی خراش نہیں۔لمحات محفوظ،قوم نابود،ثباتِ فکرزوال زندگی، وہ اس زمین پر پیام حیات بن کر آئے۔ یہاں سے نشانِ عبرت بن کر گئے۔عمل مشرف بہ مقصد چشمہ آبِ حیات اورعروج محروم مقصد چشمۂ آبِ شور۔آہنی جالیوں کے پیچھے سے شاخِ گل نے مسکرا کر گلی کے خاتمہ کا اعلان کیا۔گُل وزرِگُل سے پرے سالخوردہ فوارہ کا الاپ کررہا تھا۔چوک ویران تھا۔مَیں ایک کھلی گلی میں چلنے لگا۔خیال تھا باب توبہ اسی سمت ہوگا۔صحنِ اشجار میں دو برقہ پوش خواتین حیران کھڑی تھیں۔میرے قدم رک گئے۔ایک دفعہ پھر تخیل کے قرطبہ میں تو نہیں پہنچ گیا؟صحن اور برآمدے میں نہ کوئی فقیہہ نہ طالبِ فکر و دانش سکول کے بچے زرق برق لباس پہنے چلے آرہے تھے۔ جامع کے درِ داخلہ سے ایک تیز رو باریش شخص برآمد ہُوا۔ اپنے اردگرد اور سیاحوں کے گرداگرد کے خواتین وحضرات کو اس تیز رفتاری سے پمفلٹ تھماتا آرہا تھا جیسے کوئی خوف تعاقب میں ہو۔برقعہ پوش خواتین فیشنی ریش والے سفید پوش کے ہمراہ صحن جامع سے نکل گئیں۔سپین کے قادیانی مشن کا سربراہ دیدارِ جامع کے ساتھ ساتھ ڈیوٹی بھی ادا کررہا تھا۔

آج مسجد میں صلیب بردار اُستانیوں کی تعداد خلافِ معمول تھی۔صبح بیدار سیاحوں کی ٹولیاں نخلستانِ قرطبہ میں گھوم پھر رہی تھیں۔ایک بزرگ سیرت جوڑا میرے تعاقب میں ہولیا۔ جامع کے ایک ویران کونے میں فکر کے شُتر بے مہار کا گھٹنا باندھنے لگا تو بزرگ صاحب بھی رُک گئے۔تبادلہ تعارف شروع کردیا۔''ہم آسٹریا سے آئے ہیں''۔''مَیں پاکستان سے آیا ہوں'' YOU BUILT A VERY GOOD MOSQUE بزرگ نے مجھے خوش کرنے کے لئے کہا یا دُکھ دینے کے لئے کچھ سمجھ نا آیا۔اس کی مائی نے بھی سر ہلا کر اپنے بزرگ کی تائید کی۔پھر وہ دونوں میرا مُنہ تکنے لگے۔دیوار سے شکریہ کی آس؟ مایوسی میں بڑے میاں نے کیمرے کی آنکھ پر آنکھ رکھ دی''میں آپ کی تصویر بنانا چاہتا ہوں''—''معاف کرنا آپ کو غلطی ہوئی ہے۔ مَیں نے ہرگز یہ مسجد نہیں بنوائی۔ان میں دیکھو شاید کوئی دعویدار مل جائے''۔مَیں نے عروج و زوالِ جامع کے سٹیج ڈرامہ کے کرداروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مائی پھر مسکرانے کی کوشش میں مصروف ہوگئی۔''وہ تو ڈرامہ کررہے ہیں''۔

تو آپ کے خیال میں مَیں کیا کررہا ہوں؟''۔

''اگر آپ ایڈریس لکھ دیں تو میں آپ کی تصویر پاکستان بھیج دوں گا''۔

''شکریہ''

وہ مشترکہ مسکراہٹ پھینک کر دوسری طرف چل دیئے۔

جامع قرطبہ مَیں نے بنائی ہے؟ان کا مطلب یہ تو نہ تھا کہ''شرم کرو،مسجد اتنی خوبصورت بنائی اپنے اعمال و کردار کی ذرہ بھر اصلاح نہ کر سکے''۔محراب کے سامنے باجماعت نقلِ صلوٰۃ اتاری جارہی تھی۔ بلا امام۔ سب بچے ایک ہی قطار میں قیام و سجود کے مراحل میں ملے۔ خوبصورت زرق برق عربی لباس میں نقل را عقل باید۔

تالیوں کی گونج پر مڑ کر دیکھا تو چرچ کے سٹیج پر منظرِ زوال آخری مرحلہ میں تھا۔فرڈی ننڈ جامع قرطبہ میں داخل ہورہا تھا۔پادریوں اور درباریوں کے جلوس کے ساتھ تالیاں دیواروں اور ستونوں کی محرابوں سے ٹکرا ٹکرا کر خوفناک ہوتی جارہی تھیں۔دیدہ وگوش منزل امتحان میں ہمّت ہارنے لگے تو واپس چل دیا۔منتظم سے نمائش تصاویر کے بارے میں پوچھا تو وہ بھی مسکرا دیا۔''وہ تو صرف ایک روز کے لئے تھی''۔

''بارہ صدیوں کی کہانی صرف ایک دن میں ختم کردی؟''

''وہ تو ابھی جاری ہے۔وہ ڈرامہ دیکھ لیں اس میں پُوری کہانی مل جائے گی''۔

''کہانی تو مجھے معلوم ہے مَیں صرف تصاویر دیکھنا چاہتا ہوں''۔

''سوری وہ تو ممکن نہیں''۔

باہر آیا تو نہ کہیں دھوپ تھی نہ سایہ۔ ہر طرف اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ہوا چل رہی تھی،پتے ساکت تھے۔سورج چمک رہا تھا،دھوپ غائب تھی۔کہانی موجود تھی مسجد کہیں نظر نہیں آئی زوال کی سیاہی میں عروج کی چمک بھی گم ہوجاتی ہے۔

جامع قرطبہ اس ملک میں عروج و زوالِ مسلم کی چشم دید گواہ ہے۔اسی مسجد کے منبر سے قیامِ خلافت کا اعلان ہوا۔اسی نخلستان کے ایک اندھیرے کونے میں علماء وامراء ملت نے سلطنت مسلمہ کے سینکڑوں شہر اور قلعے عیسائیوں کی نذر کرنے پر اتفاق کیا کہ وہ دوسرے مسلمانوں کی امداد سے باز رہیں۔جامع قرطبہ ہی میں اہلِ قرطبہ ڈرامہ خلافت کھیلتے رہے اور پھر یہیں پر اس ڈرامے

کا آخری سین ختم ہوا۔علماء وشرفاء نے خاتمہ خلافت کا فیصلہ کیا۔یہیں سے زوال کا ڈرامہ شروع ہوا تھا۔خلافت گئی تو سلطنت ٹکڑوں میں بٹ گئی۔چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایک ایک کر کے مٹتی رہیں اور پھر سب کچھ مٹ گیا۔اہلِ قرطبہ اور جامع قرطبہ کے فیصلے ان کے اور ان کی سلطنت کے مکمل خاتمہ کا سبب بنے۔اتنی حسین مسجد اتنے بدصورت فیصلے؟ میں باب توبہ کی تلاش میں چلا اور کنارے وادی الکبیر جا نکلا۔ارادہ تھا باب القنطرہ میں گھوم پھر کر آلِ عمارؓ بن یاسر کے مساکن کے درو دیوار کی زیارت کروں گا۔آل عمار بن یاسر کا محلہ جس نے فقیہوں اور جرنیلوں کو جنم دیا تھا۔علم و جرأت کے صدیوں جس نے قدم چومے تھے۔قدم اس کی خاک نہ چُوم سکے۔خواہشِ دیدار بحر خجالت میں بہہ گئی۔بے نیاز خاموش، وادی الکبیر خمیدہ محرابوں کے سروں پر مزین صدیوں پُرانے طویل پُل کے نیچے سے ایسے بہہ رہا تھا جیسے بہت ہی تھک چکا ہو۔تھکا ماندہ مسافر تھکا تھکا سا وادی الکبیر پُل پر قدم رکھا تو محسوس ہُوا وہ لرزنے لگا ہے۔

رومن بنیادیں عربی محرابیں وادی الکبیر کا پُل جس کی تعمیرِ نو پر عرب صدیوں فخر کرتے رہے۔ہشام اوّل نے پُل کی مرمّت کرائی تو اہل قرطبہ نے کہا اس پار شکار کھیلنے کے لئے اتنی رقم خرچ کی گئی ہے ہشام نے سُنا تو زندگی بھر محل سے ملحق وادی الکبیر کے پُل پر قدم نہ رکھنے کا عہد کیا۔ زندگی بھر اس عہد پر قائم رہا۔یہ پُل صدیوں سے فنِ تعمیر کے عشاق کا قبلہ چلا آتا ہے وہ عظمت و جلال اور یہ حالتِ زار؟ اسلامی دور میں پُل کے پار بھی دو آبادیاں تھیں۔ربضِ منیۃ العجب اور ربضِ شقندہ، عالم فقیہہ اور ادیب اسماعیل بن محمد شقندی کا شقندہ وہی شقندہ جہاں اہلِ قرطبہ نے ایک دوسرے کو پتھریوں سے کاٹ کاٹ اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دیا تھا۔یمانیہ اور نصریہ فرقوں کی اس لڑائی میں قرطبہ کے قصائیوں نے مسلمانوں کو بھیڑ بکریوں کی مانند ذبح کیا تھا۔عالم فقیہہ ادیب قصاب اور بھیڑ بکریاں ریلنگ ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔پاس سے گزرتی خواتین نے اُونچے سُروں میں تبادلہ خیالات کر کے یاد دلایا کہ منزل کٹھن ہے۔وقت کم ہے۔غیر مسلم اور مسلم تاریخ کی ہزاروں ان کہی داستانیں اس پُل کے تن سنگ وخشت پر کندہ ہیں۔چشم بینا کے لئے۔ اہلِ گوش وہوش لہروں کی آواز میں پوشیدہ نغمہ آہ وزاری بھی سُن سکتے ہیں۔میرے لئے پل آئینہ ایام تھا۔سٹیفن کے لئے آئینہ حسن''قرطبہ کے فلکِ نیلی فام کے نظارہ کے لئے پل سب سے

اچھی جگہ ہے۔نہ کوئی برج تارِ نگاہ توڑتا ہے نہ دیواریں ردائے فلک کو تار تار کر سکتی ہیں۔پل کے دونوں طرف دور تلک قرطبہ کا بے داغ نیلا فلک پھیلا ہوتا ہے''۔

مَیں فلک کے نظارہ کی بجائے لہریں گن رہا تھا۔جن کا تن بدن نیلا پڑ گیا تھا۔دائیں طرف نیلی چادر میں جگہ جگہ سرسبز پیوند تھے۔چھوٹے چھوٹے ٹاپو دریا میں بکھرے ہوئے تھے۔ پتھر کے خوفناک سیاہ مجسمے پانی سے سر نکال نکال کر گھورنے لگے سیلابوں میں بہہ گئے۔بندوں کی دیواریں جواب بھی وادیٔ الکبیر نے سینے سے لگا رکھی ہیں، ابھی تک آغوش میں چھپا رکھی ہیں۔دُور دُور تک پن چکیوں کے اعضاء نظر آتے ہیں محافظ قرطبہ سنت رافیل نے کھنگورا مار کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔''ماضی سے نکل کر حال میں آ جاؤ''۔جامع قرطبہ کے مینار پر محوِ پرواز سنت رافیل کی نسبت پل کا پہریدار سنت رافیل کافی نوعمر اور صحتمند ہے۔صدیوں سے فضا میں معلق رہ کر قرطبہ اور اہلِ قرطبہ کی حفاظت کے مشکل مشن کی وجہ سے اُس کی صحت کا متاثر ہونا لازمی تھا۔یہاں وہ مٹی اور پانی سے قریب ہے۔عدم تحفظ کی شکار خواتین قرطبہ اپنے نرم ونازک ہاتھوں سے ہر روز اس کی تیل مالش کرتی ہیں۔سنت جی کے مسل بہت اچھے بنے ہُوئے ہیں اگر میری طرح اس کے مسل بھی کمزور ہوتے تو صدیوں پُل کی دیوار پر کھڑے ہو کر کیسے پہرہ دیتا؟ جیسے جیسے پُل پر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔پُل کی لمبائی بڑھتی جا رہی تھی۔اسی رفتار سے چلتا رہا تو آخری سرے پر پہنچ بھی سکوں گا؟ میں تیز چلنے لگا۔سنت رافیل مسکرائے شاید کہہ رہے تھے۔''تمہارے بڑے بھی تیز قدم ہوتے تھے''۔

''مگر اس وقت آپ کہیں تھے؟'' دل میں آیا پوچھ لُوں پھر خیال آیا پتھروں سے باتیں کرنا شرک ہے۔قدم اور بھی تیز ہو گئے۔سنت رافیل نے اپنے گلے سے سُرخ رومال اتار کر فضا میں اچھال دیا۔وادی الکبیر کا پانی خون ہو گیا پُل کی محرابیں سونے میں بدل گئیں۔

پُل کے آخری سرے پر ایک چھوٹا سا خوبصورت قلعہ نما برج ہے جس کے درمیان سے گزر کر پُل پر آتے ہیں۔عرب دور میں یہ قلعہ چیک پوسٹ تھی۔اس وقت قلعہ میں متعین عملہ پُل کی حفاظت کرتا تھا۔اب اکیلے سنت صاحب ہی صدیوں سے یہ ڈیوٹی دے رہے ہیں۔قلعہ کے گرد پختہ نہر ہوتی تھی۔وادی الکبیر کا پانی قلعہ کی دیواروں کے گرد نصف چکر گھوم کر دریا میں واپس آ جاتا

تھا۔قلعہ کے پاس چھوٹے چھوٹے بچے کھیل رہے تھے۔خستہ حال۔مَیں دریا کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ سیاح پُل اور قلعہ دیکھنے اکثر آتے ہیں مگر بچوں کی حیرانی سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے زیادہ سیاح نہیں دیکھے۔یہ بھی ممکن ہے انہوں نے مجھ جیسے سیاح نہ دیکھے ہوں۔ پیچھے ایک تہذیب تھی۔ سامنے سطح آب کے نیچے اس تہذیب کے آثار پوشیدہ تھے۔دریا سے پار دُور تک اسی تہذیب کے نشانات دکھائی دے رہے تھے۔قومیں چلی جاتی ہیں ان کی تہذیب کے باقیات پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بعد میں آنے والے ان تہذیبی علامات سے مٹنے والوں کی بلندیٔ تعمیر اور عظمتِ تخریب کا اندازہ کرتے ہیں۔تہذیب اہل تہذیب کی نسبت پائیدار ہوتی ہے۔توانا ہو جاتی ہے۔تہذیب کی پائیداری اور توانائی اس کے خالقوں کے ذہنی اور جسمانی زوال کا سبب بنتی ہے۔تہذیب کی خوراک خالق و مالکِ تہذیب بنتے ہیں۔اس کی زندگی اُن کی موت میں اس کی عظمت ان کی ذلت میں اور اس کی بلندی ان کی پستی سے ہوتی ہے۔وادی الکبیر کا پل تہذیب ہے اس کا پہریدار سنت رافیل تہذیب ہے۔پل کا نگران بُرج تہذیب ہے۔زیر آب پوشیدہ پتھریلے بندوں کی دیواریں اور پن چکیوں کی کوٹھیاں اور پنجر تہذیب ہیں اور وادی الکبیر کے مضبوط پختہ کناروں کے درمیان رواں دواں پانی زندگی ہے۔تہذیب وثقافت کی مضبوط دیواریں اس زندگی کا رُخ متعین کرتی ہیں۔ان دیواروں کے درمیان سے گزر جانے والا پانی اُن سے جدا ہو جانے والی زندگی کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔آخر کیوں؟

بچوں کا شور بڑھ گیا تو مَیں اُٹھ کر سڑک پر چلنے لگا۔آبادی کا سینہ چیر کر گزرنے والی سڑک کے دونوں طرف کی حویلیاں اور مکان بھی اپنے باسیوں کے بچوں کے ہم حال تھے۔آبادی نے جدید دور سے ابھی اپنا رشتہ قائم نہیں کیا تھا۔صنعت، علم، آبادی، خوشحالی ایک وقت قرطبہ ہر لحاظ سے دنیا سے آگے تھا۔آج یہ ہر پہلو سے یورپ کی تیسری دنیا کے سردار سپین کے بہت سے شہروں سے بھی پیچھے ہے اور وہ آبادی اس قرطبہ سے بھی پیچھے تھی۔

سمیع سچ ہی تو نہیں کہتا تھا کہ قرطبہ کو اپنے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔سوال ایک بار پھر پیدا ہو گیا کہ گناہ افراد اور قوموں کی ملکیت ہوتے ہیں یا سنگ وخشت کی میراث؟

اہل قرطبہ کے بارے میں سُنا تھا بہت سیاح نواز ہوتے ہیں نرم دم گفتگو گرم دم اختلاط۔

اس پسماندہ بستی میں بھی کوئی کارواں سے بچھڑا عرب مزاج نہ ملا۔قرطبہ میں دوپہر کا وقفہ آرام عربوں کی نشانی دکھائی دی۔ کچھ اہل قرطبہ کے چہروں کے نقوش آنکھ اور بالوں کی سیاہی بھی عربوں کی دین ہو سکتی ہے۔عرب گئے تو بہت کچھ پیچھے چھوڑ گئے تھے۔وقت کے ساتھ ان کا اثاثہ مٹتا جا رہا ہے جدید قرطبہ میں باہمی تعصب اور نفرت بھی محسوس نہ ہوئے۔عرب اپنا جوہر مرگ ساتھ لے گئے تھے یا فاتحین نے مفتوحین کے انجام سے رازِ زندگی پا لیا تھا؟ اہل اسلام نے تو زوال قرطبہ اور سقوطِ غرناطہ سے بھی کچھ نہ سیکھا۔ یہ صورتِ خرابی ان کی فطرت میں ہوتی ہے؟ ایک ہی ملک اور شہر میں رہنے والے برادرانِ اسلام نفرت وتعصب کی آگ میں جل جلا رہے ہوتے ہیں۔وہیں بسنے والے غیر مسلموں کے دل ودماغ میں اس مرض کا نشان تک نہیں ہوتا۔قرطبہ کے غیر مسلم پہلے بھی ایک تھے۔عربوں کی صحبت کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔مسلمانوں کی فکر اور نظریۂ حیات میں تو کوئی خرابی نہیں؟ ان کا طرزِ حیات وطرز تربیت تو اس کا سبب نہیں بنتا؟ سفر واپسیں میں طرح طرح کے سوالات پریشان کرتے رہے۔سورج کی شعاؤں کا سطح آب پر زاویہ کافی ترچھا ہو چکا تھا۔کمالِ شفق کا وقتِ معین ابھی کافی دُور تھا۔پھر بھی سطح آب کی نیلی رنگت میں سنہری ملاوٹ شروع ہو گئی تھی۔

اہل قرطبہ پانی سے پن چکیاں چلا کر ان میں آٹا پیستے رہے۔نفرت وتعصب کی آگ سے چلنے والی چکیوں میں خود پستے رہے۔تعصب کی آگ سے چلنے والی پن چکی میں پس جانے والی قوم کا کیا انجام ہوتا ہے۔اس کی تو کافی سمجھ آ گئی تھی۔ پانی سے چلنے والی چکی کیسے پیستی ہے؟ پُل سے جنوب کی طرف ایک ٹاپو پر نیم دراز پن چکی دیکھ کر خیال آیا یہ بھی دیکھتے چلیں مگر کنارے اور ٹاپو کے درمیان بہنے والی پانی کی لہر کافی توانا تھی اس سے پاؤں پنجہ کی ہمت نہ ہوئی۔ دُور ہی سے اس کا قریبی جائزہ لیا اور وادی الکبیر کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔یہیں کہیں آبی محل تھا۔تہہ آب سے مرمریں ستونوں کی فصل اُگائی گئی کنول کی مانند نرم ونازک ستون پانی سے ذرا اُوپر اُٹھے تو ان کے سروں پر شاہی محل کا فرش بچھا دیا گیا تھا۔گردش دوراں نے مرمریں ستونوں کی فصل کاٹ لی۔ان کی بنیادیں اب بھی زیرِ آب، اپنے ماضی اور حال پر آنسو بہا رہی ہیں۔ اموی خلفاء نے اپنے اجداد کے دمشق میں محل کی یاد میں بھی یہیں کہیں محلِ دمشق بنوایا تھا۔''مترنم رہٹوں کا باغ'' اور

''نغمہ سرا پانیوں کی سیر گاہ'' بھی اسی کنارے کہیں ہوتے تھے۔ اہلِ قرطبہ نے القصر کے سامنے وادی الکبیر کے کنارے پارک بنانے پر کافی محنت کی ہے۔ اس میں چلتے ہوئے سیاح بلا ارادہ ماضی کے محلوں اور باغوں کو یاد کرنے لگتا ہے یہیں کہیں کوہ قرطبہ کی بلندیوں سے زیرِ زمین جستی پائپوں کے ذریعے شفاف پانی باغوں اور محلوں کے مرمریں حوضوں اور نہروں سے ہوتا ہوا دریا کے گدلے پانی سے ہم آغوش ہو جاتا تھا القصر کی مضبوط پتھروں کی بیرونی دیواروں میں زمانے کی چھلنی نے جگہ جگہ جالیاں بنا دی ہیں۔ ایک جالی سے جھانک کر دیکھا تو باغ بہشت کی نہر رواں کے گرد حور و غلمان جھوم رہے تھے۔ پانی جستی فواروں سے اچھل اچھل کر ان پر واری صدقے ہو رہا تھا۔ آبشاروں کا ہلکی لے میں نغمۂ ہجر و فراق بھی ماحول کی سرمستی کو متاثر نہیں کر سکتا تھا۔

ملیہ ہوٹل کے استقبالیہ پر آج بھی بوڑھے بوڑھیوں کا وہی ہجوم تھا۔ معلوم ہوتا تھا یورپ کے سارے بوڑھے بوڑھیاں قرطبہ چلے آئے ہیں۔ دھوپ، سورج سیاحت اور میلہ قرطبہ میں کتنا کچھ ایک ہی جگہ مل جاتا ہے۔ بچوں کا میلہ جوانوں کا میلہ ٹھیلہ اور بوڑھوں کا ذرا عمر رفتہ کو آواز دینے کا وسیلہ۔ بوڑھے بُل فائٹر نے ابھی محفل آٹوگراف نہیں جمائی تھی۔ وکٹوریہ پارک میلہ اپنے پُورے جوبن پر تھا۔ اشرف اور سمیع میرے لئے آج حُسن روشنی اور مست خرامی سے چھٹی پر تھے وہ مجھے پُرانے قرطبہ کے مزید گلیوں اور بازاروں میں گھمانا چاہتے تھے مَیں ان کے اس ایثار کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ وہ آج کی شب یہیں رہ جانے پر آمادہ کر رہے تھے۔ میرے پاس دن اور راتیں بہت کم تھے۔ ان کے خلوص و محبت پر نچھاور کرنے کو چند گھنٹے باقی بچے تھے۔ میلے سے ہم ایک بار پھر عیسائی قرطبہ میں مسلم آثار تلاش کرنے چل پڑے قرطبہ میں مسلم دور کے نوصد حماموں میں سے صرف ایک حمام باقی ہے۔ برطانیہ کی ملکہ میری کے خاوند فلپ دوئم کو اگر معلوم ہوتا کہ کسی زمانہ میں مسلمانوں کے حمام بھی اس کی اولاد کی کمائی کا وسیلہ ہوں گے تو وہ ''کفر'' کی یہ ''باقیات'' بے نشان نہ کراتا۔ قرون اولیٰ کے یورپ میں صفائی اور نہانا اہلِ چرچ کے نزدیک کافرانہ فعل تھے۔ کوئی دیندار بادشاہ اس ''کفر'' کے باقیات کو باقی رکھ کر کافر نہیں ہو سکتا تھا۔ عیسائی پادری اور راہبائیں جسمانی گندگی کو روحانیت کی منزل کا زادِ راہ سمجھتے تھے۔ مقامِ سینٹ تک پہنچی ایک خاتون نے اپنی روحانی اور عیسائی بزرگی اور روحانیت کا رعب ڈالنے کے لئے لکھا کہ اپنی ساٹھ سالہ عمر

عزیز میں انہوں نے ہاتھوں کی انگلیوں کی پوروں کے علاوہ اپنے جسم کا کوئی حصہ کبھی نہیں دھویا۔

''یہ ایک حمام بھی انہوں نے سمیع کے لئے بچا لیا تھا۔'' اشرف نے پھر سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

''انہیں معلوم تھا کہ ایک دور میں تم قرطبہ پر حملہ کرو گے اور تمہاری فکری غلاظت کسی چھوٹے حمام میں نہیں ڈھل سکے گی۔'' سمیع نے اینٹ کا جواب چھوٹے سائز کے پتھر سے دیا۔

''اچھا تو تمہارے اجداد کو اتنے بڑے بڑے اتنے زیادہ حماموں کی اسی لئے ضرورت ہوتی تھی۔'' تنگ گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اشرف نے سمیع کا پتھر لوٹا دیا۔ سمیع مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ بڑی گلی کی طرف سے ایک جوڑا برآمد ہُوا خاتون کے ہاتھ میں تازہ پھولوں کا گلدستہ تھا۔ سمیع نے مسکرا کر اشرف کی طرف دیکھا۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''آپ گلدستہ قبول کر لیتے؟'' سمیع نے مسکرا کر کہا۔

''وہ اس کے لئے لائے تھے؟'' میں نے مداخلت کی۔

''اگر یہ منہ دوسری طرف نہ کرتا تو وہ کوئی اور مُشکی رنگ والا تلاش کرنے کی زحمت سے بچ جاتے۔''

''میلہ منانے کے لئے یہ عملی مذاق کے کئی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ اشرف نے پھولوں کو پشت دکھانے کی وضاحت کی اور دوسرے بازار سے اس نے خود ایک میانہ گلدستہ خرید لیا۔

''لوگ یہ سمجھیں کہ اس سے پہلے ہی مذاق ہو چکا ہے۔''

''نہیں یہ کسی اور مقصد کے لئے ہیں۔'' اس نے سمیع کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر مقامی زبان میں تبادلہ خیال شروع کیا۔ سمیع نے گردن کے جھٹکا سے اظہار پسندیدگی کر دیا۔ قرطبہ کی گلیوں اور بازاروں میں وہ گلدستہ اٹھائے اٹھائے پھرے۔

سورج اپنی چوتھی منزل میں داخل ہوا تو سمیع نے قرطبہ میں آخری چائے کی دعوت دی۔ چھوٹے سے چائے گھر میں نوجوانوں کا ہجوم تھا۔ ریڈیو پر کوئی نغمہ بج رہا تھا۔ جام بدست لڑکے لڑکیاں جھوم رہے تھے۔ اس سرمستی میں وہ کبھی ''اولے اولے'' پکارتے۔ مَیں نے اشرف سے اس کا مطلب پوچھا تو اس نے قہقہہ لگایا۔ ''سمیع کے بزرگوں میں سے ایک گانے والے کا نام تھا

اسے یاد کر رہے ہیں۔ اندلس میں قرطبہ گیتوں کا دارالحکومت کہلاتا ہے۔ اسے یہ شرف بھی اس کے بزرگوں کی طرف سے ملا۔ اس لئے اسے دیکھتے ہی نعرے لگانے لگے ہیں۔''

سمیع گیت کی دُھن پر مراقبہ کی حالت میں تھا۔ اس نے سر اُٹھا کر اشرف کی طرف دیکھا۔ ''تم انہی بربروں میں سے ہو جن کی وجہ سے یہ شہر حسن اور عظمت سے محروم ہُوا۔''

''تمہارے بزرگ تو راگ راگنیوں میں کمال پانے کے باوجود اپنے تحفظ کے لئے بربروں کے محتاج تھے۔ بربر بھی گیت سیکھنے بیٹھ جاتے تو تمہارے سازوں کی حفاظت کون کرتا''۔ معلوم ہوتا تھا فارغ اوقات میں سمیع اپنے اجداد کے بارے میں اشرف کو کافی کچھ بتا چکا تھا وہ اس کے گھر اور شہر کا بھیدی تھا۔

''آپ کے ملک میں اس جیسے اور بھی ہیں یا یہی ایک تھا جسے ملک سے نکال دیا آپ نے؟'' سمیع نے اشرف کو گھورتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ مَیں کوئی جواب دیتا۔ اشرف بول پڑا۔ ''پاکستان میں تو اپنی قسم کا میں اکیلا ہی تھا وہاں سے نکال دیا گیا۔ آپ کے ملک میں آپ جیسے اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ حکومت ہر سال سینکڑے ہزار کو نکالتی ہے حالت پھر بھی بہتر نہیں ہوتی۔''

بیرے نے چائے کے نام پر قہوہ میز پر جما دیا سمیع نے ''اون لیچے'' کا نعرہ بلند کیا۔ بیرے نے اس انداز میں دیکھا جیسے سمیع نے اس سے دودھ نہیں ٹپ مانگ لی ہو۔

ہوٹل پہنچے تو مائی صاحبہ نے ہمارا بوریا استقبالیہ کے سٹور میں منگوا رکھا تھا تاکہ نئے مہمان کے لئے بستر آراستہ کیا جا سکے۔ ہوٹل بھی دُنیا کی مانند ہوتے ہیں جس مسافر کی مدت قیام ختم ہو جائے اس سے جلد از جلد نجات پانے کی رسم کے لئے ہمہ وقت تیار۔ تازگی اور حزن کی تہوں نے مائی کے اصل چہرے کو کہیں چھپا لیا تھا۔ اس نے بصد شکر یہ ہمیں رخصت کیا اشرف سے پھر بھی آتے جاتے رہنے کا وعدہ لیا۔ اس نے بھی جذبہ غمگساری کا نہایت کامیابی سے اظہار کیا تھا۔

آج کے قرطبہ کی مانند اس کا ریلوے سٹیشن بھی بہت پسماندہ ہے۔ یورپ کی بجائے پاکستان کے کسی چھوٹے شہر کا ریلوے سٹیشن معلوم ہوتا ہے۔ اشرف نے ٹکٹ کے ساتھ ایک کتابچہ بھی اُٹھا رکھا تھا جس میں پُورے مُلک کے ریلوے نظام اور گاڑیوں کی اتنی تفصیل درج تھی کہ

اشرف کے بار بار سمجھانے کے باوجود صرف اتنا پلے پڑا کہ بعض دنوں کو بعض ٹرینوں کا کرایہ کم ہوتا ہے۔ وہ چونکہ بعض دن نہ تھا اس لئے ہمیں پورے پیسے ادا کرنے پڑے۔ مَیں نے اسے اپنے لئے پلیٹ فارم ٹکٹ خریدنے کو کہا تو وہ مسکرا دیا۔ ''وہ تو اندلسیوں کے لئے ہیں۔ میرا تو یہ اپنا شہر ہے۔ ریلوے سٹیشن اور گاڑی میرے اپنے ہیں آپ اپنی فکر کریں''۔

سٹیشن کے عملہ میں وہ اس طرح گھل مل گیا جیسے انہی میں سے ایک ہو۔ سمیع البتہ خاموش بیٹھا کوئی نیا موضوع سوچ رہا تھا۔

''یہ سٹیشن تو تمہارے دَور میں نہیں ہوگا؟ اگر ہوتا تو تمہارے اجداد کی روانگی آسان رہتی ٹکٹ لیا اور سمندروں پار'' اشرف نے اسے سوچتے دیکھ کر کہا۔

''یہ ممکن نہیں کہ اشبیلیہ سے واپسی پر آپ ادھر سے ہوتے جائیں''۔ سمیع نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ اشرف نے بھی اس کے مشورہ کی تائید کی۔ مَیں اسے یہ بتا کر دُکھ نہیں پہنچا سکتا تھا کہ تمہارے اجداد نے یہ شہر چھوڑنے کی جو رسم ڈالی تھی اس میں اشبیلیہ سے آگے جانا ہی شامل ہے واپس قرطبہ آنا نہیں۔

پسماندہ گاڑی کے ذرا خوشحال ڈبہ میں سامان رکھ کر وہ باری باری اس انداز میں گلے ملے جیسے پھر کبھی نہ ملنے کے لئے ملا جاتا ہے۔

اشرف میرا اہم وطن ہے۔ سمیع میرا کیا ہے؟

قرطبہ کے بازار سے خریدا ہوا گلدستہ میری نشست پر رکھا تھا۔ یہ شہر تو پھولوں کے جواب میں پتھر دینے کا عادی تھا۔ پھول دیکھ کر سینکڑے سال پہلے کے پتھر یاد آنے لگے۔ مَیں ان کی محبت کا شکریہ کیسے ادا کروں؟ انہوں نے تو احسانات کا اتنا بوجھ ڈال دیا ہے۔ گارڈ ابھی دفتری کاروائی سے فارغ نہیں ہوا تھا۔ اندلس میں کسی اور ملک سے سگریٹ آ سکتا ہے نہ گاڑی۔ یورپ میں ہوتے ہوئے بھی اہل اندلس ساختہ یورپ اشیاء کی درآمد کی عیاشی کے متحمل نہیں۔ گاڑی تو ان کی تھی مَیں جواب میں اپنے دوستوں کو نہیں دے سکتا تھا ساختہ یورپ سگریٹوں کا ڈبہ نکال کر پیش کیا۔ انہوں نے اس انداز میں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں تم سے تو اس توہین کی آس نہ تھی۔ ڈبے میں بیٹھا واحد اندلسی مسافر بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ کہہ کر آمادہ کیا کہ اسی بہانے دو چار روز یاد

رکھنا۔ پھول تو ایک روزہ زندگی لے کر آتے ہیں، یہ کئی روز تک تمہاری زندگی عذاب کرتے رہیں گے۔

''یادوں کی خوشبو کبھی ختم نہیں ہوتی وہی خوشبو ہزار میل سے آپ کو کھینچ لائی تھی۔ سینکڑے سال پُرانی یادوں کی خوشبو جو ہم قرطبہ کی گلیوں اور بازاروں میں سونگھتے پھرتے تھے۔ اب ان گلیوں سے گزرتے ہوئے آپ بھی یاد آئیں گے، آپ کی خوشبو آئے گی۔'' سمیع کی باتوں میں مسلم قرطبہ کی فکری تازگی تھی اس قرطبہ کی جس کی زبان شاعری تھی جہاں شاہ وگدا کی بات اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی تھی جب تک وہ اس میں اپنا یا کسی اور شاعر کا کوئی شعر شامل نہ کرے۔ اجنبیوں کو یہ شاعروں کا شہر معلوم ہوتا تھا۔ لاریب سمیع اسی نسل سے ہے جس نے صدیوں سے قرطبہ کی زبان اور یادیں سینے سے لگا رکھی ہیں۔ باتوں کی مٹھاس فکر کی تازگی اشرف خلاف معمول خاموش تھا۔

گاڑی نے آہ بھری تو انہوں نے ایک بار پھر معانقہ کیا اور ڈبے کے باہر نکل کر کھڑے ہو گئے اور اس وقت تک کھڑے ہاتھ ہلاتے رہے جب تک نظریں ہاتھوں نے گم نہیں کر دیں۔

گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ یادوں کی پھرکی اور بھی تیزی سے گھومنے لگی۔ قرطبہ کے در و دیوار جامع قرطبہ کا مینار وادی الکبیر ایک ایک کر کے نظروں سے جُدا ہوتے گئے۔ ایک ایک کر کے اوراق تاریخ سامنے کھلتے رہے۔ آخری منظر مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ ہر دل غمگین، ہر آنکھ پُرنم، اہلِ قرطبہ کے لمبے لمبے قافلے پیچھے مُڑ مُڑ کر اپنے گھروں اور آبادیوں کو دیکھتے ہُوئے جن کی آہیں فلک کو چیر رہی تھیں۔ صدیوں کے حکمران اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی بھاری گٹھریاں اپنی خمیدہ پشتوں پر اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ عرب بھی عجم بھی، اندلسی بھی بربر بھی، امراء بھی حکماء بھی، اہلِ حرفہ بھی، اہل ثروت بھی، سب جا رہے تھے ہمیشہ کے لیے رنجور اور زخموں سے چور ایک گروہ نے اپنی پشتوں پر جامع قرطبہ کی بھاری قندیلیں اُٹھا رکھی تھیں ان کے ذرا قدم ڈگمگاتے تو سوار آگے بڑھ کر کوڑے برساتے۔ یہ قندیلیں فاتحین کے گرجوں کے گھڑیال بنانے کو لئے جا رہے تھے جو اپنی آزادی کی حفاظت نہ کر سکے۔ وہ ہمیشہ کے لئے غلامی کے سفر پر رواں تھے۔

باغوں، پھولوں اور محلوں کے قرطبہ کے مالک صرف غلامی کے مالک رہ گئے تھے۔

مَیں نے گلدستہ اُٹھا کر آنکھوں سے لگا لیا۔ پھولوں سے خوشبو غائب ہو چکی تھی۔ مَیں کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ ہری ہری لہلہاتی کھیتیاں کیا معلوم کس کھیت کی ہریالی کس کی قبر کی مٹی سے ہے۔ مَیں نے پھول کی ایک پتی توڑ کر ہوا میں لہرا دی۔ وہ اڑتی ہُوئی دُور جا گری پھر دُوسری اور پھر تیسری ایک ایک کر کے مَیں نے سب پھولوں کی پتیاں مسلمانانِ قرطبہ کی بے نشان قبروں پر نچھاور کر دیں۔

ابنِ عربی کے اشبیلیہ میں

گاڑی ایک خوش پوش شہر سے ہم قیام ہو رہی تھی۔ میرے اکلوتے ہم ڈبہ مسافر نے نعرہ بلند کیا ''سوبجیہ'' ذہنی طور پر میں ابھی سوبجیہ پہنچنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ تاریخ کے صفحات میں اشبیلیہ قرطبہ سے کافی دُور نظر آتا ہے۔ ریل کی پٹڑی پٹڑی اہل سپین کا سوبجیہ ان کے کورڈوبا سے کافی قریب نکلا۔ میں تاریخ کے اوراق میں سفر کر رہا تھا۔ میرا ہمسفر سوبجیہ کے سفر پر تھا۔ وہ مجھ سے پہلے منزل پر پہنچ گیا اور سامان سفر اٹھا کر میرے اُٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔

ڈبہ سے باہر تو آ گیا مگر محسوس یہی ہوتا تھا کہ منزل ابھی نہیں آئی یا پھر منزل آ گئی ہے تو میں خود منزل پر پہنچ نہیں پایا، ابھی کہیں پیچھے ہوں۔ قرطبہ اور اشبیلیہ کے درمیان اندلس کی ہری بھری وادیوں میں جہاں صدیوں قبل اذان گونجی تھی، جہاں تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا، قرطبہ سے چلتے وقت اشرف نے میرے ہمنشیں کے ذمہ لگایا تھا کہ وہ مجھے سوبجیہ کی آمد سے آگاہ کر دے اس کی حیرانی پر اشرف نے اسے بتایا تھا ''یہ کبھی گاڑی سے آگے نکل جاتا ہے، کبھی گاڑی اس سے آگے نکل جاتی ہے۔ اس لئے سٹیشن کی شناخت میں غلطی کر جاتا ہے''۔

قرطبہ کی نسبت اشبیلیہ کا ریلوے سٹیشن مناسب حد تک جدید تھا۔ مردوں کے شانہ بشانہ خواتین بھی برسرِ پیکار تھیں۔ سامان جمع تفریق کرانے کا اہتمام بھی تھا۔ ڈیوٹی پر دوشیزاؤں میں سے ایک سے ہوٹل کی ریزرویشن کی صورت حال دریافت کی تو اس کا جواب زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ مجبوراً ایک بار پھر ٹیکسی والے کو مسافر نوازی کا موقع دینا پڑا۔ وہی طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا، جس سے مکمل پرہیز نسخۂ سیاحت کا اہم جزو ہوتا ہے ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور سے ''کہیں لے

چل'' کی درخواست کی۔ اشبیلیہ کا ڈرائیور بھی قرطبہ کے ٹیکسی ڈرائیور کی نسبت کافی چاق و چوبند تھا۔ ابھی عمر کے اس حصے تک نہیں پہنچتا تھا جب آدمی ہر مقام پر اقتصادیات کو سامنے نہیں رکھتا اور اپنی اور اپنے شہر کی شہرت کو مزید داغدار کرنے سے پرہیز کرتا ہے۔ انگریزی سے اس کی آشنائی بھی یس نو تک ہی محدود تھی، مزاج البتہ کافی انگریزی پایا تھا۔ انگریز سیاحوں کی صحبت کے اثرات نمایاں تھے۔ سامان ٹیکسی میں رکھتے ہی اس انداز میں چھوٹ وٹی جیسے کہیں کوئی ہم دونوں کا نہایت شدّت سے منتظر تھا۔ مَیں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میرا وطن اور گھر بہت دُور ہیں۔ یہاں کوئی جاننے والا بھی نہیں جو تھے صدیوں پہلے ذلیل وخوار ہو کر کہیں چلے گئے تھے۔ آپ ذرا بہتر سلوک کر کے میرے اجداد سے اپنے اجداد کی نیکیوں کا کفارہ ادا کر سکتے ہیں لیکن وہ تھوڑے سے وقت میں مجھے بہت سا اشبیلیہ دکھانے پر تُلا بیٹھا تھا۔ تنگ و تاریک گلیوں اور بازاروں میں دوڑتا ہوا وہ کہیں اچانک بریک لگاتا اور مجھ سے پوچھے بغیر پھر آگے چل پڑتا تھا۔ آدھ پون گھنٹہ ہی میں اس نے فتوحات مکیہ کے اوراق پر بنی تمام گلیاں دکھا دیں۔ وہ گلیاں اور بازار جنہیں سمجھنے کے لئے ابن عربی نے اپنی عمر کے انتیس قیمتی سال اس شہر میں گزارے تھے میرے پاس ابن عربی جتنا وقت جو نہیں تھا وہ تو پورے دس سال حرم کعبہ میں اس انتظار میں بیٹھے رہے تھے کہ خدا کے گھر میں اس وقت نقب لگائیں گے جب کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔ انہوں نے اتنی کتابیں لکھ ڈالیں کہ لوگوں کے پاس ان سب کو پڑھنے تک کے لئے وقت نہیں۔ اس شہر نے اسے وقت ہی نہیں شعورِ وقت بھی دیا تھا، ابنِ عربی کی وقت اور احساس وقت کی محتاجی جن کوچہ و بازار نے ختم کر دی تھی وہ مجھے ایک ڈرائیور کی محتاجی سے بھی بے نیاز نہ کر سکے تو ایک تنگ گلی کے اندھے موڑ پر میں نے ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ڈرائیور نے ہنگامی بریک لگائی اور پہلی دفعہ گردن گھما کر سوالیہ مسکراہٹ سے نوازا۔ اس کی زبان حرکت میں آنے سے پہلے مَیں سڑک پر کود گیا۔ پیچھے کھڑی گاڑی کے ڈرائیور نے بھونپو بجا کر اپنے پیچھے کھڑی گاڑیوں کے وجود کا احساس دلایا تو وہ میٹر وصول کر کے مسکرایا ''آپ تو جلد ہی گھبرا گئے''۔ سامنے ہی ایک ہوٹل تھا وہ اسے بھی چھوڑ کر نکلا جا رہا تھا۔ ہوٹل والے سے تعلقات کی کشیدگی کی وجہ سے یا انجانے مسافر سے تعلقات کی استواری کی خاطر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

استقبالیہ پر کھڑا نوجوان تازہ کلی کی مانند مسکرا دیا۔ اگر صورتحال کمپلیٹو والی ہوتی تو اسے مسکراہٹ ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی یہ سوچ کر اشبیلیہ میں پہلی دہلیز سے اندر پاؤں رکھ دیا۔ وہ مزید مسکرایا اور خالی کمروں کی سیر کرانے چل پڑا۔ منزل اوّل کا کشادہ دل خوش مزاج کمرہ دیکھ کر ڈرائیور کا سارا حسن سلوک بھول گیا۔ نئی طرز کا استقبال پُرانی طرز کی عمارت انداز اور مزاج میں کشادگی گرم پانی سے تپشِ احساس شدید ہونے لگی۔ کھڑکی کھولی تو دُور دُور تک اشبیلیہ کی چھتیں چمکیلی دھوپ تاپ رہی تھیں۔ آسمان پر کہیں بادل کا کوئی ایک آوارہ ٹکڑا دکھائی نہ دیا۔ تنگ گلیاں اُونچے مکانوں میں ایسے گم ہو جاتیں جیسے بل کھاتا ہُوا سانپ گھنے جنگل میں چھپنے جا رہا ہو۔ کھڑکی سے دکھائی دینے والی ہر گلی پر سانپوں والی گلی کا شبہ ہوتا تھا۔

اشبیلیہ کے بارے میں مغربی سیاحوں کو بتایا جاتا ہے کہ یہ وہ شہر ہے جہاں نیلے فلک پر ہر روز سُورج چمکتا ہے۔ اس شہر کے گلاب سارا سال مسکراتے ہیں۔ اس میں سانپوں والی گلی ہے اور یہ یورپ کے بے مثال مینار جیرالڈا کا مالک ہے۔ نیلے آسمان پر چمکتا سُورج اور سانپ کی مانند بل کھاتی گلیاں تو سامنے تھیں۔ مگر گلاب اور جیرالڈا کہیں نظر نا آئے۔

مسلم اندلس میں اشبیلیہ کا وہی مقام تھا جو مسلم ہندوستان میں لکھنؤ کو حاصل رہا ہے.....

اشبیلیہ کا حکمران معتمد اندلس کا واجد علی شاہ تھا۔ اس فرق کے ساتھ جو ایک عرب اور ہندوستانی میں ہونا چاہئے۔ معتمد نے اپنے آپ کو فاتح جرنیل کے حوالے کرنے سے پہلے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر زرہ بکتر کے بغیر جنگ کی۔ حملہ آور دستہ کو قلعہ سے نکال کر شگاف پر کیا۔ وہ میدان میں اتنا ہی نامور تھا جتنا میدان شعر و سخاوت میں۔ واجد علی شاہ سے جب کسی نے پُوچھا کہ آپ کے پاس وقت تھا انگریز فوج کے آنے سے پہلے آپ بھی بھاگ کیوں نہ گئے؟ اپنے آپ کو انگریز فوجوں کے حوالے کیوں کر دیا؟ ''میرے دل میں آیا تو تھا کہ بھاگ جاؤں لیکن اس وقت مجھے جوتے پہنانے والا کوئی نہ تھا''۔ واجد علی نے جواب دیا تھا۔ اشبیلیہ کا واجد علی شاہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر ننگے جسم تلوار چلانے والا تھا۔ لکھنؤ کا واجد علی ننگے پاؤں اٹھ کر اپنا جوتا بھی نہیں پہن سکتا تھا۔ معتمد کے شکست خوردہ ساتھیوں نے اسے بار بار یوسف بن تاشفین کے جرنیل کے حوالے ہو جانے کا مشورہ دیا۔ وہ بار بار تلوار تھام کر میدان میں کود پڑا۔ علم و ادب اور حسن و شعر کے فدائی معتمد کو تاریخ

میں اشبیلیہ کے خوش مزاج حکمران کے طور پر جانا جاتا ہے وہی معتمد جو مراکش کے بندی خانہ میں ''مَیں پریشان ہُوں۔ پریشان ہے میری تدبیر بھی''۔ جیسے شعر موزوں کیا کرتا تھا۔ شاعری اس کی کمزوری تھی۔ بچپن میں ایک خچر سوار غریب شاعر کا شعر پسند آ گیا تھا۔ بادشاہ بنا تو اس کی شاعری کے اعتراف کے طور پر اسے وزیر اعظم بنا لیا۔ دریائے کبیر کے کنارے خچر چرانے والی ایک لونڈیا کا مصرعہ سُن کر اتنا بدحال ہوا کہ اسے خرید کر اپنی ملکہ کا مرتبہ عطا کر دیا۔ ابن عمار اور ملکہ رمیکیہ معتمد کی دو سب سے بڑی کمزوریاں تھیں۔ تاریخ اسے شعر اور سخاوت کا بادشاہ مانتی ہے۔ مگر اس کا دعویٰ ''مردِ حر'' تسلیم نہیں کرتی۔ مملکت شعر فہمی اور شعراء نوازی سے چلتی تو معتمد دُنیا کا سب سے بڑا حکمران ہوتا۔ شعر و نغمہ کا اشبیلیہ آج بھی حسن و رعنائی کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ ڈرامہ، ادب، مصوری، اور بل فائٹنگ اشبیلیہ کا ہر فن میں اپنا مخصوص اندازِ اظہار ہے۔ اشبیلیہ کے بُل فائٹر زخمی بُل کے روبرو خاص نازک اندامی کا اظہار کرتے ہیں۔

دہلی کا مرکز کمزور ہُوا تو لکھنؤ کا صوبائی حکمران خود مختار ہو گیا۔ قرطبہ والوں نے قرطبہ کو تباہ کیا تو حاکم اشبیلیہ مرکز سے کٹ گیا۔ تیمور کے گھر سے حمیت رخصت ہوئی تو سلطنت مغلیہ میں جرنیلوں اور صوبیداروں نے اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی ریاست قائم کر لی۔ خاندان امویہ حمیت سے محروم ہوا تو اندلس عرب اور برابر ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ لکھنو کے دہلی کے مقابلہ کا مرکز علم و ادب بننے کی نہ لکھنؤ کی خواہش پُوری ہوئی نہ اشبیلیہ قرطبہ کے برابر آ سکا۔ سقوط قرطبہ کے صرف بارہ سال بعد اشبیلیہ پر بھی عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ مسلم ہندوستان جس مقام پر ۱۸۵۷ء میں پہنچا اندلس اس مرحلہ سے ۱۲۳۶ء میں گزر گیا تھا۔ چھ سو سال پہلے ہندوستان میں جب مغل اپنی عظیم سلطنت کی بنیادیں رکھ رہے تھے تو اندلس میں عرب اپنی عظیم الشان سلطنت تباہ بھی کر چکے تھے۔

ہوٹل سے یہی سوچتا ہوا باہر آیا کہ اشبیلیہ نے لکھنؤ کو اپنے انجام سے آگاہ کیوں نہ کیا۔ ''دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو''۔ کا پیغام کیوں نہ ارسال کیا۔ تنگ گلی کا موڑ مُڑا تو سامنے وسیع چوک تھا۔ چاروں طرف ہرے بھرے درخت قطار در قطار۔ بڑی بڑی جدید عمارتیں تنگ گلیوں کے دامن میں وسعت قدامت کے پہلو میں جدت میں ایک روش پر چل دیا۔ قدیم و جدید سارا

اشبیلیہ میرے قدموں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ ماضی اور حال قدیم اور جدید کے کسی سنگھم پر ایک آواز کان پڑی۔ پرائے ملک اور اجنبی شہر میں کوئی نہایت اپنائیت اور پوری آواز سے مجھے پکار رہا تھا۔ مُعلم تاریخ ابن خلدون نے اسی شہر میں رازِ تاریخ پایا اور پھر اندلس سے اخراج کے بعد اصول تاریخ مرتب کیے تھے۔ وہ مجھے دہلی اور لکھنؤ کی کورنگاہی کی وجوہ سمجھانے تو نہیں آ گیا؟ چاروں طرف نظر دوڑائی نہ جُبہ و دستار نہ کوئی تاریخ اور مقدمہ بردار۔ چلنے لگا تو آواز پھر آئی۔ ایک نوجوان ہجوم کو چیرتا ہُوا تیزی سے دوڑتا آ رہا تھا۔ وہ بلا اجازت ایسے لپٹ گیا جیسے مَیں خود تاریخ کے اشبیلیہ سے لپٹ جانا چاہتا تھا۔

''آپ نے مجھے نہیں پہچانا ہے میں خال۔۔۔؟''

''لیکن آپ تو وہ نہیں؟'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''کون؟'' وہ حیرانی سے میرا مُنہ تکنے لگا۔

''خلدون وہ تو باریش ہوتا تھا۔ اس کی بغل میں تو بستہ ہوتا تھا اور وہ ان گلیوں میں ہمیشہ نیچی نظر چلتا تھا۔''

''مَیں خالد ہُوں''۔

''خالد مَیں نے تو اشبیلیہ کے کسی خالد کا نہیں سنا۔''

''اشبیلیہ کا نہیں میں لاہور کا خالد ہُوں۔ میں تو آپ کو جانتا ہُوں۔ مَیں ایم اے او کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ فلاں فلاں وہاں میرے اُستاد ہوتے تھے۔'' اس نے ٹھیٹھ پنجابی میں اپنا تعارف شروع کیا۔

''اپنا لاہور اور اتنے نامی گرامی اساتذہ چھوڑ کر آپ یہاں کہاں؟''

''میرے محترم اساتذہ نے تو بہت کوشش کی تھی لیکن مجھ سے ایف اے پاس نہ ہو سکا تو شرم کے مارے یہاں آ گیا۔''

شرم کے مارے لوگ کتنی دُور تک چلے آتے ہیں۔ مجھے اس کی حالت پہ شرم محسوس ہونے لگی۔

''اب شرم کا کیا حال ہے؟ مقام واپسی آیا یا نہیں؟''

''گھونسلے سے گرا چڑیا کا بچہ کبھی واپس ہوا ہے؟'' اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

چوک میں آنے جانے والے لوگ مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ خالد نے بازو کھینچتے ہوئے کہا۔ ''چلیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

میرے پاس باتوں کا وقت تھا نہ چل کر بیٹھنے کا لیکن پرائے دیس میں، اپنے ہم زبان کی حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر بازو پر اس کی گرفت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ نوجوان ہے۔ شراب خانے میں جس کے ایک حصّہ میں چائے خانہ بھی تھا اس نے اپنے ایک باریش ساتھی کا تعارف کرایا جو اس کی حالت پر اپ سیٹ معلوم ہوتا تھا۔ انہی کرسیوں سے خالد نے مجھے شیشے میں سے دیکھا تھا اور اسے بتائے بغیر دوڑ پڑا تھا۔ اس کا ساتھی اس دوڑ پر اَپ سیٹ تھا۔ خالد نے اسے میرے بارے میں تفصیل سے بتایا اور پھر چائے کی پیالی سامنے رکھ کر نہایت حیرانی سے وہی سوال کیا جو ہر جگہ کیا جاتا تھا۔ ''آپ یہاں کیسے؟''

''بذریعہ ٹرین'' میں نے سیدھا سا جواب دیا۔

اس نے قہقہہ لگایا اور اپنے ساتھی کو اپنے سوال اور میرے جواب سے آگاہ کرنے لگا۔ اس کے ساتھی نے باریک باریک انگلیوں سے اپنی سنہری داڑھی کی لٹیں ایک دوسری سے الگ الگ کرتے ہُوئے مجھے گھورا اور مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

''میرا مطلب تھا آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟'' خالد نے اپنے سوال کو ذرا آسان فہم بنا کر پیش کیا۔

مَیں نے اسے بتایا کہ یہی سوال الحمراء میں ایک امریکن سیاح نے مجھ سے پوچھا تھا اور مَیں نے اسے جو، جواب دیا تھا وہ دہرانے کے لئے وقت نہیں پھر آپ کا ساتھی الگ بور ہو گا۔

''تو آپ غرناطہ سے ہو آئے ہیں؟'' اس نے حیرانی ظاہر کر دی۔

''آپ ابھی وہاں نہیں گئے؟''

''بال بچوں سے وقت ہی نہیں ملتا''۔ اس نے اس انداز میں جواب دیا جیسے بال بچوں نے اس کا وقت چھین کر اس سے زیادتی کی ہو۔

''آپ بال بچے ساتھ ہی لائے تھے؟''

''نہیں، یہیں سے آ کر لیے ہیں۔''

''یہاں بال بچے بھی ملتے ہیں؟''

خالد نے ایک بار قہقہہ لگایا اور اپنے ساتھی کو میرے سوال سے آگاہ کیا۔

''مجھے تو ابھی تک بال بچے نہیں ملے حالانکہ مَیں اس سے پہلے یہاں آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی کام کرتا ہُوں۔ اسے آتے ہی بال بچے بھی مل گئے اپنی اپنی قسمت کی بات ہے''۔ اس کے ساتھی نے ایک بار پھر داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہُوئے کہا۔ پھر اس نے اپنے بڑے سے تھیلے سے مصوری کے ایک فن پارے کا پرنٹ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ ''ہم دونوں گلیوں بازاروں میں گھوم پھر کر یہ پرنٹ بیچتے ہیں۔ مجھے جو بچتا ہے مَیں اس سے زندگی گزارتا ہوں اسے جو کچھ بچتا ہے یہ اس سے بچے پالتا ہے۔ مجھے تو آج تک سمجھ نہیں آیا آپ پاکستانی اتنی تھوڑی رقم میں دونوں کام کیسے کر لیتے ہیں۔''

''آپ کو یہ سمجھ آئے گا بھی نہیں اپنا وقت ضائع نہ کریں''۔ مَیں نے اسے مشورہ دیا۔

تعارف طویل ہونے لگا تو اجازت چاہی ''غروب آفتاب سے پہلے کچھ اشبیلیہ گردی کرنا چاہتا ہُوں''۔

''اگر آپ پسند کریں تو ہم بھی آپ کے ساتھ اس گردی میں شامل ہو جائیں۔ صبح سے تھیلے لٹکائے پھر رہے ہیں۔ آج بکا بھی کچھ نہیں، سب حرامی لاٹری اور بل فائٹنگ کے ٹکٹ خرید رہے ہیں، ویسے بھی خالد کو دو سال بعد کوئی پاکستانی مِلا ہے۔ اس کے چند لمحے اچھے گزر جائیں گے، گھر جا کر بھی تو اس نے بیوی اور خسر کی جھڑکیاں ہی سُننا ہیں''۔ باریش نوجوان نے سب کا بل ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''پتہ نہیں اس کے بچوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔ مجھے تو اس پر اپنے سے زیادہ ترس آتا ہے۔ پرنٹ بیچ بیچ کر پرنٹ بیچنے کے لئے بچے بنانے کا جُرم مَیں تو نہیں کر سکتا''۔

چوک سے نکل کر ہم ایک کشادہ سڑک پر ہو لئے۔ اب خالد بول رہا تھا اور اس کا ساتھی خاموش تھا۔ وہ بولنا بھی چاہتا تو نہیں بول سکتا تھا۔ خالد اپنی پنجابی ٹیسٹ کر رہا تھا کہ ابھی اس میں حرارت باقی ہے۔ ''سالوں بعد کبھی کوئی پاکستانی ملا ہے نہ کوئی پنجابی جاننے والا نہ اُردو بولنے والا معلوم ہوتا ہے میری تو اپنی کوئی زبان ہی نہیں''۔

''آپ کے بال بچے؟''

''بیوی اندلسی ہے، دو بچے ہیں وہ ماں کی زبان بولتے ہیں۔''

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ''آپ کا مطلب ہے عیسائی؟''

''نہیں مسلمان ہے۔''

''لیکن آپ تو کہتے ہیں اندلسی ہے؟''

''اندلس میں اب مسلمان بھی ملنے لگے ہیں لیکن ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ انہیں اپنی بچیوں کے لئے مسلمان نہیں ملتے اسی قحط الاسلام کی وجہ سے مجھ جیسوں کو بھی نہیں جانے دیتے اور گھر داماد بنا کر رکھتے ہیں۔ بیوی ملازمت کرتی ہے سسر کے ساتھ رہتا ہُوں''۔ اس نے بتایا کہ اشبیلیہ میں مسلمانوں کی مردم شماری پچیس نفوس ہے۔ اس کی بیوی دو بچے سسر اس کا خاندان اور وہ خود اس تعداد میں شامل ہیں۔ ان اہل اسلام نے اپنی مسجد بھی بنا لی ہے، جہاں جمعہ کی نماز باقاعدہ ہوتی ہے۔

''آپ کس کا نام لے رہے تھے؟'' خالد چلتا چلتا رُک گیا۔

''ابن خلدون کا۔''

''سوئیکیہ میں تو اس نام کا کوئی مسلمان نہیں مَیں سب کو جانتا ہوں۔ آپ کو اس کے گھر کا ایڈریس تو معلوم ہو گا۔''

''انہی گلیوں میں کہیں رہتا ہے۔''

''مَیں اپنے سسر سے پُوچھوں گا۔ آپ کو اس سے کوئی کام ہے؟''

''مَیں اس سے پوچھنا چاہتا ہُوں کہ اس نے اپنی کتاب دہلی اور لکھنؤ کیوں نہیں بھیجی تھی۔''

''سوئیکیہ کے مسلمانوں میں تو کوئی خط لکھنے والا بھی نہیں، آپ کتاب کی بات کرتے ہیں، آپ کو ضرور غلطی لگی ہے۔''

ہم ایک گرجے کے ساتھ ساتھ چل دیئے تھے۔ ایک نوجوان کپڑا بچھائے گرجا کے دروازے کے سامنے بیٹھا تھا۔ چھوٹی سی تختی پر کچھ لکھ کر پاس رکھا تھا۔ باریش نوجوان اس سے باتیں کرنے لگا۔

''تختی پر کیا لکھا ہے؟'' مَیں نے پوچھا۔

''مَیں ایک سیاح ہُوں۔ جرمنی سے آیا ہُوں۔ میرے پاس کچھ نہیں۔ یسوع کے لئے میری کچھ مدد

کیجئے''۔اس نے انگریزی میں ''کچھ'' کا ترجمہ کیا تو نوجوان سیاح نے انگریزی میں اس کی خود ہی وضاحت شروع کردی۔''ان حرامیوں کے پاس کسی کی مدد کے لئے بھی کچھ نہیں رہ گیا مگر میں اس شہر کا خرچ انہی سے وصول کروں گا۔بوڑھی مائیاں اسی دروازہ سے گرجا کے اندر جاتی ہیں''۔

''مَیں تو آپ کی یہی مدد کرسکتا ہُوں''۔ہمارے باریش ساتھی نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر پیش کردی۔

''شکریہ مَیں صرف سیاہ تمبا کو پیتا ہوں''۔گرجا گھر کا مہمان مسکرایا۔

دُور ایک کمر خمیدہ مائی سر پر رومال باندھے مڑے ہُوئے بازو کی کہنی سے چمڑے کا تھیلا لٹکائے آہستہ آہستہ چلتی آ رہی تھی۔''شکریہ آپ چلیں میرا شکار آ رہا ہے'' نشستہ نوجوان نے اپنے چہرے سے مسکراہٹ اتارتے ہُوئے کہا۔

''یہ سیاہ تمبا کو کیا ہوتا ہے؟''مَیں نے پوچھا۔

''وہی جو سیاح پیتے ہیں''۔باریش نوجوان قہقہہ لگا کر بات ٹال گیا۔

مائی نے بیگ سے سکّے نکال کر نوجوان کے رومال پر پھینکے اور سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے گرجا میں داخل ہوگئی۔نوجوان نے سکّے اُٹھا کر جیب میں ڈال لئے اور رومال پھر سے گرجا کے دروازے کے سامنے پھیلا دیا۔''بہت خُوب کامریڈ کافی تجربہ کار ہے''۔باریش نوجوان نے اس کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا۔

ماحول میں دلکش خاموشی تھی۔سڑکوں پر نہ گاڑیوں کا شور تھا نہ آنے جانے والوں کا رش، مکانوں کی چھتوں پر سے چمکیلی دھوپ کے پاؤں پھسل پھسل جاتے تھے۔صاف ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔بازاروں میں بنے سنورے سیاحوں کی ٹولیاں گھوم پھر رہی تھیں۔قرطبہ میں سیاح عام طور پر ہوٹلوں اور تاریخی مقامات پر ہی جمع ملتے تھے۔اشبیلیہ کے بازاروں کا حسن و رعنائی بھی قابلِ سیاحت تھا۔گرجا گھر کے سامنے سے ہوتے ہُوئے ہم اشبیلیہ کے القصر کی طرف نکل گئے۔سیاحوں کے جتھے باہر آ رہے تھے،خالد نے القصر کی تفصیلی سیاحت دُوسرے روز تک ملتوی کرنے کا مشورہ دیا۔چارلس نے اس کی تائید کی۔

مُسلم اندلس میں کسی سربراہ حکومت کا پہلا قتل اسی شہر میں ہوا تھا۔فاتح اندلس موسیٰ بن نصیر

کے فرزند عبدالعزیز کو اشبیلیہ کی مسجد میں دورانِ نماز قتل کر کے اس کا سر خلیفہ سلیمان کو بھیجا گیا تھا۔ مسند خلافت پر تشریف رکھتے ہی سلیمان نے اُن تمام جرنیلوں کے خلاف ''اصلاحی'' اقدامات شروع کردیئے تھے جو مختلف ممالک میں فتوحات حاصل کررہے تھے۔قتیبہ بن مسلم کو رُوسی ترکستان سے واپس بلا کر چین کو اپنی فوجوں کی یلغار سے بچالیا۔محمد بن قاسم کو سندھ سے واپس بلا کر بقیہ ہند کو محفوظ بنادیا۔موسیٰ بن نصیر فاتح اندلس اور والیٔ افریقہ دمشق میں تھے ان کے خلاف کارروائی سے تسلی نہ ہُوئی تو ان کے نوجوان فرزند والیٔ اندلس کا سر منگوا کر انہیں پیش کیا۔بوڑھے باپ نے بیٹے کا سر دیکھا تو صرف اتنا کہا۔''اس کو جامِ شہادت نوش کرنا مُبارک ہو۔واللہ یہ راتوں کو جاگنے والا اور دن کو روزہ رکھنے والا تھا''۔

محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کر کے اس کا نظم مستحکم کیا۔عبدالعزیز نے اپنے والد اور اس کے جرنیل طارق بن زیاد کے مفتوحہ اندلس میں نظام سلطنت مرتب کیا۔نومسلم اندلس کو صوبوں اور یونٹوں میں تقسیم کر کے سلطنت کی بنیادیں رکھیں۔محمد بن قاسم پر داہر کی بیٹیوں کا الزام لگا۔ عبدالعزیز تہذیب مغرب اور اندازِ شاہی اپنانے کے الزام میں قتل کر دیا گیا۔راڈرک کی بیوہ انجیلونا سے شادی کر کے اس کی خوشی کی خاطر کلیسا ابیہ میں قیام بھی اس کے خلاف فردِ جُرم میں شامل تھا۔

حکمران کی تبدیلی کے ساتھ خدمت اور جُرم کا تصور بھی بدل جاتا ہے۔دمشق میں خلافت کی تبدیلی سے تاریخ اسلام کا رُخ بھی تبدیل ہوگیا۔ولید کے دَور کے محسنِ قوم،سلیمان کے دور میں مجرم قوم بن گئے۔قوم ہمیشہ سے ہی حکمران وقت کا نام رہا ہے؟خلیفۂ دمشق کے ''مجرم'' کو یہ زمین اور شہر بھی ''مجرم'' سمجھتے ہیں۔راڈرک کی قوم کا بھی مجرم،طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر کی قوم کا بھی مجرم؟دو قومیں ایک مجرم۔یہ کیسے ہُوا؟عبدالعزیز کسی کا محسن بھی تھا؟

کلیسا ابیہ کہاں ہے؟''

''کسی عیسائی سے پوچھ کر بتا سکتا ہوں۔''چارلس خالد کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

مَیں نے اس کی طرف دیکھا وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا۔

''تم کیا مسلمان ہوگئے ہو؟''خالد نے اسے چھیڑا۔

''مسلمان نہیں ہوا تو عیسائی بھی نہیں رہا'' وہ چڑا نہیں۔

''دیکھو کسی عیسائی کے سامنے ایسا نہ کہہ دینا''۔ خالد نے اسے نصیحت کی۔

''میں تو کسی مُسلمان کے سامنے بھی یہ بات نہیں کرتا''۔ اس کے ہونٹوں پر شرارت پھیل رہی تھی۔

القصر کے پہلو سے ہوتے ہوئے ہم ایک خوبصورت پارک میں نکل آئے۔ درختوں کے سائے ان کے قد وقامت کی نسبت بہت طویل ہو گئے تھے۔ جب آفتاب نزول کی منزل میں پہنچ جائے تو سائے قد سے بڑھ جاتے ہیں۔ شعراء کرام سایہ کو دیکھ کر قد کا قصیدہ لکھتے ہیں۔ قصیدے سُن کر شاہانِ کرام اپنے قد سایہ کے پیمانہ سے ناپنا شروع کر دیتے ہیں۔ منزلِ زوال میں مسلم اندلس کا ہر شاہ اپنے سایہ کو اپنا اصل قد سمجھنے لگا تھا۔ جب آفتاب اور بھی نیچے چلا جائے تو سائے گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ شاہان اندلس کی تاریخ بیشتر مقامات پر وقت شام اشجار کے سایوں کی مانند ہے، ہیں بھی اور نہیں بھی۔ نہ ہونے کا کوئی فائدہ، نہ نا ہونے کا کوئی نقصان۔ غرناطہ کا ایک سایہ دوسرے سایہ کو دیکھ کر کانپنے لگا۔ رات کی تاریکی میں شاہان غرناطہ کے خزانہ کے زر و جواہر بوریوں میں بند کئے اور اشبیلیہ پہنچ گیا۔ اپنے امراء اور رؤسا سمیت اپنی دولت اور خدمات عیسائی حکمران کو پیش کر دیں۔ ''اگر آپ دُوسرے سایوں کے خلاف میری مدد کریں تو یہ تن من دھن سب تیرا ہے۔ تیرا رہے گا''۔ عیسائی حکمران نے زر و جواہر رکھ لئے۔ امراء اور رؤسا کے سر کٹوا کر غرناطہ کے تحفے والی کو تحفہ میں بھجوا دیئے۔ ان کے ''امیر'' ابوسعید کو گدھے پر بٹھایا۔ منہ پر سیاہی مل کر شہر میں گھمایا، اور پھر القصر کے سامنے میدان میں، ٹکٹکی سے باندھ کر اپنے ہاتھ سے نیزے مار مار کر ختم کر دیا۔

''تو اپنی قوم کا نہ بن سکا۔ میرا کب بنے گا؟''

برطانیہ کے تاج شاہی میں دو ہیرے سب سے قیمتی ہیں۔ ہندوستان کا کوہ نور اور غرناطہ کا لعلِ احمر۔ لعل احمر اسی خزانہ میں تھا جو ابوسعید نے برادر کشی میں امداد کے لئے شاہ اشبیلیہ کو پیش کیا تھا۔ تاریخ اندلس میں اس عیسائی حکمران کو پدر و ظالم لکھا جاتا ہے۔ ابوسعید کو گدھے پر بٹھانے اور اس کے ساتھیوں کے سر تحفہ میں بھجوانے کی وجہ سے نہیں، اپنے ظالمانہ طرز حکمرانی کی وجہ سے۔ اپنی قوم کے ہر غدار کے مقدر میں خدا نے ایک پدر و ظالم اور گدھا لکھا ہوتا تو شاید تاریخ مسلم کچھ مختلف ہوتی۔

ایک شمشیر بکف شہسوار کا مجسمہ دیکھ کر میں نے چارلس سے پوچھا ''یہ کون ہے؟''

''اس خطہ کو موروں سے پاک کرنے والا شاہ سپین۔''

مجھے محسوس ہوا جیسے اس نے شہسوار کی تلوار میرے جسم سے پار کر دی ہو مگر اس نے تو ایک تاریخی حقیقت بیان کی ہے جو اس کی تاریخ کا بھی حصہ ہے۔ موروں کی تاریخ کا بھی حصہ ہے۔

''معاف کرنا یہ میں نہیں کہتا اس مجسمہ کے بنانے والے نے نیچے لکھا ہے۔ آپ خود پڑھ لیں''۔ شاید اس نے میرے اندر جھانک لیا تھا۔

''میرا تو بس چلے تو مَیں یہ گھوڑا چرا لے جاؤں۔ روز روز فنکاروں کے پرنٹ بیچنے کی بجائے اسے کسی مور بادشاہ کے پاس بیچ دُوں''۔ پھر اس نے خالد کی طرف مڑ کر پُوچھا۔ ''آپ کے خیال میں قذافی زیادہ قیمت لگائے گا یا حسن؟''

''آپ گھوڑ سوار سمیت کیوں نہیں چرا لیتے؟''

''مجھے فن کے نمونے کی حیثیت سے گھوڑا اچھا لگتا ہے۔ سوار کی شکل میں عیسائیوں کے تعصّبات اور تاریخی جھوٹ بھی شامل ہیں۔''

گولڈن ٹاور کے گرد چکر مکمل کر کے ہم اس کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ مسلم دور میں بندرگاہ کا یہ محافظ سنہری لباس زیب تن کرتا تھا۔ مسلمانوں کے اخراج کے بعد ان کے بنائے برج کا لباس فاخرہ بھی اتار لیا گیا تھا لیکن لباس برہنگی میں بھی اس کے جلال و جمال سے سیاح مرعوب ہو جاتے ہیں۔ القصر اور جیرالڈا کی زیارتوں کے بعد سنہری برج کا طواف ضروری سمجھتے ہیں۔ بارہ پہلوؤں کے اس بُرج کے اندر سے سیڑھیاں چھت تک جاتی ہیں۔ مختلف منزلوں پر روشن اور ہوادار کمرے ہیں۔ وادی الکبیر کے دُوسرے کنارے پر اسی قسم کا رو پہلی برج ہوتا تھا۔ اب اس کی نشانیاں ہی باقی ہیں۔ جب دریا میں جہازوں کی آمدورفت بند کرنا ہوتی تو دونوں برجوں کے درمیان بھاری زنجیریں ڈال دی جاتی تھیں۔ عیسائیوں نے سنہری بُرج کے سر پر برجی رکھ کر اس میں شمعیں جلا دیں۔ اک شمع رہ گئی تھی، اب وہ بھی خاموش ہے۔ برج کے چہرے پر وقت نے گہرے زخم لگائے ہیں، جن سے چونا رستا رہتا ہے۔ ہاتھ رکھا تو اس کے ٹھنڈے آبِ روانِ کبیر سے پاؤں گیر ہونے کے باوجود ہاتھ گرم ہو گیا، یہ تیرے اندر کی جلن ہے یا سورج کی شعاع اندازی کا اثر؟ بے زبان

برج خاموش رہا۔ وادی الکبیر کے پل پر کسی نوجوان نے کوئی نغمہ چھیڑ دیا۔ سب کان اور نگاہیں اس کی طرف اُٹھ گئے۔

وادی الکبیر پر سب سے پہلے ابو یعقوب یوسف نے کشتیوں کا پُل بنوایا تھا۔ اب اس کے دونوں کناروں کے درمیان ربط وضبط کے لئے پختہ پُل بنا دیا گیا۔ پُل کے دوسری طرف کے گھروں اور دُکانوں کو دُور ہی سے دیکھنے سے احساس ہوتا ہے کہ پُل ماضی اور حال قدامت اور جدّت کے درمیان رابطہ کا وسیلہ ہے۔ عرب کہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے وادی الکبیر خاص طور پر اشبیلیہ کے لئے بنایا ہے۔ مسلم دور میں اشبیلیہ اہم ترین تجارتی بندرگاہ تھی۔ وادی الکبیر کے کنارے صنعت وشعر کا مرکز تھے۔ اہل صنعت نے ان کناروں پر پانچ ہزار کارخانے قائم کر دیئے تو اہلِ سخن نے کئی ہزار شعر کہہ ڈالے۔ انہی کناروں پر کی خچر ہانکنے والی لونڈی ایک مصرع کہہ کر حکمران کے دل کی حکمران ہوگئی تھی۔ پوری غزل یا قصیدہ کہنے والوں کی خوش بختی کس سے کم ہوگی۔ اب لوگ ان کناروں پر شعر نہیں کہتے دوسروں کے شعر گا کر سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ وہی وادی الکبیر وہی اس کے کنارے، کناروں پر حُسن آوارہ پھر لوگ اب یہاں شعر کیوں نہیں کہتے؟ شعر و سخن والوں کے انجام کی وجہ سے؟ چارلس نے دریا کے کنارے کنارے پھولوں کی کیاریوں کے درمیان کھیلتے بچوں کی طرف اشارہ کیا۔ خالد کپڑے جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''اب تو آپ کو یقین آ گیا ہوگا کہ بیوی بچّوں کے امتحان میں اس کی کارکردگی کافی اچھی ہے''۔ چارلس نے اپنے تھیلے سے کچھ پرنٹ نکال کر خالد کے حوالے کر دیئے۔

''اب اجازت دیں مَیں ایک گھنٹہ تک ہوٹل آ رہا ہوں۔ آپ نے گھر کا کھانا کئی دنوں سے نہیں کھایا ہوگا؟'' خالد نے سُورج کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔

''کھانے کا تکلف آپ نہ کرنا مجھے سفر کے دوران گھر کے کھانے سے پرہیز بتایا گیا ہے ویسے وقت ملے تو آ جانا۔''

''اُسے گھر سے وقت کے علاوہ اور ملتا ہی کیا ہے؟ آپ خواہ مخواہ منع کر رہے ہیں اگر اس کا بس گھر پر موجود ہوا تو شاید وقت بھی نہ ملے اس کے کپڑے کون استری کرے گا''۔ چارلس موڈ میں تھا۔

مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میری وجہ سے ان کا بزنس متاثر ہُوا۔ مَیں نے دونوں سے شکریہ کے

ساتھ اجازت مانگی۔ چارلس نے جانے سے معذرت کر دی۔ ''ان لڑکیوں کو پتہ چل گیا کہ آپ مور ہیں تو کوئی مصیبت پڑ جائے گی۔ مَیں آپ کو خطرے میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا''۔

''پتہ چل گیا تو کیا کریں گی یہ لڑکیاں؟''

''چیختی چلاتی تھانہ میں جا کر رپٹ لکھوا دیں گی کہ وادی الکبیر کے کنارے ایک شعروں والا مور پھر رہا تھا۔ اشبیلیہ کی پولیس اور کسی کی شکایت پر غور کرے نہ کرے لڑکیوں کی شکایت پر ضرور کاروائی کرتی ہے۔'' چارلس تھیلا کندھے سے لٹکا کر وادی الکبیر کے کنارے حسن آوارہ کے جنگل میں روپوش ہوگیا۔ شعروں والے موروں کی اس شہر سے روانگی کے وقت کسی شاعر نے کہا تھا۔

''بڑی بہادری سے لڑ کر شہزادے مغلوب ہوگئے
تو وہ انہیں باندھ کر جہاز تک لے گئے
دریا کے کناروں پر ہجوم خلق تھا
بے نقاب عورتوں کے چہروں سے
دکھ اور رنج ٹپک رہے تھے
جب جہاز روانہ ہوا جدائی کا لمحہ آیا
تو کون سی درد بھری آہیں تھیں
جو بلند نہ ہوئیں
وہ کون سے آنسو تھے جو رواں نہ ہوئے
افسوس اب ہمارے لئے یہاں کیا رہ گیا ہے
اجنبی اپنا سامان باندھ لے
جو دوسخا کا مسکن تو اجڑ گیا
تو بھی یہاں سے چلا جا
اے وہ لوگو جنہیں شوق کبھی یہاں لے آئے
جنہیں تم یہاں ڈھونڈو گے
وہ تو چلے گئے ہیں

وائے افسوس ہماری کھیتیاں بارش میں جل گئیں

اوشہسوار!

اپنے زرق برق سپاہیوں

سے کہہ ہتھیار کھول دیں

اب یہ ہتھیار بیکار ہیں

مجھے نگلنے کو شیر نے اپنے جبڑے کھول دیئے ہیں''

عبرت سے جھولیاں بھرنے والوں کے لئے ان کناروں پر بہت کچھ ہے۔ ہر لہر کبیر کے دامن میں ایک موتی ہے۔ مَیں کنارہ بحر کی طرف بڑھا۔ پرشور لہریں یک دم خاموش ہوگئیں۔ سیاحتِ بحر کے لئے لے جانے والا ایک بجرہ سامنے آ کر رُک گیا۔ خنداں و تاباں چہرے بجرے سے ساحل پر بکھر گئے۔ دوسرے بجرے کی روانگی کی گھنٹی بجی۔ ساحل پر بکھرے لوگ بجرے میں گھسنے لگے۔ ''آپ پسند کریں تو ٹکٹ خرید لوں۔ بحر اور شہر کی سیاحت سے فرحت نصیب ہوگی''۔ چارلس میرے پہلو میں کھڑا تھا۔

کنارِ کبیر ٹکٹ گھر سے اعلان کیا جا رہا تھا۔ ''اس شام کا آخری پور جانے والا ہے۔ شفق کی سُرخی قمقموں کی روشنی کبیر کی لہریں اور دونوں کناروں پر داستاں گو در و دیوار''

مجھ میں اشبیلیہ کے در و دیوار کی داستانیں سُننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ شکریہ کے ساتھ چارلس کی پیشکش لوٹا دی۔ کبیر کے دُوسرے کنارے گھنے درختوں کے درمیان پُراسرار قہوہ خانوں کی مدھم روشنیاں ایسے ٹمٹا رہی تھیں جیسے کسی جادوگر کی کٹیا کا دیا۔ کبیر کنارے تک رنگ برنگ جھنڈے لہرا کر ماحول کی پُراسراریت میں اضافہ کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا ابھی اس جھنڈ میں سے جُبّہ و دستار والا ایک کمر خمیدہ مور برآمد ہوگا اور کنارے کبیر بچھی کرسی پر بیٹھ کر عبرت نامہ اندلس کے کسی باب کی تلاوت شروع کر دے گا۔ دریا کی موجوں کو موروں کی روانگی کی داستانِ غم سنائے گا اور جب بجرہ آخری پھیرا لگا کر آئے گا اور اس پر سوار سیاح اس قہوہ خانے میں داخل ہوں گے تو وہ چپکے سے کتاب عبرت بغل میں دبا کر درختوں کے پیچھے کسی کٹیا میں روپوش ہو جائے گا۔

سورج نے اپنے چہرے پر سے لمحوں کا خون دھونے کے لئے وادی الکبیر میں غوطہ لگایا تو ہم

داستانیں ادھوری چھوڑ کر چل دیئے۔ کتاب عبرت کا اگلا ورق پھولنے کے لئے جو اشبیلیہ کی گلیوں اور بازاروں میں منتظر تلاوت تھا۔

کلیسا کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ در کلیسا کا گدا دن بھر کی آمدن سے سیاہ تمبا کو کی تلاش میں جا چکا تھا۔ شاہراہِ آئین پر ہوٹلوں کے لانوں میں دن بھر کی سیاحت سے چور سیاح مینا و جام سے محوِ کلام تھے۔ پلازہ دی ناویدا میں چارلس کو رخصت کیا۔ اس کا زندگی گزارنے کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ میرے سامنے اشبیلیہ کی گلیاں پھیلی تھیں۔ تنگ و تاریک بازار تھے۔ چھوٹے چھوٹے چوک تھے۔ ایک گلی سے گزرتے ہوئے معلوم ہوا اندرون لاہور کی کوئی چھوٹی سی مسجد بھی سیاحت اشبیلیہ کے لئے آ گئی ہے۔ اندلس کی مسجدوں کے برخلاف اس کا محراب دیوار سے باہر نکل آیا تھا۔ مَیں چلتا چلتا رُک گیا محراب باہر بازار کی طرف تھا اور دروازہ دوسری طرف میں دروازے کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن راستہ بند تھا۔ رنگین کپڑوں میں ملبوس بچے اور نوعمر لڑکے ایک سُرخ پوش گدھے کے پیچھے چل رہے تھے۔ گدھے سے آگے ایک صلیب بردار مارچ کرتا ہُوا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ مَیں بھی جلوس کے ساتھ چلنے لگا۔ ایک چوک دو چوک تین چوک جب جلوس ایک کلیسا کے دروازے تک جا پہنچا تو مجھے یاد آیا کہ ابھی کچھ سامان خورد بھی خریدنا ہے۔ اشبیلیہ میں بھی ہر کوچہ و بازار میں سامان نوش عام ہے۔ اب کوئی رہنمائی کرنے والا بھی نہ تھا کہ کیا خریدیں اپنی رہنما بُک نکالی جس پر ایسی اشیاء خورد کی ایک فہرست تھی جن سے مسلمانی خطرہ میں نہیں پڑتی۔ بازار بازار گھوما۔ کہیں کچھ نہ ملا۔ ابن عربی کی گلیوں میں گھومتے نصف رات گزرنے کو تھی۔ فروٹ کی ایک دکان سے حسب توفیق خریداری کی اور ہوٹل کی تلاش میں چل دیا۔ اشبیلیہ پہلا شہر تھا جہاں میں راستہ نہیں بھولا۔ غرناطہ اور قرطبہ میں شہر گردی میں کوئی رہنما اور شہر آشنا ساتھ ہوتا تھا۔ خالد کو بال بچے پالنے اور چارلس کو زندگی گزارنے بھیج دیا تھا۔ اندھیری گلیوں میں چلتے ہُوئے احساس ہوتا تھا ابھی کوئی کسی کونے سے نکل کر سامنے آ جائے گا اور حیرانی سے پُوچھے گا۔ آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں؟ ہوٹل کے استقبالیہ پر ایک چٹ ملی۔ خالد اور اس کا سسر اتنی دور سے ملنے آئے تھے اور مایوس لوٹ گئے تھے۔ انہوں نے صبح آنے اور مسجد دکھانے کے بارے میں بھی لکھا تھا مگر مَیں تو ویران مسجدیں دیکھنے آیا ہُوں۔ آباد مسجدیں اپنے ملک میں تھوڑی ہیں۔

داستاں در داستاں

پلازہ نیوا میں اُترے تو صبحِ بنارس منتظر تھی ہر طرف کے کوچہ و بازار رنگین ہو رہے تھے۔ شام اودھ کا داستانی حُسن اور اب صبح بنارس کی مہک قلبِ بازار میں اُترتی قہوہ خانوں کی میزوں پر ملک ملک کے رنگ برنگ سیاح چہک رہے تھے۔ قہوہ کے ایک ہی کپ میں وہ پورے اشبیلیہ کی سیاحت مکمل کر جاتے۔ میں پورے سفر میں اہل یورپ کا فن سیاحت نہ سیکھ سکا۔ کوچہ کوچہ پھرا گوشۂ تنہائی نہ ملا۔ رفاقتِ وقت کی ناپائیداری مسافتِ سیاح کی وسعت آخر سڑک ہی پر مزین ایک کرسی پر ڈیرا جمالیا۔ بیروں پر آرڈر اس انداز میں برس رہے تھے جیسے منکرین پر آسمانوں سے پھٹکار وہ ظالم پھر بھی مسکرا رہے تھے۔ وہ دوڑتے پھرے، مَیں بیٹھا رہا کسی بہرے کی نظرِ کرم کا منتظر وہ آیا تو ناشتہ کی اسپینی ساتھ چھوڑ گئی۔ شاید اسے پہلے بھی بے زبان گاہکوں سے شرف ملاقات حاصل ہو چکا تھا۔ اپنی کم سن انگریزی میں حاضر مال کی فہرست لہک لہک کر گانے لگا۔ ''شہد، توس اور ٹی اون لیچے'' ایمان اور جیب کے تحفظ کا یہی نسخہ مناسب لگا وہ بھاگتا ہوا گیا اور ''چٹ منگنی پٹ ویاہ'' کی سی برق رفتاری سے میز آباد کر کے گھوم گیا۔ جلدی تو تھی لیکن اتنی بھی نہیں۔ القصر کا دروازہ کھلنے میں ابھی خاصی دیر ہوگی۔ ایسا نہ ہو دربان تندیٔ شوق سے خرابیٔ نیت کی فال لے۔ جب درِ عمارت اور قافلۂ سیاحت ایک ساتھ کھلیں تو مسافر نقشِ آواز پر چلتا چلتا ہر پہنچنے کے قابل مقام تک خود بخود پہنچ سکتا ہے۔ مَیں نے چائے چسکنے کی رفتار سلو کر دی لیکن ایک کپ کب تک ساتھ چلتا سیاح پانچ شعروں کی غزل سا طویل اپنا اپنا کلام مکمل بھی نہ کر پائے تھے کہ بل ادا کر کے مشاعرہ گاہ سے نکل بھاگا۔

شفاف شاہراہِ آئین پر شبِ رفتہ کے قدموں کے نشان ابھی تک باقی تھے۔ اہل اشبیلیہ شبِ گزشتہ کے تھکاوٹ آلود خمار سے صبح رنگ و بو میں ابھی واپس نہیں لوٹے تھے۔ تنگ گلیاں اور طویل بازار بڑھ بڑھ کر ایسے استقبال کرنے لگے جیسے جنم جنم کے منتظر تھے۔ بلا کہے القصر کے گیٹ تک پہنچا دیا۔ گیٹ کیواڑ پھلائے منتظر تھا۔ ٹانواں ٹانواں سیاح اور درجنوں ویو کارڈوں سے مسلح گوریلے ایک سے جان چھڑاتے تو دوسرا مسافر نوازی پر اُتر آتا۔ گیٹ سے گزر جانے ہی میں عافیت تھی۔ قدیم اور عظیم دیوار قصر باہر سے خستہ حال تھی اندر کی طرف رنگ سنگ پر غالب دیکھا۔ مُسلم دور کی قلعہ نما دیوار سر تا قدم سبز پوش ملی۔ اس کے سبز پیراہن میں لاتعداد رنگ برنگ پھول ٹانکے تھے۔ حال نے ماضی کے مزار پر اس کثرت سے پھول چڑھائے تھے کہ اس کی سنگینی گلاب کی پنکھڑی محسوس ہوئی۔ اسی عالمِ سنگ و رنگ میں کھویا تھا کہ پسِ دیوار شور اُٹھا۔ در قصر پر کوئی قافلۂ سیاحت اُتر آیا تھا۔ ویو کارڈ بیچنے والوں کی فوج بحرِ سیاحت میں تنکوں کی مانند ڈول رہی تھی۔ قہقہوں کا طوفان گیٹ سے اندر آیا تو وسیع لان میں فکرِ پریشان کے لئے جگہ نہ رہی اپنی اپنی ٹولیاں الگ الگ کہانیاں رنگ حسن اور افسانے سب کے الگ الگ۔

اشبیلیہ کو عظمت و رفعت کی بلندیوں پر مسلمانوں نے پہنچایا مگر گائیڈ اس کی کہانی نواح اشبیلیہ کے کھنڈرات سے شروع کرتے ہیں جو دو عدد رومن شہنشاہوں کی پیدائش کے ذمہ دار ٹھہرائے جاتے ہیں۔ اونچی فصیل میں مقید القصر کا تنِ خاکی نیم مسلم، روح اور بنیادیں مکمل طور پر مسلم، استحکام نظم کی منزل میں اس شہر اور قصر کو بپتسمہ دینے کا فیصلہ ہوا تو اینٹ پتھر کا خراج مدینۃ الزہرا کے ملبہ سے وصول کیا گیا۔ مسلم فنِ تعمیر سے مرعوب عیسائی حکمرانوں نے جذبۂ تعمیر کی تسکین پر مسلمان انجینئر لگائے اسی وجہ سے ماہرین اشبیلیہ کے القصر کو قرطبہ کے طرزِ تعمیر کی توسیع قرار دیتے ہیں، وہی نفاست وہی جلال آمیز کمال محرابوں اور کھڑکیوں کی جالیاں تک خط کوفی کے سانچوں میں ڈھلی ہیں۔

عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر کی شہادت کے بعد مسلم اندلس کا دارالحکومت قرطبہ منتقل ہو گیا تو بھی اشبیلیہ کی اہمیت کم نہ ہوئی۔ صنعت اور تجارت کے فروغ نے ثقافت اور نفاست کی توسیع سے اس کی اپنی انفرادیت قائم رہی۔ طوائف الملوکی کے دورِ عذاب میں شہر اور صوبے مرکز سے ٹوٹ

ٹوٹ گرے تو اہل اشبیلیہ نے رسم وفا نبھائی، ہشام المویدکے ایک سردار اور فقیہہ قاضی اسماعیل کے فرزند ارجمند قاضی ابوالقاسم محمد کے پاس پانچ صد سواروں کا دستہ تھا جس میں تین سو عیسائی سوار تھے۔ خاندانی دولت ذاتی فراست اور امراء کی سازش قاضی ابوالقاسم کی علاقائی حکومت کے بنیادی اجزاء بنے۔ بنوعباد کی اس حکومت کا آخری حکمران اس کا پوتا معتمد ہُوا۔ اس مقام پر القصر بنوعباد کے دَور میں تعمیر کیا گیا تھا، القصر کی اکثر کہانیوں کا مرکز یہی خاندان ہے۔ مسلمانوں کے اخراج پر فرڈیننڈ نے اشبیلیہ کو عیسائی اندلس کا دارالحکومت بنایا۔ مسلمانوں کی بچی کھچی سلطنت کے خلاف مؤثر جنگ کے لئے عیسائیوں کا مرکزِ قوت واقتدار ان سے قریب لازم تھا۔ پدرو ظالم کے دور تک اشبیلیہ دارالحکومت رہا۔ اس قصر کے در و دیوار عیسائی حکمرانوں کے ظلم اور عیاشی کی سینکڑے داستانوں کے چشم دید گواہ ہیں لیکن گائیڈ سیاحوں کو صرف مسلمانوں کی داستانیں ہی سناتے ہیں۔

بنوعباد کی رکھی بنیادوں پر عیسائیوں کے نئے سرے سے تعمر کردہ القصر میں مسلمانوں کے زوال اور عیسائیوں کے عروج کی داستان درداستان کی ورق گردانی کریں تو پُر راعبرت نامہ اسلام مرتب ہوسکتا ہے۔ زوال مرکز کے بعد مسلم اندلس کی درجن بھر ریاستوں کی باہمی قبائلی اور نسلی لڑائیاں عیسائی اندلس کی ریاستوں کا بے پناہ جذبۂ ''جہاد'' آپس میں لڑتے لڑتے جب وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہوتے تو ان کے اتحاد اور ''جہاد'' کی بنیاد مذہب ہو جاتی تھی۔ مسلمان آپس کی لڑائیوں میں عیسائیوں سے اتحاد کرتے کوئی علاقہ نذر کرنے کے وعدہ پر ان سے مدد لیتے۔ دوسرے مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی مدد کرتے مسلمانوں کے ایسے ''جہاد'' کی بنیاد خودغرضی رہی۔ اسی جرأت ایمانی کی بدولت مسلم اندلس کے ہر ٹکڑے کا ''امیر'' کسی نہ کسی عیسائی حکمران کا باج گزار ہوگیا۔ عیسائی ہر سال خراج میں اضافہ کرتے جاتے ہر بار خراج نہ اَدا کرنے پر کسی علاقہ یا شہر پر بڑھ کر قبضہ کر لیتے اور من مانی شرائط منوا کر واپس جاتے۔ ذاتی ذلت اور رسوائی کے اسی اجتماعی مقام پر ایک بار مسلمان حکمرانوں کو خدا یاد آ گیا تھا۔ انہوں نے افریقہ کو آواز دی۔ خداپرست یوسف بن تاشفین سے مدد کی مشترکہ درخواست کرتے وقت دِین کو اپنی سازشوں اور خودغرضی اور عیسائیوں کے صدیوں پرانے جذبۂ انتقام سے درپیش خطرہ سے آگاہ کیا۔

یوسف بن تاشفین عیسائیوں کو عبرتناک شکستیں دے کر واپس لوٹا ہی تھا کہ مسلمان حکمران پھر سے ایک دوسرے کے خلاف میدان ''جہاد'' میں نکل آئے۔ علماء اور عوام نے بڑھتے ہوئے خطرات اور باہمی انتشار پر یوسف بن تاشفین کو پھر سے آنے کی درخواست پیش کر دی۔ اندلس کے شاہ ولی اللہ کی دعوت اور اندلس اور افریقہ کے فقیہوں کی مشترکہ اپیل پر یوسف بن تاشفین نے ایک بار پھر سمندر میں گھوڑے ڈال دیئے اس دفعہ مسلمان حکمرانوں نے عیسائیوں سے امداد کی درخواست کی انہیں پہلے سے بھی زیادہ خراج اور شہر پیش کرنے کے عہد و پیمان باندھے لیکن امداد پہنچنے سے پہلے ہی یوسف بن تاشفین کے جرنیل نے اشبیلیہ پر قبضہ کر کے معتمد اور رمیکیہ کو مراکش کے لئے عزم سفر کر دیا۔ آخری دم تک ''میں پریشان ہوں پریشاں ہے مری تدبیر بھی'' گنگنانے کے لئے۔

''ایک صبح سورج کی کرنیں وادی الکبیر کی شفاف سطح پر اتریں تو ملکہ رمیکیہ نے اپنی خوابگاہ کی کھڑکی سے پردہ ہٹا دیا۔ کنارِ کبیر اس کی ہم جنس خواتین اور سابق ہم پیشہ عورتیں اینٹیں بنانے کے لئے پاؤں سے مٹی گوندھ رہی تھیں ملکہ رمیکیہ کے اندر کی خوابیدہ لونڈی جاگ اُٹھی''۔ گائیڈ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر معتمد کی ملکہ رمیکیہ کی نقل اتارتے ہوئے آہیں بھرنے لگا۔ ''کیا ہوا ڈارلنگ بتاؤ مَیں تمہاری خوشی کے لئے کیا کر سکتا ہُوں''۔ معتمد اپنا دیوان سنہری میز پر رکھ کر اس کے سامنے دوزانو جھک گیا۔ گائیڈ مائیوں کے قدموں میں پڑا تھا ان میں سے ہر ایک اپنے کو ملکہ رمیکیہ سمجھ رہی تھی۔ القصر کی ملکہ کے آنسوؤں کی کہانی پر سیاحت کی ہر ملکہ قہقہے بکھیرنے لگی۔

''مَیں تمہارے اس شاہی محل میں قید سے تنگ آ گئی ہُوں'' رمیکیہ نے روتے ہوئے کہا ''کتنی خوش بخت ہیں وہ آزاد لڑکیاں جو کنارِ کبیر پاؤں سے مٹی گوندھ رہی ہیں۔ میرے پاؤں مٹی گوندھنے کو ترس گئے ہیں''۔ ''معتمد نے اس صحن میں کافور، عنبر، مُشک اور شکر کے ڈھیر لگوا دیئے ان سب کو آمیختہ کر کے عرق گلاب سے نرم کیا گیا جب آمیختہ ریشم کی مانند ملائم ہوگیا تو معتمد نے آواز دی ''ڈارلنگ ذرا اپنے روپہلی پاؤں سے یہ مٹی تو گوندھ دیں مَیں اپنے دیوان خاص کی اندرونی دیواروں پر لیپ کرانا چاہتا ہُوں'' ملکہ رمیکیہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ مشک اور عنبر کے ڈھیر میں گود پڑی اور گھنٹوں اسے روندتی رہی، جس طرح بچپن میں اپنے آقا کے لئے وہ مٹی گوندھا کرتی تھی،

معتمد اس کھڑکی سے اپنی ملکہ اور اس کی سہیلیوں کو مشک وعنبر کو گوندھتے دیکھتا رہا۔''

پھر وہ رُک گیا ''آپ کو کچھ اندازہ ہے مشک وعنبر گوندھنے کے اس شاہی کھیل پر کتنی رقم خرچ ہُوئی تھی؟''

''اتنی ہی جتنی کولمبس نے امریکہ دریافت کرنے پر خرچ کی تھی'' ایک آواز آئی۔ ساری ٹولی نے مشترکہ قہقہہ لگایا۔

''ذرا اس سے دریافت تو کریں ماریہ پدیلہ کا تالاب کدھر کو تھا؟'' میں نے پاس کھڑے انگریز سیاح سے کہا۔

''وہ کون تھی؟''

''آپ کے شہنشاہ ہنری چہارم کی نانی اماں۔''

''آپ مجھے ماریہ پدیلہ کے تیراکی کے تالاب کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں'' اس نے اپنی ٹوپی بلند کرتے ہوئے مداخلت کی۔

''تالاب آپ کے ہوٹل میں موجود ہوگا تیراکی کا شوق وہاں پُورا کر لینا فی الحال رمیکیہ کے پاؤں کی آواز سُنیں یہ آپ کو کہیں اور نہیں ملے گی۔''

بوڑھے نے ایک بار پھر ٹوپی ہلائی مگر کسی نے کوئی توجہ نہ دی۔

پدرو ظالم کی متعدد باقاعدہ اور بے قاعدہ بیویوں میں سے ایک ماریہ پدیلہ بھی تھی۔ شاہ اندلس کی خوشنودی کا ایک وسیلہ خواتین کا تحفہ بھی تھا ایک وزیر نے شاہ کو وہ تحفہ میں پیش کی تھی اور پھر ماریہ کی خوشنودی کی خاطر پدرو ظالم نے وزیر موصوف کو قتل کروا دیا تھا۔ جب وہ تالاب میں جلوہ افروز ہوتی تو شاہ وامراء کناروں پر مؤدب بیٹھ جاتے وہ بدن نچوڑتی تو وزراء اس کے جسم کو چھوئے ہوئے پانی سے گلاس بھر بھر اس کا جام صحت نوش کرتے۔ فروغ سیاحت کے نکتہ نظر سے یہ کہانی رمیکیہ کے پاؤں کی آواز سے کسی طور کم دلچسپ نہ ہوتی مگر القصر میں کسی گائیڈ نے سیاحوں کو یہ کہانی نہ سُنائی۔

کسی قوم کا دامن داغ شکست سے آلودہ ہو جائے تو اس کے عظمت وجلال کی داستانیں دامن تاریخ سے ڈھل جاتی ہیں۔ تاریخ فاتحین کی داستان شجاعت اور مفتوحین کی رُسوائی کی کہانیوں

کا نام ہے۔ تاریخ بھی شاعروں کی مانند اہلِ مقدر ہی کا ساتھ دیتی ہے۔ یہ وہ قصیدہ ہے جس کا شاعر قافیہ ردیف کا بھی پابند نہیں۔

دارالبنات کی نازک اندام محرابیں اور منقش دیواریں فنِ تعمیر کے اس سفر کا درمیانی پڑاؤ ہیں جو قرطبہ کے مدینۃ الزہرا سے شروع ہو کر غرناطہ کے الحمراء میں ختم ہوا۔ یہ قصر عیسائی حکمرانوں کی ذاتی رہائش اور حفاظت کی بدولت نہایت عمدہ حالت میں ہے۔ ایک وسیع وعریض ہال میں ایک محترمہ آلتی پالتی کی پوزیشن لئے منقش چھت کی تصویر کشی کے مراحل میں تھی، اس کا سالخواہ ہمسفر پاس ہی دوزانوں جھکا ہوا تھا، یورپی سیاحوں کے ہجوم کے درمیان ایک نوجوان جاپانی جوڑا ایسے پشیمان پھر رہا تھا جیسے اس سے کسی شدید جرم کا ارتکاب ہو گیا ہو۔ مَیں حُسنِ تعمیر، ماضی کی مہک حال کی چہک میں ایک کونے میں پڑے صوفے میں دھنس گیا۔ ''آپ ہماری تصویر بنا دیں گے؟'' جاپانی نوجوان نے اس انداز میں سرگوشی کی جیسے اعتراف گناہ کر رہا ہو۔

کیمرہ سمجھا کر وہ ایک محراب سے لپٹ گئے۔ فلیش کھلی تو ایسے آہستہ سے مسکرائے جیسے صبح دم ویرانے میں کلی چٹختی ہے۔ اپنا کیمرہ وصول کر کے کسی درخواست کے بغیر ہی نوجوان نے میرا کیمرہ تھام لیا اور میری تیاری سے پہلے ہی بٹن دبا دیا ''یہ ہماری طرف سے'' اور مَیں ان کی طرف سے ہال کی دیواروں کا حصّہ بن گیا۔ ایک ہال کی دیواریں سرتاقدم ریشم پوش تھیں۔ نرم ونازک پیرہن پر نازک اندام پھولوں کی بجائے جنگ وجدل کے کرخت مناظر بنے تھے مسلمانوں اور عیسائیوں کی جنگوں کے مناظر جن میں عیسائی فنکاروں کے لئے ہر تصویر میں عیسائی سورماؤں کو کامیاب وکامران دکھانا پڑا تھا۔ تاریخ کی مانند فن کی بھی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ مسلمانوں سے لڑائیوں کے بعد کی لڑائیاں بھی حریر وپرنیاں کی زبان سے بیان کی گئی تھیں۔ سیاح فن کی داد دے کر فن آشنا ہونے کے دعوے دائر کرتے پھر رہے تھے۔ مَیں القصر کو اپنی آنکھوں سے اپنی مرضی سے دیکھنا چاہتا تھا۔ دیواروں سے اُوپر نظر کی تو ایوان کی چھت پر جگہ جگہ سنہری جالے نظر پڑے، ابوالقاسم، معتضد، معتمد، رمیکیہ، ابوعمار ہر کسی نے اپنے گرد الگ سنہری جالا بن رکھا تھا، خوفناک دانتوں زہریلے پنجوں والے بڑے بڑے مکڑے ان پر جھپٹنے کے لئے بڑھے آتے تھے اور وہ سب اس سب کچھ سے بے نیاز اپنے اپنے جال میں پھنسے مسکرا رہے تھے۔

سیاح ہاتھوں میں کھلی کتابیں لئے نہایت انہماک سے ان کی تلاوت فرما رہے تھے ایک ورق کی گردانی مکمل کر کے اگلی تصویر اور دیوار کے مطالعہ میں غرق ہو جاتے جیسے بقیہ عمر عزیز کا آج ہی ٹکٹ خرید لائے ہوں۔ کوئی انگریزی داں گائیڈ پاس سے لیکچر بکھیرتا گزرتا تو القصر سے وابستہ کوئی نئی داستان دامن گیر بلکہ کان گیر ہو جاتی۔ ایک صاحب اپنی ٹولی کو معتمد کے دوست، غمگسار، مشیر اور حاجب ابوعمار کی المناک موت کے حادثہ سے آگاہ کر رہا تھا جسے اسی محل میں کسی جگہ معتمد نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا تھا اور جس کے جسدِ خاکی پر کھڑے ہو کر ملکہ رمیکیہ نے طنز آمیز مسکراہٹیں بکھیری تھیں۔ یہیں کہیں معتمد کے والد معتضد نے اپنے ولی عہد کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا تھا، باپ قتلِ پسر کے بعد سفر مرگ میں تیز تیز قدم رکھنے لگا تھا اور بیٹا قتلِ دوست کے بعد سفر زوال پر تیز گام ہو گیا تھا۔ اشبیلیہ کی افسانوی بزم نشاط کے تین کردار معتمد، رمیکیہ، ابوعمار، ایک اسی محل میں قتل ہوا دو مراکش کے بندی خانے میں گمنامی کی موت مرے۔ یہ انجام نشاط؟ یہ منزلِ عیش؟ موت سے قبل محل کے بندی خانہ میں بند ابوعمار شعر لکھ لکھ کر اپنے ماضی کی یادیں تازہ کرتا تھا معتمد کو اپنی پچیس سالہ بے مثال دوستی کی یاد دلایا کرتا تھا۔ کبھی عیش و نشاط کے گزرے لمحوں کے ساتھ مشترکہ محفلوں کا حال لکھتا رہا۔ ماضی کے لوٹ آنے کے خواب دیکھا کیا اور پھر معتمد مراکش کے قید خانہ میں بند اندلس سے آنے والی ہواؤں میں پیام نشاط اور تخت و تاجِ رفتہ کی واپسی کی مہک تلاش کرتا رہا۔ خواب جو کبھی حقیقت نہ ہو سکے نہ ابوعمار کے نہ معتمد کے۔

''تو اپنی بیٹیوں کو چیتھڑوں میں جسم چھپائے فاقوں مرتے دیکھ رہا ہے
وہ مفلس اور محتاج ہیں
بہت قلیل روزی کے لئے سُوت کات کات کر زندگی بسر کر رہی ہیں
محنت و مشقت سے تھکی
نظریں جھکائے
میری بیٹیاں مجھ سے عید ملنے آئی ہیں
جو مشک اور کافور پاؤں سے روندتی ہوئی چلتی تھیں
آج کیچڑ بھری گلیوں میں ننگے پاؤں پھرتی ہیں

ان کے خشک رخسار جن پر آنسوؤں کے نشاں ہیں
ان کی مفلسی کے گواہ ہیں
غموں کی اس عید پر (خدا نہ کرے کہ تجھے ایک اور عید دیکھنی پڑے)
جس طرح تو نے روزہ افطار کیا ہے
اسی طرح تیرے دل نے بھی آج روزہ کھولا ہے
مدّت سے دل میں پوشیدہ غم آج تجھ پر پھٹ پڑا ہے
کل تیری زبان سے جو حکم نکلتا تھا اسے سب بجالاتے تھے
اور آج تو سب کے حکموں کو بجالانے والا ہے۔
بادشاہ جو اپنی شان عظمت پر غرور کرتے ہیں
وہ ایک رویائے باطل سے دھوکہ کھاتے ہیں''

گائیڈ معتمد کی عظمت و شان پر لیکچر دینے لگا تو میرے ذہن میں بندی خانہ کی عید پر لکھے اس کے اشعار تازہ ہو گئے تھے۔ بادشاہوں کو ہمیشہ رویائے باطل سے دھوکہ کھانے کے بعد ہی اس کا احساس کیوں ہوا؟ ایک بادشاہ کے دھوکہ کھانے سے دوسرے بادشاہ نے عبرت کیوں نہ پکڑی جسم اشبیلیہ کے القصر میں تھا فکر اغمات کے بندی خانہ میں جانکلی معتمد کا جسم اغمات میں مقید رہ جاتا اور فکر اشبیلیہ کے القصر میں واپس آ جایا کرتی تھی۔ محل میں بندی خانے کی یاد اور بندی خانے میں محل کی سیر سیاحی اور شاہی میں کتنا فرق ہے۔

سلطان یوسف ابنِ یعقوب کی خواب گاہ میں پہنچے تو غرناطہ کے غدار امیر ابوسعید کی موجودگی کا احساس ہونے لگا اس خواب گاہ میں رات بسر کرنے والا وہ آخری مسلمان تھا۔ صبح پدرو ظالم نے اسے گدھے پر بٹھا سوئے مقتل روانہ کر دیا تھا۔ پدرو ظالم نے ماریہ پدیلہ کے لئے الگ خواب گاہ بنوائی اور مسلم دور کی یہ خواب گاہ شاید ابوسعید کی شب آخریں کے لئے محفوظ رکھی تھی۔

القصر میں ایک جج کی بھی تصویر ہے جس کے قتل کا سہارا لے کر فلپس دوم نے اپنے جدِّ امجد کو ''ظالم'' سے ''عادل'' ثابت کرنے کی شاہانہ کوشش کی تھی اس کوشش میں شاعروں اور ادیبوں نے بھی مقدور بھر اس کی مدد کی تھی لیکن تاریخ اندلس میں اس کے مظالم کی اتنی زیادہ داستانیں محفوظ

ہیں کہ تاریخ نے ظالم کو عادل بنانے کی مساعی ناکام بنادیں۔ پدرو نے بادشاہ بنتے ہی اپنی سوتیلی ماں کو قتل کروایا۔ اسی القصر میں اپنے وزیر کو قتل کروا کر لاش کھڑکی سے باہر سڑک پر پھینک دی۔ محل کے زنان خانہ میں اپنے بھائی کو اپنی نگرانی میں قتل کروایا۔ اپنی منکوحہ بیوی کو برسوں شہر شہر کی جیلوں کی سیر کرائی طلیطلہ کے شرفاء نے اس پر اظہار ناراضگی کیا تو پدرو نے شہر میں قتل عام کا حکم جاری کر دیا تو رو کے شرفاء کو اسی جُرم میں ایک کھلے میدان میں جمع کیا اور اپنی والدہ محترمہ کو چشم دید گواہ بنا کر تہ تیغ کر دیا۔ ماں بیٹے کے انصاف کے صدمہ سے بے ہوش ہوگئی اور اسی صدمہ میں ہمیشہ کے لئے اس کا ساتھ اور سلطنت چھوڑ کر چلی گئی۔ اہلِ کلیسا اپنے بشپ کے قتل سے اس قدر خوفزدہ ہو گئے کہ پدرو کے حکم پر دینِ مسیح میں اس کی مرضی کی ترمیم کر ڈالی اور اسے اپنی مرضی کی ایک اور شادی کرنے کا فتویٰ جاری کرتے وقت اس کی پہلی شادی کو ہی ناجائز قرار دے دیا۔

معتمد کے والدِ محترم ایک بار رندہ کے بربر حاکم کے ہاں مہمان ہوئے۔ امیر نے اپنے مہمان کے اعزاز میں محفلِ نشاط برپا کی۔ معتضد خمار کا بہانہ کر کے اونگھ گئے۔ نسلی اور لسانی نفرتوں نے مسلم اندلس اور اس کی روایات کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ ایک بربر سردار نے عرب امیر کو محوِ خواب پایا تو مشورہ دیا ''اس موٹے دُنبے کی گردن پر چھری چلا دو'' حاضر سرداروں نے مشورہ کی داد دی۔ اس کے سیاسی فوائد بیان کئے۔ ایک بربر سردار نے مہمان نوازی کی بربر روایات کا واسطہ دے کر معتضد اور روایات کو بچالیا۔

ہنگام رخصت معتضد نے جملہ بربر سرداروں کو جوابی مہمان نوازی کی دعوت پیش کی جو قبول کر لی گئی۔ کچھ عرصہ بعد رندہ کے ساٹھ بربر سردار اس دعوت پر اشبیلیہ آئے۔ معتضد نے ان کی خوب ٹہل سیوا کی۔ محفلِ نشاط سے قبل سب حمام شاہی میں غسل سے لطف اندوز ہونے کے لئے لے گئے تو معتضد نے ان میں سے معز ابنِ قرئ کو کسی بہانے روک لیا جب مہمان شاہی حمام میں تھے تو معمار شاہی اس کے گرد دیواریں چُن رہے تھے۔ حمام میں تازہ ہوا کے تمام راستوں کے سامنے دیواریں اُٹھ چکیں تو داخلہ کا دروازہ مقفل کر کے بھاپ کے تمام پائپ کھول دیئے گئے۔ پدرو ظالم نے ابوسعید کے ساتھی سرداروں کے سر غرناطہ بھجوا دیئے تھے۔ معتضد نے اپنے سٹیم روسٹ مہمانوں کے سر کٹوا کر القصر کے پائیں باغ کی روشوں کے دو طرف گملوں میں سجا دیئے

تھے۔ عرب مردانگی میں ہی نہیں مہمان نوازی کی اپنی روایات میں بھی بربروں سے پیچھے رہ گئے تھے۔ ساٹھ مہمانوں میں سے صرف معز ابن قرئ زندہ بچے۔ جان کا بدلہ جان۔ معتضد نے نیند کے بہانے سرداروں کے مشورے اور معز ابن قرئ کے دلائل سب سُن لئے تھے۔ گائیڈ یہ کہانی مکمل کر چکا تو ہم پائیں باغ کی روشوں پر جا نکلے جہاں ہر سمت سروں کا احساس ہوتا تھا۔

صحرانشینوں نے جنت اندلس میں ہر مقام پر تصورات کی جنت زمین پر منتقل کر دی تھی۔ ہر کہیں اپنے ہاتھوں اپنے لیے جنت بنالی تھی۔ اُمید جنت نہ رہے راہ جنت نہ ملے استطاعت بھی ہو تو انتظارِ جنت کون کرے؟ خدماتِ کلیسا کے باوجود صلیب برداروں کو بھی شاید یقین جنت افلاک نہ تھا، عربوں کی جنت کو بپتسمہ دے کر اسی میں ارضی خواہشات کی تکمیل میں لگ گئے۔

القصر کا حسین و جمیل پائیں باغ روحوں کا مقامِ فغاں اور جسموں کا ہنگام نشاط ہے اس کی زیارت کے بغیر اشبیلیہ کی سیاحت مکمل نہیں ہوتی۔ تکمیلِ سیاحت کی خاطر سیاح اس کی رعنائیوں میں گم ہو جاتے ہیں دو اصحاب عربی میں تبادلۂ حیرت کر رہے تھے۔ ماضی کے عرب حال کی سیاحت کو آئے ہیں یا حال کے عرب ماضی کی سیاحت میں گرفتار ہیں؟ اندلس میں مسلم تعمیر کے فن عجیب پر یونیسکو ایک بین الاقوامی کانفرنس کی خواہش رکھتا تھا اس نے ان دونوں مصری ماہرین فن کو اپنا ماضی اور اپنے اجداد کا ذوق تعمیر سمجھنے اندلس بھیجا تھا۔ ایک چھوٹی سی عمارت کے قریب وہ چلتے چلتے رُک گئے۔ ''معلوم ہوتا ہے یہ بھی کبھی مسجد ہوگی''۔

''جبین نیاز تو قبلہ رُخ ہے، باقی ماہرین عمارات آپ ہیں''۔

''نہ ہوتے تو بہتر نہ تھا؟''

''وہ کیوں؟''

''تب ایک دُکھ ہوتا اب دوہرا درد ہے''۔

وقت دورِ نشاط کی سی تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ اندلس کے لعلِ احمر، اشبیلیہ کی تراش خراش میں فکر و کمالِ مسلم کے کتنے ہی ابواب ابھی باقی تھے، ماہرین تعمیر کو آغوشِ کمال میں چھوڑ کر جنت سے ایک بار پھر رخصت ہُوا۔

اندلس کے ہر اس شہر میں جو مسلمانوں کے عروج سے آشنا ہوا القصر کے پہلو میں ایک

یہودی محلّہ اب تک موجود ملتا ہے۔ یہودیوں کی قربت اقتدار اور مسلمانوں کی خواہش انصاف کا ثبوت۔ یہودیوں پر اقتدار کی برکتیں جس قدر مسلم اندلس میں نازل ہوئیں عیسائی امریکہ میں بھی نہ ہوسکیں۔ سفارت کاری حساب داری وزارت تک کے اعلیٰ مناصب پر وہ ہر جگہ فائز رہے لیکن جب مسلمان زوال نصیب ہوئے تو عیسائیوں کے زیر سایہ یہودیوں نے ان نوازشات کا خوب خوب بدلا چکایا۔

اسی شہر اور القصر میں شاہِ قشتالیہ کے وفد کے یہودی سربراہ کو قشتالیہ کے باجگزار معتمد نے اس کی گستاخی کی سزا دی تھی۔ شاہ قشتالیہ کی قوت اور اپنی اس سے وفا کے زعم میں ابنِ شالیب کو شاید یاد نہ رہا کہ معتمد میں عربی حمیت ہو نہ ہو عربی انا ابھی باقی ہے۔ معتمد نے ابن شالیب کو اس کے ساتھیوں سمیت زندان خانہ میں پہنچایا تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اس نے اپنے خاکی جسم کے ہم وزن سونے کے بدلہ میں جان کی امان کی درخواست کی۔ معتمد کو سونے کی اشد ضرورت تھی۔ خراج کے سکوں میں ملاوٹ پر ہی جھگڑا ہوا تھا اس کے باوجود اس نے ابن شالیب کے سر کو سونے پر ترجیح دی ''خدا کی قسم اب تو اپنی جان کے بدلہ میں تمام ملک اسپین اور ملک مغرب بھی پیش کرے تو قبول نہ کروں گا''۔

القصر کے دامن میں پرانا یہودی محلہ سیاح سیاح ہو رہا تھا۔ ذہن فرنگ دانشِ یہود سے اتنا مرعوب ہے کہ کسی چٹان پر یہودی ہونے کا الزام لگا دیں تو سیاح اس کے چکر کاٹتے کاٹتے دم توڑ دیں گے۔ طوطا چشم اور سانپ فطرت یہود نے زوال مسلم پر خدمت کلیسا کو ایمان بنالیا تھا۔ اہل کلیسا اہل اسلام کی مانند صادق القلب کب ہُوئے؟ یہودیوں کی مدد سے مسلمانوں کو ختم کیا۔ مسلمان نہ رہے تو خود یہودیوں کی باری آ گئی۔ سرزمین اندلس میں ایک فرد یہود نہ رکھا۔ مصلوب یسوع کا قرض بمع سُود در سُود وصُول کیا۔

رومن کسی شہر کا خاکہ تیار کرتے تو میدان عام کو قلب قرار دیتے۔ عرب شہر بناتے تو قلبِ شہر جامع مسجد ہوتی۔ رومن شہروں کے سب بڑے راستے میدان عام کی طرف جاتے، عرب شہروں کی بڑی سڑکیں جامع مسجد پر ختم ہو جاتیں۔ رومن رائے خواصہ کا اظہار میدان عام میں کرتے۔ مسلم رائے عامہ کا مرکز مسجد ہوتی۔ وہ شاہوں اور محلوں کے فیصلوں کی تائید و تردید میدان

عام میں کرتے مسلم شاہ محلوں کے فیصلوں کی توثیق کے لئے جامع مسجد کا رُخ کرتے۔ رومن شہروں میں بازار عام شہر کے کسی اور حصّہ میں ہوتا تھا۔ عرب شہروں کے بازار خواص و عام جامع مسجد کے اردگرد رکھے جاتے تھے، دین اور دُنیا کی قربت شہر سازی میں بھی پیشِ نظر رہتی تھی اس کے بعد رہائشی محلے بناتے، اونچی دیواریں تنگ گلیاں تاکہ جلوت خلوت میں دخل اندازی نہ کر سکے۔ میں یہودی محلّہ سے نکل کر اشبیلیہ کی تنگ رہائشی گلیوں سے ہوتا ہُوا میدان جامع اشبیلیہ میں نکل آیا۔ امیر موحدین یوسف ابو یعقوب کی تعمیر کردہ جامع اشبیلیہ کے در پر جواب دُنیا کا تیسرا سب سے بڑا کلیسا ہے۔ فرڈیننڈ نے غرناطہ کے مسلمان حکمران کی مدد سے اشبیلیہ پر قبضہ کیا تو پہلے محل میں نہیں جامع مسجد گیا تھا۔ مینار مسجد پر صلیب چڑھا کر اسے کلیسا قرار دیا۔ سجدۂ یسوع ادا کیا۔ مذہبی فتوحات کی رسومات ادا کر کے دنیاوی محل کی طرف گیا تھا۔ اندلس میں عیسائی حکمران سدا مسجد کے خلاف لڑے اور مسلم حکمران محلوں کا دفاع کرتے رہے۔ نہ محل بچے نہ مسجدیں۔ مینارہ مسجد کے قدموں میں کھڑے ہو کر بانیٔ مسجد کے عزم کی بلندی کا جائزہ لینے لگا تو گردن دوہری ہوگئی۔

امیر یوسف ابو یعقوب نے مینار جامع اتنا بلند رکھا کہ قصر کی ہر کھڑکی سے سامنے رہے۔ سیاح اشبیلیہ کے کسی بھی حصّہ میں ہوں، مینار نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ تین صد فٹ بلند عظیم الشان مینار جامع اب بھی اشبیلیہ کا سرناواں ہے۔ جس طرح ایفل ٹاور پیرس کا سرناواں ہے۔ قطب مینار دہلی سے بھی باسٹھ فٹ بلند مینارِ جامع اشبیلیہ فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ آپ ایک بھی زینہ چڑھے بغیر تین سو فٹ بلندی تک پہنچ جاتے ہیں۔ چوکور مینار کی کشادہ سلامیوں پر چلتے چلتے۔ چل نہ سکیں تو گھوڑے پر سوار ہو کر اوپر چلے جائیں۔ سلامی پر دو گھوڑے برابر چل سکتے ہیں لیکن اب درِ مینار پر گھوڑے نہیں ملتے ٹکٹ بکتے ہیں۔ کھڑکی کے سامنے سیاحوں کی لمبی قطار تھی۔ سیاحتی تھیلے اور کیمرے لٹکائے وہ قدم قدم آگے بڑھ رہے تھے لیکن نظریں اُوپر تھیں۔ مَیں نے بھی گردن اُٹھا کر چلنے کی کوشش کی کامیابی نہ ہوئی۔ ٹکٹ مینار جامع کا مانگا، کھڑکی والے نے جیرالڈا کا ٹکٹ تھما دیا۔ جیرالڈا مینار کو نہیں متحرک کو کہتے ہیں۔ اہل کلیسا نے مینار کی بلندی پر اپنے ایمان کا فرشتہ ٹانگ دیا ہے جو ان کے خیال میں اہل شہر کے ایمان کی گھوم پھر کر حفاظت کرتا ہے، چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی کے اصول پر کاربند ہے۔ اہل اشبیلیہ اپنے ایمان کے فرشتہ کی ان حرکتوں کی بنا پر مینار ہی کو جیرالڈا

کہنے لگے ہیں۔قدم قدم منزل اور منزل منزل پڑاؤ معلوم نہیں کتنی صدیوں میں اُوپر پہنچا کتنے سیاحوں سے منزل میں واسطہ پڑا۔ مینار ختم ہوگیا۔ چاروں طرف دُور دُور تک اشبیلیہ ہی اشبیلیہ تھا۔ باغات، پارک، شادابی حسن ورعنائی اور درمیان سے پیلتا ہوا گزرتا وادی الکبیر۔علامہ شقندی نے اندلس کے اس خطہ ارض کی شادابی سے متاثر ہوکر کہا تھا''اشبیلیہ ایک جنگل ہے مگر اس میں درندہ نہیں اس کا دریا رودِ نیل ہے مگر اس میں نہنگ نہیں''۔اشبیلیہ کے جنگل کے درندے سے پاک ہونے والی بات علامہ شقندی نے فرڈیننڈ کے قبضہ اور پدرو ظالم کے دور سے پہلے لکھی تھی۔

وادی الکبیر سے پرے فرڈیننڈ آہن پوش سواروں اور صلیب پوش پادریوں کے جلوس کے ساتھ مسجد کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔جلوس کے آگے ایک سنہری صلیب تھی۔ والئ غرناطہ ابن الاحمر اپنے دستہ کے ساتھ سر جھکائے اشبیلیہ سے دُور ہوا جا رہا تھا۔ وہ مڑ مڑ مینار مسجد، ہزاروں، لاکھوں فرزندان اشبیلیہ کو اشبیلیہ سے خارج ہوتے اپنے حلیف فرڈیننڈ کو جامع کی طرف بڑھتے دیکھتا تو اس کی گردن اور بھی جھک جاتی۔اشبیلیہ کا ایک فاتح سربلند ایک فاتح سرزدہ، ایک کو فتح ملی ایک کو مفتوحین۔ اشبیلیہ سے اخراج کے بعد مسلمانوں کے لئے صرف دو ہی ٹھکانے تھے۔غرناطہ اور افریقہ۔ساڑھے پانچ سو سال تک اس شہر کو عزت وعروج دینے والے ذلت اور زوال کی گٹھریاں اپنی کمروں پر اُٹھائے چلے جا رہے تھے۔تو ابن الاحمر نے اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے کہا" و لا غالب اللّٰہ" اللہ کے سوا کوئی فتح مند نہیں۔اور پھر یہی تسلی ان کے خاندان کا نعرہ بن گئی۔

اڑھائی سو سال بعد فرڈیننڈ نام ہی کے ایک اور شاہ قشتالہ نے ابن الاحمر کے خاندان کے آخری وارثِ غرناطہ کو خارج شہر وسلطنت کیا تو وہ بھی اپنے دل کی تسلی کے لئے یہی کہتا ہوا رخصت ہوگیا۔"و لا غالب اللّٰہ"۔

سقوط اشبیلیہ شاید اتنی جلد نہ ہوتا اگر آلِ ہود چشمِ بینا اور دل دردآشنا رکھتی، خواہش دنیا میں دین فروش نہ ہوتی۔اقتدار کے لالچ میں مواحدین سے سرکشی نہ کرتی اور ابن الاحمر غرناطہ کو بچانے کے لئے اشبیلیہ کی بربادی میں فرڈیننڈ کی مدد نہ کرتا۔سولہ ماہ کے طویل محاصرہ کے دوران فرڈیننڈ نے اتنی جسمانی اور روحانی محنت کی کہ عیسائی مؤرخوں کے مطابق یہی جسمانی اور روحانی تھکاوٹ اس کی موت کا سبب بنی۔فرڈیننڈ نے زندگی دے کر کلیسا کا فتح اشبیلیہ کا خواب پورا کیا تھا۔جنگلے

کے ساتھ چمٹے سیاح نے معلوم نہیں کیوں مجھ سے پوچھا''آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟''

''پاکستان سے''

''آپ اکیلے ہی ہیں؟''

''ہاں۔''

''اتنی دور اکیلے؟''

''آپ کہاں سے آئے ہیں''۔مَیں نے اس کا سوال لوٹا دیا۔

''امریکہ سے''اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔

''امریکہ سے اتنی دُور سے؟''مَیں نے اسی کی سی حیرانی سے پوچھا۔

''لیکن میرے ساتھ تو یہ ہیں، ہمارا تو گروپ ہے، باقی لوگ ابھی القصر میں ہیں''۔

مَیں اس کے پہلو میں کھڑی امریکن مائی کے وجود سے بھی ابھی تک بے خبر تھا۔ مائی نے گردن جھکا کر اپنے رنگین دانتوں کی نمائش کی۔

بوڑھے نے مائی کا تعارف کرایا اور بتایا کہ وہ اب تک برسرروزگار ہے اور ایک سکول میں کچھ پڑھاتی ہے وہ خود بھی کسی کالج میں کچھ پڑھاتے ہیں۔وہ دونوں بڑی گرمجوشی سے مسکرا رہے تھے اسی مسکراہٹ کے دوران بوڑھے نے اپنا کیمرہ مجھے تھما دیا اور خود جنگلے سے لگی مائی کے پہلو میں کھڑا ہوکر مسکرانے لگا۔پھر مجھ سے کیمرہ پکڑ کر مجھے مائی کے پہلو میں کھڑا کر دیا''پیچھے بل رنگ آ رہا ہے بڑا خوبصورت ویو ہے بن گئی تو لاجواب تصویر ہوگی''اس نے کیمرہ مائی کو پکڑاتے ہوئے نوٹ بک نکال لی''آپ ذرا اپنا ایڈریس لکھوا دیں مَیں یہ تصویر ضرور آپ کو بھیجنا چاہتا ہوں آپ کو یاد رہے گا کہ کبھی ہم جیرالڈا پر ملے تھے''اس نے خود ہی اپنے کارنامہ کی داد دینے کے لئے قہقہہ لگایا۔

''مَیں تو کبھی جیرالڈا پر نہیں گیا۔''

وہ تھوڑا سا پریشان ہُوا۔''میرا مطلب ہے.....''

''جیرالڈا تو وہ اوپر مصلوب ہے یہ تو جامع اشبیلیہ کا مینار ہے''

''آئی ایم سوری، آئی ایم سوری اس کے اوپر تو ہم چڑھ بھی نہیں سکتے''اس نے اپنے فرشتہ ایمان کو

دیکھتے ہوئے معذرت کی۔

''وہ نیچے آپ نارنجیوں کا پاتھیو نہیں دیکھ رہے بالکل جامع قرطبہ جیسا ہے'' مائی نے گردن نہوڑائے ہوئے کہا۔

اور ہم تینوں جامع اشبیلیہ کے نارنجیوں کے میدان کو دیکھنے لگے۔ قطار اندر قطار سرسبز پودے لیکن جامع قرطبہ کے نارنجیوں کے صحن کی مانند وہاں سیاحوں کا ہجوم نہیں تھا۔ جامع قرطبہ کے قلب میں کلیسا نصب کیا گیا تھا، جامع اشبیلیہ کو مکمل طور پر گرا کر اس جگہ فخرِ مسیحیت کلیسا بنا دیا گیا۔ صرف مینارہ مسجد ایک دروازہ اور نارنجیوں کا صحن بچا کر کلیسا سے منسلک کر دیئے گئے ہیں۔

کولمبس کا نئی دُنیا کا سفر بھی مذہبی سفر تھا، وہ مذہب کا راستہ بھول گیا اور امریکہ جا نکلا۔ ہند کے مسلمانوں کو جبری عیسائی بنانے کی بجائے اس نے امریکہ کے سیاہ فام مالکوں کے گلے میں سفید یورپ کی غلامی کی صلیب ڈال دی جسے وہ نہ تو اتار سکتے ہیں نہ اُٹھا کر سیدھے چل سکتے ہیں۔ اندلس کی آخری مسلم ریاست غرناطہ پر قبضہ کرنے والے میاں بیوی کیتھولک حکمرانوں سے کولمبس نے درخواست ہی کی تھی کہ سپین کے بعد آپ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اسی طرح عیسائی بنائیں مَیں راستہ ڈھونڈ آتا ہوں۔ آپ تیاری کریں۔ ہماری خوش قسمتی اور ریڈ انڈینز کی بدقسمتی سے وہ ہندوستان کا راستہ بھول گیا۔ کلیسا نے پھر بھی اس کی خدمات مسیحی کا کلیسا کے دروازے کھول کر اعتراف کیا۔ کولمبس کو اسی کلیسا کے اندر دفن کیا گیا تھا۔ کلیسا میں ایک لاٹ پادری جی مصائب مسیح بیان کر رہے تھے۔ سامنے بنچوں پر بیٹھے ٹانویں ٹانویں خواتین وحضرات کافی دکھی موڈ میں تھے۔ اتنے بڑے پادری کا لیکچر سننے اور اتنا بڑا کلیسا گھوم پھر کر دیکھنے کے لئے حوصلہ تھا نہ خواہش کلیسا کے نوادرات کے شعبہ کا سرسری چکر لگا کر باہر آ گئے۔ الفانسو دہم کی قبر پدرو ظالم اور ماریہ پدیلہ کے کفن بھی اسی کلیسا میں ہیں۔ ایک سو سال سے زائد مدّت میں مکمل ہونے والے اس کلیسا کا خاکہ تیار کرنے والے نے شاہ وقت سے کہا تھا کہ ایسا کلیسا بنائیں کہ آنے والی نسلیں ہمیں پاگل قرار دیں۔ عیسائی حکمران سو سال تک یہ کلیسا بناتے رہے اور یہ بھی پوچھتے رہے کہ کلیسا کا نقشہ بنانے والے واقعی پاگل تو نہ تھے؟

''دیکھو یہ اکیلا ہی اتنی دُور آ گیا ہے''۔ کلیسا پر امریکی جوڑے نے اپنے گروپ کے دیگر

ارکان کو نہایت دکھ کے ساتھ بتایا۔ بعض نے ان کے بیان کی صحت پر شبہ کیا اور بعض نے میری دماغی حالت پر شک کیا چند ایک نے اظہار ہمدردی بھی کیا اور ''ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو ہم حاضر ہیں'' کے رویہ کا اظہار بھی کیا۔ ''شکریہ آپ تو گذشتہ اڑتیس سال سے میرے پُورے ملک و قوم کی خدمت کر رہے ہیں، اشبیلیہ میں بھی آپ ہی خدمت کریں؟ کسی اور کو بھی خدمت کا موقع دیں''۔

''اور کون ہے ہمارے سوا کسی کی مدد کرنے والا'' ایک بوڑھا مسکرایا۔

''ایک اسپینی نوجوان ہے وہ اپنا جذبۂ خدمت لئے ہوٹل میں منتظر ہوگا۔''

''اسپینی؟ آپ کی خدمت؟ ذرا محتاط رہنا'' وہ قہقہہ لگا کر ''کلیسا پار کر گیا۔

اشبیلیہ کی ایک گلی کو سانپ گلی کہتے ہیں۔ یہ گلی دیگر بازاروں اور گلیوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی بلدار ہے۔ زیادہ ہی تنگ ہے اس کی زیارت قدم قدم چلنا لازم ہے کوئی گاڑی کار یا سواری اس گلی میں نہیں داخل ہو پاتی۔ اس غیر کاروباری پابندی کے باوجود گلی اشبیلیہ کا بہت اہم کاروباری مرکز ہے۔ اس بازار میں کھلے عام زرمبادلہ سے جواہر وزر تک بکتے ہیں۔ بند دروازوں کے کسی قسم کے تکلف کے بغیر۔ بُل فائٹنگ کا سامان۔ اشبیلیہ کے بُل فائٹروں کے سوویئیر۔ دستکاری کے ہلکے بھاری نمونے، فٹ پاتھ قسم قسم کے نوادرات وعجائبات سے بھرے ملتے ہیں۔ اس بازار میں بل فائٹروں کے خصوصی قہوہ خانے ہیں۔ مَیں صرف زیارت کی غرض سے ہی اِدھر نکل آیا تھا ورنہ نہ جواہر کا خریدار تھا نہ پنکھے اور کنگھی کی ضرورت تھی، گلیوں کی شب آخر کی گردی بعد از شام شروع کرنا تھی۔ یہ بازار بند ہوتا اس لئے دن میں ہی نپٹا دیا۔

لُٹ گئی فقیروں کی کمائی

نیلی پوش آسمان سبز پوش زمین چمکدار دھوپ اور فٹ بال میچ، ٹیلی ویژن سیٹ کے سامنے بیٹھا بابا حالتِ وجد میں تھا، کسی کھلاڑی کی اچھی ہٹ یا بہتر موو سلوموشن میں دکھاتے تو اس کی بوڑھی آنکھوں میں جوانی لَوٹ آتی۔ ہوٹل کے ہال میں ٹیلی ویژن سیٹ کے سامنے بابا جی کے علاوہ دو بچے اور تھے، وہ شرارت کے موڈ میں ہوتے تو بابا جی ایسے گھورتے جیسے بوڑھا شیر اپنے بچوں کو سنہری نظروں سے دیکھے۔ اس کے خشوع وخضوع سے اندازہ ہوتا تھا کہ جوانی فٹ بال کے سبز میدانوں میں گزری ہے۔ مَیں نے دودھ والی چائے کی پیالی ختم کی تو بابا جی نے مسکرا کر قریبی نشست کی پیشکش کی۔ اشبیلیہ کے در و دیوار پر لگے بُل فائٹنگ کے رنگین پوسٹروں اور ٹکٹ بیچنے والوں کے ہاں ہجوم سے اندازہ ہوتا تھا کہ جوڑ کانٹے دار ہوں گے۔ اندلس کے دیگر شہروں پر اشبیلیہ کی بزرگی اور برتری کی وجوہ میں اس کے کھردرے سانڈوں کے ریوڑوں، بُل فائٹروں کی پُروقار انفرادیت اور لا مائٹرانزا بُل رنگ کا بھی خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ دِ کلیسا پر تشریف فرما جرمن نوجوان کی ہدایت پر مَیں نے گزشتہ شام ہی ٹکٹ خرید لیا تھا اور لا مائٹرانزا کے خونی سفر پر روانہ ہونے سے پہلے چند لمحے گزارنے ہوٹل آ گیا تھا۔ جیرالڈا کی بلندیوں پر سے امریکی سیاح نے بُل رنگ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا تھا کہ سبز درختوں والی سڑک پر چلتے جانا۔ فٹ بال گراؤنڈ کے چاروں طرف سبز درخت بار بار سبز درختوں والی سڑک کی یاد تازہ کر دیتے ہیں لیکن انسان اور حیوان کے مقابلے شروع ہونے میں ابھی دیر تھی۔ زبان یار من سپینش اور اپنے سپینش نمی دانم کی وجہ سے بابا جی سے آنکھوں اور اشاروں میں ہی مذاکرات ہو سکتے تھے لیکن ہم میں

سے کوئی بھی اتنے حسین اور رنگین میچ کے دوران اس بدعت کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کی شفقت اور سیاح نوازی کا گر اسیا ادا کر کے باہر چلا تو استقبالیہ پر نوجوان نے ایک بار پھر بل رنگ کا راستہ سمجھاتے ہوئے بڑے دکھی انداز میں بتایا کہ وہ آج کی فائٹ نہیں دیکھ سکے گا۔ بوڑھا فٹ بال سے وقفہ نہیں کر سکتا اور کوئی اس کی ڈیوٹی دینے والا ہے نہیں۔

ہوٹل سے باہر آیا تو گویا سب راستے ہی بُل رنگ کی طرف جا رہے تھے۔ سیاحت کے موسم بہار کے باوجود سڑک پر جانے والوں کی اکثریت مقامی تھی۔ سبز درختوں والی سڑک بُل رنگ کے پاس سے ہو کر وادی الکبیر کی طرف نکل گئی۔ بل رنگ کے پھاٹک ابھی بند تھے۔ ایک رضا کار کی مدد سے اپنا دروازہ تلاش کیا، اور بند پھاٹک کا نمبر پڑھ کر مرکزی دروازے کی طرف چلا گیا۔ چست وردیوں میں ڈھیلے ڈھالے پولیس والے ٹرکوں سے نکل نکل کر اپنی ڈیوٹی کے مقامات کی طرف جا رہے تھے۔ بڑے دروازے کے سامنے کافی رونق تھی۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور موٹی موٹی خواتین بسکٹ ٹافیاں چاکلیٹ بل فائٹنگ کے رنگین پوسٹر ماتادر کی رنگین تصاویر والے ویو کارڈ لئے پھر رہے تھے۔ سب سے زیادہ گاہک ایک موٹی سیاہی آمیز ادھیڑ عمر خاتون کی چھابڑی پر تھے۔ سودا بیچنے کے درمیان وہ کبھی کبھی ایک خاص آواز لگاتی جاتی تھی جسے سُن کر ارد گرد کھڑے سب نوجوانوں کی توجہ اس کی طرف ہو جاتی تھی۔ بیشتر نوجوان اس کی طرف چل دیتے۔ پولیس جا چکی تو چند معززین کی گاڑیاں آئیں۔ معززین کے برآمد ہوتے ہی مرکزی دروازے کی کھڑکی کھل گئی اور اس کے ساتھ ہی بل رنگ میں داخلہ کا اذن عام ہو گیا چھابڑیوں پر خریداری کرنے والے لڑکوں نے سیٹیاں بجائیں۔ موٹی چھابڑی والی نے ایک بار پھر اپنی مترنم آواز سے ماحول کو اپنے مال کی طرف متوجہ کیا۔ سیٹیاں بجانے والے لڑکوں نے مشترکہ قہقہہ لگایا اور چھابڑی والی کے موٹے سیاہ ہونٹوں پر باریک سنہری مسکراہٹ پھیل گئی۔

بل رنگ کے اندر ڈیوٹی دار نے ٹکٹ دیکھ کر مخصوص روٹ تک رہنمائی کی۔ معزز تماشائیوں اور منتظمین کی گیلریاں ہمارے بائیں ہاتھ ذرا بلندی پر تھیں۔ داخلہ کے دروازوں پر ہجوم سے اندازہ ہوتا تھا۔ کہ بل رنگ میں سیٹیں پُر ہو چکی ہوں گی اور ہمیں جلدی سے دوزخ میں ''وڑنا'' پڑے گا۔ لیکن اپنی نشست پر بیٹھ کر باہوش ہوئے تو بل رنگ کی وسعت کا اندازہ ہُوا۔ کہیں کہیں ٹانواں

ٹانواں فرد ہی دکھائی دیا۔ پولیس، انتظامی، رضا کار، آئس کریم، چپس اور مشروبات بیچنے والے البتہ کافی تعداد میں تھے اور خالی سیٹوں کے درمیان بڑی آزادی سے گھوم پھر رہے تھے۔ بُل رنگ کے درمیان جہاں انسان اور حیوان کا ئید ھ پڑنے والا تھا، سُرخ ریت بچھا کر اس پر پانی چھڑکا جا رہا تھا۔ بُل رنگ میں پُراسرار خاموشی تھی۔ ہمارے سامنے والی گیلری میں درجن بھر خواتین اس خاموشی کو توڑنے کی پوری کوشش کر رہی تھیں لیکن گیلری ہم سے کافی دور تھی۔ کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ ہم پر ہنس رہی ہیں یا انتظامیہ پر ناراضگی کا اظہار کر رہی ہیں۔ رضا کار کسی کے غصّہ ناراضگی سے بے نیاز آنے والوں کی رہنمائی کا فرض ادا کر رہے تھے۔ جن میں بوڑھے جوڑوں کی تعداد معقول حد تک تھی۔ خمیدہ کمر بوسیدہ لباس، پھولی سانس، بغل میں کپڑے یا چمڑے کی گدی بعض کو تو عملاً اٹھا اٹھا کر ان کی نشستوں میں رکھنا پڑ رہا تھا۔ دائیں ہاتھ صدارتی گیلری کے عین سامنے سانڈ گیٹ تھا جس کے اوپر کی گیلری میں نقارہ و طبل والے ساز جمائے بیٹھے تھے۔ بل رنگ کی گول، اونچی چار دیواری سے اوپر نیلا فلک اور نیچے سرخی مائل ریت کا بستر میں نے کیمرے کی آنکھ پر سے سیاہ پردہ ہٹایا اور بینڈ باجے والوں کا نشانہ لینے لگا تو میرے دائیں طرف بیٹھے سمارٹ نوجوان نے مشورہ دیا۔ ''بہتر ہے آپ فلم بچا رکھیں چھ فائٹوں کے لئے آپ کو بہت فلم کی ضرورت ہوگی''۔

''مَیں قتل سے پہلے انتظاماتِ قتل کا بھی ریکارڈ رکھنا چاہتا ہُوں۔''

''آپ مقتولین کا کیس لڑنے جا رہے ہیں''۔ وہ مسکرایا۔

''آپ ابھی سے قاتلوں کے دفاع کی کوشش میں ہیں۔ فیس میں ٹکٹ ہی ملا ہے یا کچھ اور بھی؟''

میں نے اندازہ کیا نوجوان سے بات چیت چل سکتی ہے۔

''یہ پیشہ ور قاتل ہیں ان سے تو اپنا دفاع کرنا چاہئے۔''

نوجوان نے بتایا کہ وہ میڈرڈ یونیورسٹی میں سماجی علوم کے اُستاد ہیں۔ اشبیلیہ چھٹی گزارنے آئے ہیں، بل فائٹ کی وجہ سے رات بھر سفر کرنا پڑے گا ورنہ عام طور پر وہ ایسی ٹرین پکڑتے ہیں جو انہیں رات کو میڈرڈ پہنچا دے۔

''ان بزرگوں کو کون سی چیز گھر بیٹھنے نہیں دیتی، آپ نے تو کوئی تجزیہ کیا ہوگا''۔ مَیں نے گرتے پڑتے بوڑھے جوڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

''بل فائٹ سے جوان اور بوڑھے یکساں طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بوڑھے یاند اور ماتادر کو بہتر داد دیتے ہیں۔ نوجوانوں کی نسبت وہ کھیل کو بہتر سمجھتے ہیں''۔ وہ میری یا اپنی انگریزی کی ناتوانی کی وجہ سے میرا مطلب سمجھ نہیں سکا۔

مشروب فروش کو میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مَیں ''بہادر'' نہیں۔ اس نے ٹھنڈے مشروب کا ٹن میرے ہاتھ میں تھما دیا اور دُوسرا ٹن میری سیٹ کے سامنے رکھ کر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ شاید کہہ گیا ہو کہ دل گھبرائے تو یہ پی لینا۔

تماشائیوں کی گیلریوں میں حاضری دیکھ کر صدارتی ایوان بھی آباد ہو گیا۔ بگل والوں نے بگل بجا کر خاندانِ صدارت کی تشریف آوری کا اعلان کیا۔ اکھاڑے میں چھڑکاؤ کرنے والے فرشِ ریت کی سلوٹیں نکالنے والے اور ہٹو بچو والے اپنا اپنا بوریا بستر لپیٹ اکھاڑہ کے گرد لگی لکڑی کی سرخ حفاظتی دیوار کے پیچھے جا چھپے۔ سانڈ کے خوف سے نہیں ماتادر کے احترام میں۔ اب ماتادر کا جلوس اکھاڑے میں آ رہا تھا۔ جلوس سے پہلے سُرخ کلغیوں والے دو گھوڑ سوار داخل ہوئے، دم کٹے سفید گھوڑے، گھوڑوں کی دُموں کے بقایا جات سے بھی طویل تر سواروں کی کلغیاں سیاہ وردیاں گلے میں بڑے بڑے سفید رومال اور سروں پر طویل سُرخ کلغیوں والی چھجا نما سیاہ ٹوپیاں اکھاڑے کی پُوری لمبائی طے کرنے کے بعد وہ صدارتی چھجے کے نیچے جا کر رُک گئے۔ صدر اور سواروں کے درمیان اشارہ کنایہ میں مذاکرات ابھی ختم ہی ہوئے تھے کہ ماتادر کا جلوس اکھاڑے میں داخل ہو گیا۔ سب سے آگے چُست سنہری وردی میں ملبوس ماتادر اس سے پیچھے اس کے معاونین ان کے پیچھے دو دو کی قطار میں چلتے ہوئے چھ عدد گھوڑ سوار سفید پینٹ اور سُرخ جیکٹ میں ملبوس، گھوڑے بھاری زرہ بکتر پہنے ہوئے تھے۔ چھ سات انچ موٹے پلان گھوڑوں کی چھاتی اور پورے جسم کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ صرف پاؤں، کمر گردن اور دم غیر محفوظ تھی جو پلان کے نیچے سے نکال کر اُوپر لٹکا دی گئی تھی۔ جیسے ترکی ٹوپی کا پھندنہ ایک طرف جھول رہا ہو۔ محفوظ گھوڑوں کے پیچھے چھ عدد غیر محفوظ کھچروں کو ہانک رہے تھے جو دو دو کی جوڑی کی صورت میں باندھے تھے۔ ہر جوڑی کے پیچھے رسا سے کچھ بندھا آ رہا تھا۔ جلوس نے اکھاڑے کا چکر لگایا۔ کھچروں کی صرف چہرہ نمائی کر کے ایک دروازے سے باہر نکال لے گئے۔ پریڈ میں وہ سب سوار اور پیادے شامل

تھے جو سانڈھ کے قتلِ عام میں کوئی کردار ادا کرنے والے تھے۔ وہ جدھر سے گزرتے خواتین و حضرات تالیاں پیٹ پیٹ کر بے حال ہو جاتے۔ گردشِ جلوس کے بعد سب نگاہیں ایک نقطہ پر مرکوز ہو گئیں یہ نقطہ وہ نہیں تھا جو محرم کو مجرم بنا دیتا ہے بلکہ اکھاڑے کا وہ دروازہ تھا جہاں سے شہنشاہ حماقت داخل ہونے والا تھا جس کے استقبال کے لئے یہ سب تیاریاں تھیں۔ رسم شاہانہ کے مطابق ورودِ سانڈ کا بگل بجا بجا اعلان کیا گیا۔ اتنے زیادہ تالیاں بجانے والے خواتین و حضرات کو دیکھ کر اکڑے ہوئے سانڈ صاحب اور بھی اکڑ گئے۔ حسن، جوش اور قوت کا غرور موصوف استقبال کرنے والوں کو بھی کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگے وہ اس انداز میں چل رہے تھے جیسے کائنات ان ہی کے سینگوں پر ٹکی ہے وہ چاہیں تو دھرتی کے نیچے سے اپنا سینگ کھینچ کر سب کچھ اوپر نیچے کر دیں۔ اپنے موٹے نتھنوں سے ہوا کے پھوارے چھوڑ چھوڑ کر وہ محفوظ نشستوں میں بیٹھے تماشائیوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہجوم خلق کے درمیان تنہا کھڑے سانڈ کو شاید سمجھ نہیں آیا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا جس در سے بگل کی آواز پر تالیوں کی گونج میں وہ تشریف لائے تھے وہ سختی سے بند ہو چکا تھا سانڈ اس صورت حال پر ابھی غور ہی کر رہا تھا کہ ایک طرف سے سُرخ رومال کی جھلک پڑی۔ دیوار کے پیچھے سے نکل کر ایک نوجوان اکھاڑے میں اُترا اور رومال لہرا دیا۔ جس سانڈ کو سر عام قتل کرنا مقصود ہو وہ اس کو بچپن ہی سے ہر سُرخ چیز پر جھپٹنے کی تربیت دیتے ہیں۔ سانڈ بلا سوچے نوجوان کی طرف دوڑا۔ اس سے پہلے کہ سانڈ سینگ تانے نوجوان پھرتی سے گھوم کر لکڑی کی دیوار کے پیچھے چلا گیا۔ سانڈ اس بزدلی کا طعنہ بھی نہ دینے پایا تھا کہ اکھاڑے کے دوسرے کنارے ایک اور نوجوان نے سُرخ رومال اچھال دیا۔ اب باری باری نوجوان مختلف سمتوں سے نکلتے اور رومال لہرا کر حفاظتی دیوار کے پیچھے چلے جاتے۔ سانڈ کبھی ایک پر جھپٹتا کبھی دوسرے کی طرف دوڑتا پر مگر رابطہ کسی سے بھی نہ کر پاتا۔ ایک دفعہ تو غصہ میں اس نے پوری قوت سے دیوار کو ٹکر دے ماری مگر دیوار اس کے غصہ کو سامنے رکھتے ہوئے بنائی گئی تھی۔ قہر سانڈ بھر جان سانڈ۔ جب سانڈ حضرت انسان کی بزدلی سے کافی بوکھلا گیا تو ایک گھوڑ سوار اکھاڑے میں داخل ہو گیا۔ انہی زرہ بکتر سے آراستہ گھوڑوں میں سے ایک پر سوار۔ سانڈ اچھلا شاید خوشی میں کہ کسی میں تو

جرأتِ مقابلہ ابھی باقی ہے۔ جیسے ہی سانڈ گھوڑے کی طرف دَوڑا گھوڑے نے نظریں جھکا دیں۔ شاید دل میں اپنے سابقہ گناہوں کی معافی بھی مانگ رہا ہو مگر تالیوں کے شور کی وجہ سے ہم سُن نہیں سکے۔ سانڈ نے پوری طاقت سے گھوڑے کی پسلی میں ٹکر ماری لیکن پلان کی موٹائی میں اس کے تیز سینگ کوئی کام نہ دکھا سکے۔ اسی دوران گھوڑ سوار نے اپنا ہاتھ دکھا دیا۔ چمکدار نیزے کی انی پوری قوت سے سانڈھ کی گردن میں اتار دی۔ اس کی چمکدار سیاہ کھال پر سُرخ سُرخ دھاریاں بننے لگیں۔ مشتعل سانڈ سینگوں سے گھوڑے کو دیوار کی طرف دھکیلنے لگا۔ وہ جتنا زور لگاتا اتنا ہی نیزہ اس کی گردن میں مزید اُترتا جاتا۔ سانڈ پیچھے ہٹا سوار نے نیزہ نکال لیا وہ حملہ آور ہوا تو نیزہ پھر گردن میں تھا پہلے والے مراحل مکمل کر کے سوار تیزی سے گھوڑا موڑ کر خمدار راستہ سے اکھاڑے سے باہر چلا گیا۔ زخموں سے بہنے والا خون سانڈ کی گردن کے گرد جمتا جا رہا تھا۔ سُرخی اور سیاہی نے ایک دُوسرے رنگ کو اور بھی نکھار دیا۔ زخمی سانڈ کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ وہ انسان کی بزدلی اور چالاکی پر پیچ و تاب کھا ہی رہا تھا کہ اکھاڑے کی مختلف اطراف سے سُرخ رومال لہراتے تین چار نوجوانوں نے ایک بار پھر اس کی غیرت کو چیلنج کیا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے رکا۔ شاید فیصلہ کرنے کے لئے کہ پہلے کس سے نپٹے اور پھر پوری قوت سے ایک طرف شوٹ لگا دی۔ نوجوان اس کے پہنچنے سے پہلے ہی پس دیوار جا چکا تھا۔ مڑ کر دیکھا، باقی تینوں موجود تھے۔ اب زیادہ سوچنے کی فرصت نہ تھی۔ دشمن سامنے موجود تھا، سانڈ نے قریب ترین نوجوان پر حملہ کیا۔ اب کے بھی اس کی صرف دیوار سے ملاقات ہو سکی۔ آدمی مقابلے کے لئے چیلنج بھی کرے اور جب اس کا چیلنج قبول کر لیا جائے تو چوہے کی مانند بھاگ کر بل میں جا گھسے یہ کوئی مقابلہ تو نہ ہوا مگر سانڈ اس گوریلا طریق جنگ پر صرف غم و غصہ کا اظہار ہی کر سکتا تھا۔ ایک جگہ کھڑا ہو کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہمت ہے تو قریب آؤ۔ یہ اس کی غیرت اور تربیت کے خلاف تھا۔ سانڈ پہلے تو طاقت کے نشے میں سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا جب اکھاڑے میں چاروں طرف بھاگ بھاگ کر پٹھ جاتا ہے اور گردن کے زخموں سے بہت سا خون بہہ جاتا ہے تو سوچ بچار کے قابل نہیں رہتا۔ اس مرحلہ پر شاگرد رومال برداروں کا رول ختم ہو جاتا ہے اور اصل ماتادر اپنا رول ادا کرنے اکھاڑے میں اترتا ہے۔ وہ اپنی ٹوپی اتار کر صدر مقتل کو سلام کرتا ہے۔ خواتین و حضرات تالیاں پیٹ پیٹ کر

اس کے سلام کا سکوت شکن جواب دیتے ہیں۔ اب وسیع اکھاڑے میں ایک طرف زخمی سانڈ اور دوسری طرف تازہ دم ماتادر تھا۔ ایک طرف قوت غصہ اور آتش انتقام تھی اور دوسری طرف چالاکی ہوشیاری اور عیاری۔ ماتادر نے رومال لہرایا سانڈ اس کی طرف دوڑا۔ ماتادر نے دونوں ہاتھوں سے پکڑا بڑا سا رومال اپنے سامنے پھیلا دیا۔ سانڈھ نے گردن جھکا کر پوری قوت سے رومال کو ٹکر ماری۔ ماتادر کمال ہوشیاری سے پاؤں پر گھوم گیا۔ سانڈ قوت میں آگے نکل گیا۔ ناکام رہنے کے غصہ میں وہ واپس گھوما تو ماتادر پھر سے رومال دونوں ہاتھوں سے پھیلائے سامنے کھڑا تھا۔ سانڈ نے ایک بار پھر ٹکر ماری ماتادر ایک بار پھر گھوم گیا۔ تماشائی تالیاں پیٹ پیٹ کر داد دے رہے تھے۔ سانڈ پیچھے ہٹ ہٹ کر حملہ کر رہا تھا۔ بعض دفعہ ماتادر اس ہوشیاری سے رومال اپنے گرد گھماتا کہ اس کے ساتھ ہی سانڈ بھی اس کے گرد نصف چکر پورا کر کے آگے نکل جاتا۔ جب بل فائٹر نے وقفہ کرنا ہوتا تو کسی دوسری سمت سے کوئی رومال لہرا دیتا۔ سانڈ اس کی مزاج پرسی کے لئے آگے بڑھتا بل فائٹر دیوار کے پیچھے چلا جاتا اور چند سیکنڈ بعد واپس آ کر پھر سے سانڈ کو رومال سے ختم کرنے کے مشن میں مصروف ہو جاتا۔ ایک دفعہ وہ حملہ آور سانڈ کی آنکھ کا زاویہ مس کر گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سانڈ کے سینگوں سے اُوپر فضا میں تیر رہا تھا۔ یہ سب کچھ بجلی کی سی تیزی سے ہوا۔ مگر اس کے زمین پر گرنے سے پہلے ہی چاروں طرف سے نصف درجن نوجوان رومال لہراتے دوڑتے ہوئے آگے بڑھے اور پیچھے ہٹ کر ماتادر پر دوسرا حملہ کرنے کے دوران ہی میں سانڈ نے اپنا ارادہ بدل لیا اور زمین پر پڑے ماتادر کی بجائے دور لہراتے سُرخ رومال پر حملہ کرنے دوڑ پڑا۔ ماتادر زمین سے اُٹھا اپنا رومال اٹھایا۔ چاروں طرف گیلریوں میں دم بخود بیٹھے تماشائیوں کو نظروں ہی نظروں میں اپنی خیریت سے آگاہ فرمایا اور وہیں کھڑے کھڑے رومال لہرا کر سانڈ کو بھی اپنی خیریت کا پیغام دینے لگا۔ تماشائیوں کے نعروں اور تالیوں سے بُل رنگ کے در و دیوار گونج اُٹھے۔

رومال اور سانڈ کے اس مقابلے میں آخر وہ مرحلہ بھی آ گیا جب اکڑی ہوئی گردن جھک گئی۔ سانڈ بھاگ بھاگ کر حملہ کرنے کی بجائے سرخ رومال کے سامنے گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ ماتادر نے رومال ہٹا لیا۔ دونوں ہاتھوں میں چمکدار نوکیلے سروں والے تیر پکڑ کر سانڈ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال اس کی طرف بڑھا۔ سانڈ اس پر حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن ٹانگیں ساتھ چھوڑ چکی

تھیں۔ ماتادر دونوں پاؤں پر اچھلا اور دونوں تیر سانڈ کی گردن کے اُوپر کے حصہ میں گاڑھ دیئے۔ تماشائیوں نے اس کامیابی پر تالیاں بجائیں۔ ماتادر نے دو تیر مزید لئے اور اُسی انداز میں اچھل کر سانڈھ کی موٹی گردن میں گاڑھ دیئے۔

سانڈ جو اکھاڑے میں اُترتے وقت انسان کی بزدلی پر حیران تھا اب اپنی حماقت پر پشیمان ہو گا۔ اس کی سانس کی آواز گیلریوں تک پہنچ رہی تھی۔ نتھنوں سے جھاگ بہنے لگی۔ پیشاب خود بخود رواں ہو گیا۔ ٹانگیں جسم کے بوجھ کے نیچے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے گردن گھمائی اور اس دروازے کی طرف دیکھا جس سے آتے وقت اسے کائنات اپنے ایک سینگ پر ٹکی معلوم ہوئی تھی لیکن وہ دروازہ کب کا بند ہو چکا تھا۔ ماتادر نے ایک بار پھر اس کی نظروں میں نظریں ڈال کر اس کے سامنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے تیر لہرائے سانڈ نے آنکھیں جھکا لیں تیروں کی ایک اور جوڑی اس کی گردن میں گاڑ دی گئی۔

تیروں کی ہر جوڑی کے ساتھ سانڈ کی گردن جھکتی جا رہی تھی۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ پیشاب کے بعد گوبر بھی بہنے لگا تھا وہ ماتادر کے سامنے ایسے جھکا کھڑا تھا جیسے آل حود کا شکست خوردہ آخری شاہِ اشبیلیہ فرڈیننڈ کو شہر کی کنجیاں پیش کر رہا ہو۔ ماتادر نے اس کے سینگوں پر ہاتھ پھیرا وہ سر جھکائے کھڑا رہا اور اپنے وزن کو سہارنے کی کوشش میں پہلے سامنے کے گھٹنے زمین پر ٹیک دیئے پھر بے سُدھ ہو کر گر پڑا۔ ماتادر نے چمکدار تلوار نکالی اور اس کی گردن میں اتار دی۔ تماشائیوں نے تالیاں بجائیں۔ آل حود کی حماقت پر یا فرڈیننڈ کی چالاکی اور عیاری پر؟ مَیں نے پروفیسر کی طرف دیکھا، وہ بڑے جوش و خروش سے تالیاں پیٹ رہا تھا۔ ایک دروازے سے کھچروں کی جوڑی برآمد ہوئی۔ ڈرامے کا آخری سین پیش کرنے کے لئے ان کے ساتھ بھاگتے نوجوانوں نے شہنشاہِ حماقت کو رسے سے باندھ دیا۔ کھچر اسے کھینچتے ہوئے اکھاڑے سے باہر لے جا رہے تھے۔ ماتادر کشتی جیتنے والے پہلوان کی مانند اکھاڑے کا چکر لگا کر داد وصول کر رہا تھا اور سرخ وردیوں والے ڈیوٹی دار اکھاڑے میں بچھی ریت پر مزید ریت پھیلا کر مقتول کے خون کے دھبے مٹا رہے تھے تاکہ نیا ڈرامہ شروع کیا جا سکے۔

ٹھنڈے مشروب کے ٹن ختم ہو گئے۔ بُل ابھی تین ہی ختم ہوئے تھے۔ کھچر تیسرے سانڈ کی

لاش کھینچے آ رہے تھے۔مَیں نے تالیوں کی گونج میں باہر کا راستہ بنانا چاہا۔ پروفیسر نے سمجھایا کہ مَیں نے تین کا نہیں چھ سانڈوں کے قتل کا ٹکٹ خریدا ہے لیکن مجھ میں غرناطہ کے ابوعبداللہ کی روانگی کا منظر دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ جدھر سے گزرتا خواتین وحضرات کی نظریں میری طرف اُٹھ جاتیں۔ بزدل یا غیر شائستہ ان کی نظروں نے مجھے کیا قرار دیا۔مَیں سمجھ نہ سکا۔ چوتھا سانڈ بگل باجے کی آواز کے ساتھ مقتل کی طرف بڑھ رہا تھا بل رنگ تالیوں کی آواز سے ایک بار پھر گونج رہا تھا اور میں بل رنگ سے باہر آ رہا تھا۔

یورپی سیاح ہسپانوی جوڑے بے فکر نوجوان کنارِ کبیر ہجوم ملا۔شفق رنگ دریا رنگ برنگ پھول اور سب رنگ ہجوم۔بجرے آج بھی آخری پورے لے جانے کے لئے پیٹ کھولے کھڑے تھے بھونپو بجا بجا کر سیاحوں کو آبِ رواں کبیر پر غروبِ آفتاب کا نظارہ کرنے پر آمادہ کر رہے تھے۔ مَیں کنارے کبیر لہلہاتے پھولوں کی کیاریوں کے درمیان چلتا رہا۔ یادوں کی ناتراشیدہ گھاس پر آسودہ جذبوں کی پھوار پڑنے لگی۔رُوح کا فرغل ٹپ ٹپ ٹپکنے لگا۔ٹھنڈی میٹھی شام میں جسم و جان آبدیدہ ہو گئے۔سنہرے برج کا سر منہ چوم کر سنہری کرنیں غرقِ آب ہوئیں تو مصنوعی روشنی کے قمقمے جل اُٹھے۔قلب کبیر پر اترتی سیاہی نئی روشنیوں کا مُنہ چڑانے لگی۔

وہ آئے تو ان کے پاس سب کچھ تھا گئے تو اس طرح جیسے کوئی اس جہاں سے جاتا ہے۔حمیت، شجاعت، ناموس غیرت سب ہار گئے۔دونوں ہاتھ چارے کنیاں سب خالی تھے۔

ان کناروں نے انہیں آتے بھی دیکھا اور جاتے بھی دیکھا تھا۔ان کناروں کے حُسن کے گیت گانے والے ان کناروں پر فکر کے پھول بونے والے۔ان کی روانگی پر تیری آنکھ بھی نم ہوئی تھی؟ ان کی اجتماعی موت پر تو بھی رویا تھا؟ کبیر خاموش رہا لہروں کی آواز پُرسوز ہونے لگی تو دل کے ساز کے تار ڈھیلے پڑ گئے۔سیاہی اور بڑھی تو ہوا آہیں بھرنے لگی۔فضا میں آنسوؤں کی مہک بھر گئی۔یہ معتمد کی روانگی کی گھڑی اور مقام تو نہیں؟

دریا کنارے ہجوم بڑھ رہا تھا۔پورے چھ سانڈوں کے قتلِ عام کا تماشہ دیکھنے والے بھی ادھر آ رہے تھے۔بجرے آخری پورے لے کر جا چکے تھے۔آئس کریم کے سٹالوں پر بے پناہ رش تھا۔ جس وقت معتمد اور رمیکیہ روانہ ہوئے، تب بھی ان کناروں پر اشبیلیہ اُمڈ آیا تھا۔اُن کے دل حزیں

تھے، ان کے دل خوش ہیں۔

قرطبہ کے بافندوں، زرکاروں، زرداروں اور صنعت کاروں نے ردائے خلافت تارتار کی تو سلطنت بھی تار تار ہو گئی۔غرناطہ، اشبیلیہ، مرسیہ، طلیطلہ درجن بھر ریاستوں کے درجن بھر حکمرانوں میں سے ہر ایک یہی سمجھا کہ کائنات اسی کے سینگ پر ٹکی ہے۔عیسائیوں نے ان کی سرپرستی کی۔ جب وہ پل کر جوان ہو گئے تو عیسائی پہاڑوں سے نکلتے سُرخ رومال دکھا کر حفاظتی دیوار کے پیچھے چلے جاتے۔لوٹ مار، آتش زنی اور محاصرہ۔شاہ حماقت کی گردن جھک جاتی۔ خراج کے زہریلے تیروں سے گھٹنوں کے بل جھکنے کا مرحلہ آتا تو جسم و روح کا رشتہ ختم کر دیا جاتا۔ اس فتح پر عیسائی تماشائی تالیاں پیٹتے دیوانے ہو جاتے۔مسلمان میری طرح اندھیروں میں پناہ تلاش کرنے نکل پڑتے۔اہل حماقت کی لاش خچر کھینچ لے جاتے۔ایک کے بعد دُوسرے سانڈ کی باری آتی رہی۔ ہر سانڈ کا رویہ ایک سا رہا موت ایک سی آئی۔

اہلِ اندلس نے اہل اسلام کا اتنا خون بہایا کہ خون آشامی ان کی سب سے بڑی تفریح ٹھہری۔فخر اندلس اشبیلیہ میں مسلمانوں کے بعد یہودیوں کی باری آئی ان کے بعد سے سانڈ اپنا خون پیش کرتے آ رہے ہیں۔

مَیں اشبیلیہ کی تنگ نیم تاریک خون آشنا گلیوں میں نکل گیا۔گلیاں جن کے ہر موڑ پر روشن جبینوں کی یادیں دفن ہیں۔جن کے ہر پاتھیو سے آوازِ دوست سنائی دیتی ہے۔مقدر اس مدفن عظمت میں لے آیا ہے تو ہر سنگِ لوح پر فاتحہ پڑھ لیں۔

''ایک روز میں اپنی نوے سالہ روحانی ماں نونہ فاطمہ کے پاس بیٹھا تھا۔ایک خاتون آئی مجھ سے کہا کہ اس کے خاوند نے کسی دوسرے شہر میں کسی اور خاتون سے شادی کر لی ہے اور درخواست کی کہ اس کے خاوند کو واپس لانے میں مدد کروں۔مَیں نے اسے ماں جی سے درخواست کرنے کا اشارہ کیا۔خاتون کی کہانی سُن کر پوچھا کیا چاہتی ہو؟ ''اپنا خاوند''۔خاتون نے جواب دیا۔''مَیں ابھی الحمد کو اسے لانے بھیجتی ہوں''۔ پھر وہ سورۃ الحمد کی تلاوت کرنے لگیں۔مَیں بھی تلاوت میں شامل ہو گیا۔دیکھتے ہی دیکھتے سورۃ الحمد مجسم صورت میں اُبھرنے لگی۔انہوں نے الحمد کو حکم دیا فلاں شہر میں فلاں آدمی کے پاس جاؤ۔اس کا بازو مضبوطی سے تھام

لینا اور اسے یہاں لے آؤ''۔ دوسرے ہی لمحہ وہ آدمی وہاں موجود تھا۔ خاتون اپنے خاوند کو پا کر خوش تھی۔ اشبیلیہ کی گلیوں میں سوکھے ٹکڑے چننے والی نوے سالہ نونہ فاطمہ اس خوشی میں جھوم رہی تھی ''میرے مولیٰ نے میری لاج رکھ لی''۔

''تصوف کے سفر میں میری پہلی ملاقات شیخ ابوالجعفر الاریانی سے ہوئی۔ وہ ان دنوں اشبیلیہ میں تھے۔ جب پہلی دفعہ میں ان کے مکان پر گیا تو وہ ذکر میں مگن تھے۔ مَیں نے اپنا نام اور مقصد بیان کیا۔ شیخ نے کہا۔ ''اچھا تم نے اس راہ کا انتخاب کر لیا ہے''۔ میرے جواب پر حکم دیا۔ ''دروازہ بند کرو۔ اپنے آپ کو دیگر تمام بندھنوں سے آزاد کر کے صرف خدا تعالیٰ سے تعلق قائم کرو جو لامحدود برکتوں کا منبع ہے۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ بغیر کسی پردہ کے براہِ راست تم سے ہم کلام ہوں۔ اس کے بعد میں ان کی خدمت میں لگا رہا۔ یہاں تک کہ میں مراد کو پہنچ گیا۔''

''شیخ ابوجعفر بالکل ناخواندہ تھے۔ ہمیشہ بے داغ لباس پہنتے۔ ہمہ وقت قبلہ رو بیٹھے یادِ خدا میں مصروف رہتے۔ ایک روز میں شیخ کی خدمت میں حاضر تھا، ایک صاحب آئے ان کے ہمراہ ان کا بیٹا بھی تھا، سلام کے بعد کہا ''یا شیخ یہ میرا بیٹا حافظ قرآن ہے'' یہ سنتے ہی شیخ کا رنگ زرد پڑ گیا۔ انہوں نے چیخ ماری اور ان پر حالتِ وجد طاری ہوگئی کہا ''صرف غیر فانی ہی فانی کا محافظ ہو سکتا ہے۔ یہ قرآن ہے جو تیرے بیٹے اور ہم سب کا محافظ ہے۔''

''ہمارے شیخ ابوالحجاز بہت برگزیدہ ہستی تھے۔ جب تک ان کے ہاتھوں میں طاقت رہی اپنی روزی خود کماتے تھے۔ گھر میں جو بھی آتا گھر میں کھانے کو جو کچھ بھی ہوتا سب پیش کر دیتے، کبھی کچھ بچا کر نہیں رکھا۔ ان کے گھر میں ایک کنواں تھا جس سے وہ وضو کے لئے پانی لیتے تھے اس کنویں کے پاس ہی پتوں سے لدا زیتون کا ایک بہت بڑا درخت تھا۔ ایک دفعہ میرے ایک دوست نے پوچھا یا شیخ آپ نے یہ درخت کنویں کے پاس کیوں لگایا جہاں سے یہ آپ کی راہ میں آتا ہے''۔ کمر خمیدہ شیخ نے اردگرد دیکھا اور کہا۔ ''مَیں اسی گھر میں پلا ہوں واللہ آج تک مجھے علم ہی نہیں کہ یہاں کوئی زیتون کا درخت بھی ہے''۔ مَیں اور میرے احباب جب بھی گئے شیخ کو تلاوت قرآن کرتے پایا تادمِ مرگ انہوں نے کسی اور کتاب کو چھوا تک نہیں''۔

''شیخ ابوالحجاز کے پاس ایک بلّی تھی، یہ بلّی شیخ کی گود میں سوتی تھی۔ کوئی اور آدمی اُسے پکڑ

نہ سکتا تھا۔ ایک دفعہ کہنے لگے خدا تعالیٰ نے اس بلی کے ذریعے مجھے نیک و بد میں تمیز کا طریقہ بتا دیا ہے''۔ ایک روز تو میرے سامنے ایسا واقعہ پیش آیا۔ شیخ کی بلی بعض مہمانوں کی ٹانگوں سے چمٹ جاتی تھی جبکہ بعض دوسروں کو دیکھ کر دُور بھاگ جاتی تھی۔ جب شیخ ابوجعفر پہلی دفعہ شیخ ابوالحجاز سے ملنے ان کے گھر آئے تو بلی کسی دوسرے کمرے میں تھی۔ شیخ ابوالحجاز اپنے مہمان سے ''تشریف رکھیں'' کہہ ہی رہے تھے کہ بلی بھاگتی ہوئی ایک ہی جست میں پہنچ گئی۔ ابوجعفر کی گردن سے چمٹ گئی اور اپنا سر ان کی داڑھی سے رگڑنے لگی۔ یہ دیکھ کر شیخ ابوالحجاز اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور کوئی لفظ کہے بغیر شیخ ابوجعفر کو پکڑا اور اپنی نشست پر بٹھا دیا۔ جب تک شیخ ابوجعفر وہاں رہے شیخ ابوالحجاز ان کے پاس بیٹھے رہے۔ بعد میں انہوں نے مجھے بتایا کہ آج تک بلی نے کسی اور کے ساتھ اس انداز میں پیار نہیں کیا تھا۔ جتنا شیخ ابوجعفر سے کیا ہے''۔

رات گئے اشبیلیہ کی گلیوں میں گھومتے ہوئے مجھے ان گلیوں کے بارے میں شیخ اکبر کے بیان کردہ واقعات یاد آ رہے تھے۔ ابن عربی مرسیہ میں پیدا ہوئے، اشبیلیہ میں دُنیاوی اور روحانی تعلیم کی منازل کی تکمیل کی۔ فتوحات لکھ کر اس شہر کی گلیوں کو غیر فانی بنا دیا۔ مگر دُنیا دین اور روحانیت کی دولت کا خزینہ اشبیلیہ لٹ کیسے گیا؟ اس دیس میں فقیروں کی کمائی لٹ کیوں گئی؟ رات گئے میں یہی سوچتا ہوا ہوٹل کی طرف آ رہا تھا تو ایک اندھے موڑ پر ایک بلی تیزی سے کہیں سے نمودار ہوگئی چمکتی آنکھوں سے گھورا اور غائب ہوگئی ''اس دیس کے سُلطان سے بھی وہی بھول ہوئی تھی''۔ ہوا کا ایک جھونکا کان میں کہہ کر نکل گیا جو اس دیس کے دیگر سلطانوں سے ہوئی تھی۔ دھرتی کو اپنے ہی سینگ پر سمجھنے کی غلطی اور پھر سلطان کی غلطی مسلمان کی موت بن گئی۔ جس کے پاس جو کچھ تھا لٹ گیا۔

اچھا میڈرڈ پھر ملیں گے

صدیوں کی شاہانہ کوشش بھی میڈرڈ کو عبدالرحمٰن کا قرطبہ بنا سکی نہ غرناطہ۔ قرطبہ اور غرناطہ رشکِ جہاں تھے۔ میڈرڈ رشکِ سپین ہی بن سکا۔ مسلمانوں کے دارالحکومت کا تو کیا ہوتا میڈرڈ تو کسی عیسائی ملک کے دارالحکومت کا ہم پلّہ بھی نہ ہو سکا۔ مسلمانوں کے زوال کی تکمیل پر اندلس میں ان کے شہر بھی ان کے نقشِ قدم پر چل دیئے تھے ایک زمانہ تک یہ سفر مسلسل جاری رہا۔ پھر سفر معکوس کی کوششیں شروع ہوئیں مگر ماضی لوٹ کر نہ آ سکا۔ اہلِ فکر نے کہا اس زمین اور اس کے شہروں کو اپنے مہربانوں سے بے وفائی کی سزا ملی۔ مَیں سوچتا رہا ان مہربانوں نے کس سے بے وفائی کے جرم کا ارتکاب کیا تھا؟

میڈرڈ کی حسین عمارتیں سرسبز پارک اور مالا مال عجائب گھر سبھی نے دعوت دی مگر بوجھ اتنا تھا کہ قدم اُٹھتا تھا نہ خواہش دیدار بیدار ہوئی۔ عید رمضان پر گھر پہنچنا تھا۔ بقیہ اٹھائیس روز میں تین ممالک نپٹانا تھے، دو ممالک سے ازنِ رخصت حاصل کرنا تھا۔ میڈرڈ سے پھر ملیں گے، اگر خدا لایا کہہ کر سفری بیگ باندھ لیا اور مامون کی دعوت رفاقت بھی اپنے بیگ ہی میں رکھ لی۔

میڈرڈ کا ریلوے سٹیشن شہر کی مانند باقی سپین سے کافی ترقی یافتہ تھا، روشنیوں گاڑیوں اور مسافروں کی تعداد سے اس کے یورپ ہی سے متعلق ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ مَیں یہ احساس اور سامان سفر لئے ایک جگہ کھڑا رہا اور مامون سٹیشن پر ضروری بھاگ دوڑ کے مراحل طے کرتا رہا۔

''مَیں ابھی آیا'' وہ بھاگتا ہُوا آیا اور اطلاع دے کر ٹرینوں کے جنگل میں گم ہو گیا۔ مسافر بھی گم اور گائیڈ بھی گم۔ پیرس کے لئے ٹرین کی روانگی کا وقت بالکل ہی ہُوا چاہتا تھا انجانے لوگ

اپنے اپنے جانے راستوں پر دوڑے جا رہے تھے اور مجھے ستون کی مانند جامد و ساکت کھڑا دیکھ کر حیران دکھائی دے رہے تھے۔ جہاں سبھی بھاگ رہے ہوں وہاں ایک ہی ستون کے ساتھ کھڑا آدمی کافی قابلِ دید ہوتا ہے۔ ایک بڑھیا نے تو چُھو کر دیکھنے کی کوشش بھی کی کہ میں اپنی ٹانگوں پر ہی کھڑا ہُوں۔ مَیں نے 'ہسپانوی نمے دانم'' کا سہارا لیا اور وہ خاموشی سے آگے نکل گئی۔ اس کے پیچھے اور بھی پیر و جواں آ رہے تھے، مَیں ان کے مقابلے کے لئے ذہنی تیاریوں میں مصروف تھا کہ مامون بھاگتا ہوا ہی آیا اور میرا بیگ اُٹھا کر دوڑ پڑا۔ مَیں اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ جو مسافر اب تک مجھے کھڑا دیکھ دیکھ حیران ہو رہے تھے مامون کے تعاقب میں دوڑتا دیکھ کر پریشان ہونے لگے۔ اندلس میں کوئی مراکشی نوجوان دوڑ رہا ہو تو سب دیکھنے والے سمجھ جاتے ہیں کہ خیریت نہیں اور اگر کوئی غیر مراکشی اس کے پیچھے دوڑا جا رہا ہو تو پھر تو خیر خیریت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرصت ہو تو مقامی لوگ بلا دعوت اس مقابلے کی دَوڑ میں شامل ہو جاتے ہیں اور اکثر یہ مقابلہ ہار جاتے ہیں۔ ایک مراکشی نوجوان سے ایک روز مَیں نے اس بھاگ دوڑ کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا تھا کہ ہم ان سے ان کے اجداد کے مظالم کا بدلہ لینے کے لیے ایسے مقابلے کرتے رہتے ہیں۔ ٹرین کے اندر بیٹھے اور پلیٹ فارم پر بھاگتے خواتین و حضرات کو یقیناً اپنے اجداد کے کارنامے یاد آئے ہوں گے ان کی نظروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں میرے ساتھ شدید ہمدردی ہے مگر وقت کی تنگی اور ٹرین کی روانگی کے خطرہ کی وجہ سے وہ اس کا عملی اظہار کرنے سے معذور ہیں۔

دوڑ لگاتے لگاتے وہ ایک ڈبّے کی کھلی کھڑکی کے سامنے جا رُکا اور سامان اندر پھینک کر داد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ مامون نے پُورا دن میری خدمت میں گنوا دیا تھا۔ راستہ پوچھنے ٹیکسی والے سے بھاؤ تاؤ کرنے ٹکٹ خریدنے اور سامان اُٹھا کر بوقت ضرورت بھاگنے میں، جہاں کہیں باڈی پلے کی ضرورت محسوس ہوئی وہ بھی اس نے بخوشی پُوری کی تھی۔ اہلِ سپین کی شک کی نگاہوں سے بے نیاز اس نے طویل برادرانہ ڈیوٹی دی تھی۔ برادر بزرگ کا کردار ادا کرنا میرا فرض بنتا تھا۔ مَیں اس فرض سے فارغ ہو کر اس سے معانقے کی تیاری کر رہا تھا کہ وہ ہاتھ کے اشارہ سے سلام کر کے اور بھی تیزی سے بھاگ نکلا جیسے دن بھر کی خدمتِ برادرانہ کا مقصدِ اوّلین ہی ''اندازِ رخصتی'' ہو۔ پہلی بار مجھے اس پر ترس آیا اور وہیں کھڑے کھڑے مَیں نے اس کے

والدین کے ہاں جب تک چاہوں اور جب چاہوں شانزے لیزے میں قیام کی دعوت مسترد کر دی۔

مامون کے انداز جدائی کے صدمہ سے ذرا بحال ہوا تو اپنے کُپّے اور ماحول کا جائزہ لیا۔ دو سیٹوں میں سے ایک پر بارہ تیرہ من کی ایک اندلسی ''دھوبن'' نئے پُرانے کپڑوں کے درجن بھر تھیلے اور سوٹ کیس پھیلائے تشریف رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے زیر سایہ دو نوجوان لڑکیاں بیٹھی ''ترنجن'' گا رہی تھیں۔ سامنے کی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر کمزور سیرت اور صورت کا اندلسی خاموش بیٹھا تھا۔ لڑکیوں کے انداز گفتار سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ان کے والد محترم ہوں گے۔ بڑھیا کے احکامات جس نیازمندی سے وہ پورے کر رہا تھا اس سے موصوف کے شوہر ہونے کا شبہ ہُوا۔ اسی سیٹ پر دو اور نوجوان بھی تشریف رکھتے تھے اور مامون ان سب کے قدموں میں میرا سامان کہیں پھینک گیا تھا۔ گاڑی چلنے کا وقت تھا، مَیں کسی اور ڈبہ میں جگہ تلاش کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لئے وہیں دبک کر بیٹھ گیا۔ پہلے سے قابض مسافروں کے جذبات اور احساسات کا اندازہ تو تھا مگر مَیں تو ان کی زبان سے ناواقف تھا۔ سب سے کم عمر نوجوان نے کنڈلی کھولتے ہوئے نہ صرف مجھے جگہ دے دی بلکہ ماہِ صیام کی مبارکباد بھی دی۔ ''یہ ایک تو ہُوا مسلمان اور یہ باقی؟''—''رات ابھی پوری پڑی ہے خود ہی بتا دے گی'' مَیں نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا اور خالی جگہ میں تشریف آور ہو گیا۔ گاڑی کی اندرونی صورت حال کا جائزہ لیا تو جی خوش ہو گیا۔ گویا وطن سے اتنی دور اپنے وطن کی گاڑی میں سفر کی سعادت نصیب ہو رہی تھی۔

مامون کے طرزِ جدائی کا اثر اتنا گہرا تھا کہ دل نوجوان کے ''مسلمانانہ'' جذبات کی قدر کرنے پر بھی تیار نہیں تھا، کافی دیر تک خاموش بیٹھا میڈرڈ کی پسپائی سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا رہا اور نوجوان مجھے سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

رات کا سفر مجھے بالکل پسند نہیں۔ مجبوراً سونا یا سونے کی کوشش کرنا پڑتی ہے، اگر سونا ہی ہے تو آدمی اپنے گھر ہی میں کیوں نہ سویا رہے۔ اتنے وخت پالنے کی کیا ضرورت ہے؟ رات کو باہر بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا مجبوراً اندر کی قابل دید اشیاء پر ہی گزارا کرنا پڑتا ہے لیکن مجبوری تھی۔ ہم صبر اور شکر کر کے اپنے کونے میں دبک گئے۔ کُپّے کے اندر کی قابل دید اور ناقابلِ دید اشیاء کپڑوں

کے اُوپر مزید کپڑے پہن رہی تھیں۔ گرم ٹرین کے اندر سرد ہوا بڑی آزادی سے چل رہی تھی۔ گرم کپڑے سامان بند تھے اور پھر اتنے لوگوں کے درمیان میں کپڑے بدلنے کی مشق بھی تو نہیں تھی۔ تن کے کپڑوں ہی سے گرمی اور سردی کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور رات بھر یہ مقابلہ جاری رہا۔ کبھی ہم پسپا ہو جاتے کبھی فریق ثانی کے پاؤں ڈگمگا جاتے۔

مزید کپڑے پہن کر مقامی خاندان کے نوجوان ارکان رات کا ابتدائی حصہ تو ٹرین میں گھومتے پھرتے رہے۔ ان کے مہمان بھی آتے جاتے رہے لیکن بزرگ ارکان نے ایسی لمبی تانی کہ رات بھر نہیں اُتاری۔ مسلمان ہمسفر نے بھی اس خاموشی میں نیند کی چادر اوڑھ لی۔ مَیں نے بھی آنکھیں بند کر لیں مگر اس سے بھی کچھ فرق نہ پڑا۔ اندر بھی ویسا ہی اندھیر تھا روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔

مَیں سمجھا مسلمان نوجوان مجھے سحری کے لئے جھنجھوڑ رہا ہے آنکھ کھلی تو قیامت کی گھڑی تھی اہل اندلس چیخ رہے تھے، سامان سمیٹ رہے تھے۔ گاڑی میں ڈاکو گھس آئے ہیں؟ میرا ہاتھ خود بخود اپنے بیگ کی تلاش میں نکل گیا۔ محمد نے یہ حالت دیکھی تو مسکرایا ''فکر کی کوئی بات نہیں''۔

''مجھے تو خوشی کی بھی کوئی بات دکھائی نہیں دیتی۔''

''ہم اپنی اپنی ٹانگیں پھیلا کر تو بیٹھ سکیں گے اس سے بڑی خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے''

گاڑی رُکی ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔ صبح کے اندھیرے میں سب ہی اُتر گئے۔ ہم پوری پوری سیٹ پر پھیل گئے مگر آرام کا یہ عرصہ بھی چند لمحوں کا تھا۔ اندلس کی زمین بھی ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ تھوڑی دُور فرانس ہمارا منتظر تھا۔ ہم یورپ کی تھرڈ ورلڈ سے نکل کر روشنیوں اور رنگوں کی دُنیا میں داخل ہو رہے تھے۔ محمد نے اپنے بیگ کے علاوہ میرا بیگ بھی اُٹھا لیا۔ مَیں نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ ایک بار پھر مسکرایا ''چلیں''۔ ''کہاں؟'' ''پیرس''---''یہ گاڑی نہیں جائے گی؟'' ''فرانس والے ایسی ٹرینیں اپنے ملک میں داخل نہیں ہونے دیتے''۔

''پھر تو کامن مارکیٹ نہیں چل سکے گی۔''

''کامن مارکیٹ کے مستقبل پر اگلی گاڑی میں بیٹھ کر غور کرتے ہیں''۔ وہ نیچے اُتر گیا۔

صبح کا بہت ہی سہانا وقت تھا۔ دل چاہتا تھا تھوڑی سی چہل قدمی کر لیں۔ سبزہ و شبنم کو شب

خوابی کا لباس اتارتے اپنی آنکھوں سے دیکھیں لیکن موت کی مانند یورپ میں ٹرین کا بھی ایک وقت متعین ہوتا ہے۔ہم فرانس سے اندلس میں بھی اسی ٹھنڈے میٹھے وقت داخل ہوئے تھے۔اس وقت فرانس کے کسٹمز والے سوتے رہ گئے تھے اور ہم آگے نکل گئے تھے۔اس بار سپین والے آنکھیں ملتے رہے اور ہم ان کی دھرتی سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔فرانس والے البتہ چوکس تھے۔وہ ہمارے سامنے کھڑی ٹرین کے درمیان حائل ہو گئے۔محمد نے اپنا بیگ کھول کر پیش کر دیا۔ وہ اس پیشکش پر مطمئن نہیں ہوئے۔انہوں نے ہمارا بیگ بھی پیش کر دیا۔چابی ہمارے پاس تھی۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔مَیں نے بیگ وا کر دیا،نوجوان کسٹمز انسپکٹر کو یہ بات پسند نا آئی۔ ایک پاکستانی مسافر کا بیگ ایک مراکشی کیسے اُٹھا سکتا ہے؟ گڑبڑ تو تھی یورپ میں تو ایسے کٹھن مراحل میں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اُٹھاتا۔

سامان اور پاسپورٹ کی جامہ تلاشی کے بعد اس نے مجھے تو فارغ کر دیا لیکن محمد کے سامان کی ایک بار پھر تلاشی لی۔اس پر بھی تسلی نہ ہُوئی تو اس کے جسم کی جانچ پڑتال شروع کر دی۔ مجھے افسوس بھی ہوا غصہ بھی آیا۔بے چارے کو اسلامی ہمدردی کی وجہ سے ان کٹھن منازل سے گزرنا پڑ رہا تھا لیکن کیا کر سکتے تھے۔اس گاڑی سے دو چار مسافر ہی اور آئے تھے۔فرانسیسی حکام کے پاس ایسے کاموں کے لئے کافی فالتو وقت تھا۔ہم نے اس طرزِ معیت پر انگریزی میں احتجاج کیا۔انسپکٹر نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔وہ بھاگتا ہوا گیا اور اپنے سے بڑے کسی ساتھی کو پکڑ لایا۔اس لئے نہیں کہ اس نے ہمیں کوئی وی آئی پی سمجھ لیا تھا اور کسی ہمارے ہم مرتبہ افسر کو ہمارا استقبال کرنا چاہئے تھا۔اس لئے کہ اس کے خیال میں اس کا بڑا افسر انگریزی سمجھ سکتا تھا۔اب بڑے افسر کو اپنی بات سمجھانا چھوٹے افسروں کو اپنے کاغذات دکھانے سے بھی مشکل ہو گیا۔

ہماری انگریزی اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور اس کی انگریزی ہمارے پلے نہیں پڑتی تھی۔نا سمجھی کا یہ مقابلہ معلوم نہیں کب تک جاری رہتا لیکن ٹائم ختم ہو گیا اس لئے یہ میچ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ہی خود بخود ختم ہو گیا۔محمد اس بار ذرا کھل کر مسکرایا۔ہم بھی خوش ہوئے کہ اس کی کچھ تو دلجوئی ہوئی۔لیکن ہمارا سامان ڈبے میں رکھ کر وہ دوسری کھڑکی سے باہر نکل گیا۔''میں ناشتہ کا بندوبست کر آؤں''۔ہم انتظار کرتے رہے وہ واپس نہیں آیا شاید اس خوف سے کہ کہیں پھر نہ

''بدن پڑتال'' کرانا پڑ جائے — فرانس والوں کی گاڑی خوبصورت بھی تھی اور 'فراخ دل' بھی۔ ہم پورے ڈبہ پر قابض تھے۔ایک سرے سے دوسرے سرے تک آزادی سے گھوم پھر سکتے تھے۔ ایک طرف سے سُورج مسلسل بلند ہو رہا تھا۔ٹرین کے باہر روشنی پھیل رہی تھی ارضِ فرانس اپنے دریاؤں،درختوں،کھیتوں اور میدانوں سمیت دور دور تک پھیلی تھی ایک دو جگہ گاڑی رُکی ایک ایک دو دو مسافر سوار ہوئے۔وہ ڈبہ میں داخل ہوتے ہی ہمارا جائزہ لیتے اور کسی دُور ترین سیٹ پر بیٹھ جاتے ایک سٹیشن سے ایک بزرگ اسی ڈبہ میں داخل ہوئے تو ایک ''بزرگہ'' دیر تک پلیٹ فارم پر کھڑی ان کے لئے ہاتھ ہلاتی رہی۔وہ کھڑکی سے لگے جواب میں اپنا کانپتا ہوا ہاتھ لہرانے کی کوشش کرتے رہے۔شاید اس مشقت میں زیادہ ہی تھک گئے تھے۔ہمارے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔حواس بحال ہوئے تو ڈبہ کا جائزہ لینے لگے۔ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔محسوس ہوا دُور تک پھیلے کھیت بھی مسکرا اُٹھے ہیں۔شاید وہ ہم سے بات بھی کرنا پسند کرتے لیکن وہ فرانسیسی کے سوا کوئی اور زبان بول کر اپنے قومی وقار کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتے تھے۔

ایک ٹکٹ کلکٹر گھومتا پھرتا ادھر آ گیا۔سب نے اپنے اپنے ٹکٹ پیش کر دیئے۔ہمیں یاد آیا کہ مامون نے ہمیں بھی ٹکٹ پیش کیا تھا۔نکال کر اسے پیش کر دیا۔ٹکٹ پر پنسل سے نشان لگا کر اس نے ہماری طرف بڑے غور سے دیکھا ''جنٹلمین آپ کے پاس اوّل درجہ کا ٹکٹ ہے''۔ ہم نے اردگرد دیکھا کہ کسی اور نے تو نہیں سن لیا۔

ہم نے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ پر تھرڈ کلاس میں پوری رات ہی نہیں کاٹ دی تھی بلکہ دن کی روشنی میں بھی اپنی کلاس بدلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ہمیں تو معلوم تھا ہمارے ساتھ کیا ہاتھ ہو گیا ہے،ٹکٹ مامون نے خریدا ڈبہ اس نے چُنا ہم تو صرف ٹکٹ جیب میں ڈال کر اس میں گھس گئے تھے۔نہ اس نے بتایا کہ ہم اوّل درجہ کے مسافر ہیں نہ ہمیں کسی انداز یہ شبہ گزرا کہ ہم کوئی بڑی چیز ہیں اہلِ فرانس کو اس حادثہ کا کیا علم؟ انہوں نے سُن لیا تو ہمارے متعلق کیا سوچیں گے۔

ٹکٹ کلکٹر دوسرے ڈبہ کی طرف نکل گیا،ہم سامان اُٹھا کر اوّل درجہ کی تلاش میں چل پڑے۔کئی ڈبے گزر کر ایک خالی ڈبہ نظر آیا۔فرش پر سُرخ قالین بچھے تھے،درمیان میں بچوں کا جھولا پڑا تھا،اردگرد کھیلنے کی اشیا سجائی گئی تھیں ممکن تھا ہم جھولے پر ہی بیٹھ جاتے لیکن ایک بچہ ہم

سے پہلے اس پر قابض ہو چکا تھا اس سے آگے گئے تو قالین پوش ڈبہ کی دراز اور آرام دہ سیٹیں اپنے بازو پھیلائے ملیں۔ ان سیٹوں کا لباس ابھی ابھی کوئی بدل کر گیا تھا۔ سواریوں میں سینئر سٹیزن زیادہ تھے۔ بالکل خاموش کوئی نظر اُٹھا کر ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھتا تھا اپنا اخبار اپنی کتاب اپنی سیٹ اور اپنی دنیا۔

رات کی ساری تھکن اور بے آرامی جاتی رہی' ناشتہ کیا۔ سگریٹ سلگایا اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر حسنِ فطرت کے نظارہ میں مصروف ہو گئے۔ ماحول کا اثر تھا یا صحبت کا کچھ اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ نیند جو رات بھر ہمارے اردگرد گھومتی رہی تھی غالب آ گئی۔ فسٹ کلاس نیند۔ اس کا ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ دوپہر کے کھانے کے پیسے بچ گئے۔ آنکھ کھلی تو سہ پہر کی چائے سرو کی جا رہی تھی۔